پرانے چراغ

حصہ سوم

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مکتبۂ فردوس
مکارم نگر، برولیا، لکھنؤ ۲۰

مکتبۃ الشباب العلمیہ
ندوہ روڈ، لکھنؤ ۲۰

www.abulhasanalinadwi.org

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

بار سوم

۱۴۳۲ھ - ۲۰۱۰ء

نام کتاب	:	پرانے چراغ (حصہ سوم)
نام مصنف	:	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
صفحات	:	۴۰۰
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	(حشمت علی) ڈالی گنج لکھنؤ
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ

تقسیم کار

مکتبۃ الشباب العلمیۃ

ندوہ روڈ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ-۲۰

www.abulhasanalinadwi.org

فہرست

دیباچہ طبع سوم	۷
پیش لفظ	۱۱
عالم عربی کے چند نامور معاصر اور دینی احباب	۱۵
۱۔ شیخ حسن البنا شہیدؒ	۱۷
۲۔ سید قطب شہیدؒ	۲۷
۳۔ معالی الشیخ محمد صالح قزازؒ	۳۹
۴۔ شیخ محمد علی الحرکانؒ	۴۹
۵۔ شیخ عبداللہ ابراہیم انصاریؒ	۵۳
۶۔ ڈاکٹر سعید رمضان مصریؒ	۶۱
۷۔ شیخ محمد الغزالیؒ	۶۷
۸۔ شیخ علی طنطاویؒ	۶۹
ممتاز دینی داعی و روحانی مربی	۷۱
۱۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ	۷۳
۲۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ	۸۳
۳۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغفور صاحب مدنیؒ	۹۷
۴۔ مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلویؒ	۱۰۱
۵۔ مولانا عبیداللہ صاحب بلیاویؒ	۱۰۷
۶۔ مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ	۱۱۷

www.abulhasanalinadwi.org

چند نامور معاصرین وقائدینِ ملت	۱۲۳
۱۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاریؒ	۱۲۵
۲۔ مجاہدِ ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ	۱۳۳
۳۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ	۱۴۱
۴۔ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ	۱۵۳
۵۔ شاہ فیصل شہیدؒ	۱۶۵
۶۔ جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ	۱۷۳
۷۔ نواب صاحب چھتاریؒ	۱۸۳
چند جلیل القدر علماء وخادمینِ دین	۱۹۱
۱۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۱۹۳
۲۔ مولانا اکرام اللہ خان صاحبؒ	۱۹۷
۳۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ	۲۰۱
۴۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادیؒ	۲۱۱
۵۔ مولانا نسیم احمد صاحب فریدیؒ	۲۱۵
چند خادمانِ دین، کارکنانِ ملت احباب ورفقاء	۲۲۳
۱۔ برادر محترم سید محمد جمیل صاحبؒ	۲۲۵
۲۔ حاجی عبدالرشید ارشدؒ	۲۳۳
۳۔ پروفیسر محمد سمیع صدیقیؒ	۲۴۱
۴۔ مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندویؒ	۲۴۷
۵۔ مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندویؒ	۲۶۱
۶۔ مولانا محب اللہ صاحب لاری ندویؒ	۲۶۵

www.abulhasanalinadwi.org

۷۔ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم	۲۶۹
۸۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم	۲۷۵
۹۔حکیم عبدالقوی صاحب دریابادیؒ	۲۸۵
۱۰۔پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامیؒ	۲۹۳
۱۱۔مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی جے پوریؒ	۳۰۱
۱۲۔مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہریؒ (برمی)	۳۰۷
۱۳۔حاجی احمد غریب صاحبؒ	۳۱۳
۱۴۔محمد اسد صاحبؒ (سابق لیوپولڈ ویس)	۳۱۷
چند خورد سال لیکن باکمال رفیق و عزیز	**۳۲۳**
۱۔سید احمد الحسنیؒ	۳۲۵
۲۔مولانا ابوالعرفان ندویؒ	۳۳۷
۳۔عزیزی مولوی محمد ثانی حسنیؒ	۳۴۳
۴۔مولوی معین اللہ ندوی اندوریؒ	۳۶۱
۵۔مولوی سید محمد مرتضیٰ نقوی مظاہریؒ	۳۶۷
۶۔مولوی عبدالنور (نور عظیم) ندویؒ	۳۷۷
سینے کے داغ	**۳۸۳**
۱۔والدہ صاحبہ مرحومہ	۳۸۵
۲۔ہمشیرہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہ مرحومہ	۳۹۳
۳۔رفیقۂ حیات (سیدہ طیب النساء مرحومہ)	۳۹۷

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

دیباچہ طبع سوم

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے ملت کی خدمت کے لیے خاص طور پر منتخب کیا تھا۔ علم وادب کا میدان ہو یا دعوت وتبلیغ کا کوچہ، تزکیہ واحسان کا خانہ ہو یا سماجی اصلاح کا دریچہ، کونسا کوچہ ہے جہاں آپ نے قدم نہ رکھا ہو، کونسا دریچہ ہے جس کو آپ نے وا نہ کیا ہو، کونسا خانہ ہے جس میں آپ نے رنگ نہ بھرا ہو اور کونسا میدان ہے جہاں آپ نے انمٹ نقوش نہ چھوڑے ہوں!!

یہ کتاب ''پرانے چراغ'' دراصل خاکہ نگاری سے تعلق رکھتی ہے جو اردو ادب کی بہت مؤثر اور دلچسپ صنف ہے، اردو ادب میں رشید احمد صدیقی کے مقام اور خاکہ نگاری میں ان کے اسلوب کے امتیاز سے کون واقف نہیں، تاہم بایں مقام بلند رشید احمد صدیقی نے پرانے چراغ (پہلی جلد) کی اشاعت پر جو داد دی اور اس کتاب کی عظمت کا جو اعتراف کیا ہے وہ ایک بڑی معتبر سند ہے۔ مولانا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''بسلسلہ گزشتہ عرض ہے کہ ''پرانے چراغ'' کے آپ کی اول درجہ کی تصنیف ہونے میں کوئی شک نہیں، میرا خیال ہے کہ اول درجہ کا مصنف اپنی کسی دوسری درجہ کی تصنیف پر نہ قادر ہوتا ہے، نہ اس کو گوارہ کر سکتا ہے، آپ نے جن عظیم المرتبت مرحومین کو عقیدت کا ہدیہ پیش کیا، کون ہے جو ان کی فضیلتوں کا معترف نہ ہوگا، اور ان کی جدائی پر محرومی کا احساس نہ کرے گا۔
>
> یہ وہ ہستیاں ہیں، جو عالم ارواح میں سایۂ رحمت میں اکٹھا مل جائیں گی، اور بآسانی پہچان لی جائیں گی، چاہتا ہوں کہ آپ کسی بہت ہی معمولی شخص کی غیر معمولی صفات کا اور خدمات کا مرقع پیش فرمائیں، جس

www.abulhasanalinadwi.org

کو بہت کم لوگ جانتے ہوں، لیکن آپ کے اجاگر کیے ہوئے نقوش سے گمنام اور کس مپرس شخص حشر کے ہیجان وہجوم میں بھی جدھر سے گزرے یا جہاں ہو فوراً پہچان لیا جائے، خاکہ نگاری کا بڑا وصف اور اولین شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنادے، بڑے کو کتنا ہی بڑا دکھائے آسان ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ چھوٹے کو بڑا دکھایا جائے، فن اور فن کار کی یہ معراج ہوگی''۔

زیرِ نظر کتاب اس کا تیسرا حصہ ہے، اس سے پہلے اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت ہی کے قلم سے بہت سی ممتاز شخصیات کے خاکوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حضرت کی خواہش تھی کہ اس میں ان تمام معاصر شخصیات کا اضافہ کیا جائے جن پر انھوں نے مضامین لکھے تھے، مگر وہ پرانے چراغ کی جلدوں میں کسی وجہ سے شامل نہ ہو سکے، چناں چہ حضرت کی خواہش کے مطابق جس معاصر شخصیت کا حضرت کے قلم سے خاکہ دستیاب ہوسکا، اس جلد میں اضافہ کیا گیا، ویسے بھی یہ جلد پہلی دو جلدوں کے مقابلے میں مختصر تھی، ان اضافوں سے اس کا حجم بھی تقریباً ان جلدوں کے برابر ہو جائے گا، اس طرح ظاہری طور پر بھی یہ کام مناسب ہی قرار پائے گا۔

حضرت مولانا نے بہت سی معاصر شخصیات کے انتقال پر کاروانِ زندگی میں اپنا تاثر اور مختصراً ان شخصیات کے کمالات وخصوصیات کا تذکرہ کیا ہے، مگر بہت مختصر ہونے کی وجہ سے پرانے چراغ کی اس اضافہ شدہ تیسری جلد میں ان کو شامل نہیں کیا گیا، تاکہ کتاب کا اسلوب ایک حد تک یکساں رہے۔

اس تیسری جلد میں حضرت نے شخصیات کو چھ خانوں میں تقسیم کیا تھا:

۱- عالم عربی کے چند نامور معاصر اور دینی احباب

۲- ممتاز دینی داعی وروحانی مربی

۳- چند نامور معاصرین وقائدین ملت

۴- چند جلیل القدر علماء وخادمین دین

www.abulhasanalinadwi.org

۵-چند خادمانِ دین، کارکنانِ ملت احباب ورفقاء

۶-چند خورد سال لیکن باکمال رفیق وعزیز

ہر عنوان کے تحت اضافہ کیا گیا ہے۔

پہلے عنوان کے تحت:

۱-شیخ محمد علی الحرکان، ۲-ڈاکٹر سعید رمضان مصری، ۳-شیخ محمد الغزالی ۴-شیخ علی طنطاوی

دوسرے عنوان کے تحت:

۱-شاہ عبدالغفور صاحب مہاجر مدنی صاحب، ۲-مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی، ۳-مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی، ۴-شاہ عبدالغفور مہاجر مدنی۔

تیسرے عنوان کے تحت:

۱-مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، ۲-شاہ فیصل شہید، ۳-نواب صاحب چھتاری

چوتھے عنوان کے تحت:

۱-مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، ۲-مولانا محمد منظور صاحب نعمانی

پانچویں عنوان کے تحت:

۱-پروفیسر محمد سمیع صاحب صدیقی، ۲-پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی، ۳-مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری (برمی)، ۴-حاجی احمد غریب صاحب، ۵-محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس)

اور چھٹے عنوان کے تحت:

۱-مولانا معین اللہ صاحب ندوی، ۲-مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب مظاہری

کے خاکوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور دوسری جلد کے تتبع میں اخیر میں مستقل ایک عنوان ''سینے کے داغ'' کا اضافہ ہے جس کے تحت والدۂ مرحومہ، ہمشیرۂ مرحومہ اور اہلیۂ مرحومہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس طرح کل تیئیس (۲۳) خاکوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے لیے مولانا محمود حسن حسنی ندوی (نبیرۂ مولانا محمد ثانی حسنی) اور مولوی محمد مستقیم محتشم ندوی بھٹکلی (رفیق مجلس

تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ) کا بیش قیمت تعاون حاصل رہا کہ اول الذکر نے اکثر مضامین دریافت وفراہم کیے اور بعض جگہوں پر حضرت مولانا کے مختلف مضامین اور تقریروں کے اقتباسات لے کر مضمون کو مرتب کیا، اور ثانی الذکر نے بعض مضامین ڈھونڈ نکالے۔ جس کے لیے ہم ان دونوں کے اور بالخصوص مولانا محمود صاحب کے بے حد ممنون ومشکور ہیں۔

اس ایڈیشن میں پرانے خاکوں کی ترتیب بھی کچھ بدلی ہوئی نظر آئے گی، یہ پوری ترتیب خود حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (جانشین حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ) کی قائم کی ہوئی ہے، حضرت مولانا نے کتاب پر نظر ڈالنے کی زحمت فرمائی اور ازسرِ نو یہ ترتیب قائم کی، اس کے لیے ہم آپ کے نہایت ممنون ہیں۔ اسی طرح مولانا بلال عبدالحی حسنی (فرزند مولانا سید محمد الحسنیؒ) نے بھی بعض مشورے دیے، ہم ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، نیز برادرِ عزیز محمد سفیان کے ایم بھٹکلی (متعلم علیا ثانیہ شریعہ دار العلوم ندوۃ العلماء) کا بھی پروف پڑھنے میں قیمتی تعاون حاصل رہا، ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں۔

امید ہے کہ ان وقیع اضافوں کے بعد یہ جلد پہلے سے زیادہ پسند کی جائے گی۔ نفع اللّٰہ بہ۔

(ناشر)

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب "پرانے چراغ" کی تیسری جلد قارئین کی خدمت میں پیش ہے، ان تینوں اجزا میں مصنف نے معاصر بزرگوں، مصلحین و محسنینِ امت، اپنے استاذہ کرام، مربیوں، محسنوں اور بے تکلف احباب واہلِ تعلق کے علاوہ ان نئے چراغوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی زندگی کا چراغ بہت جلد گل ہو گیا اور وہ بھی ایک طرح سے پرانے چراغوں میں داخل ہو گئے۔

بعض حضرات کو شاید محسوس ہو کہ اس کتاب میں ان بہت سی شخصیتوں کا تذکرہ نہیں جو غیر معمولی شہرت رکھتی تھیں اور علمی و دینی یا سیاسی و ادبی میدانوں میں ان کے چرچے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں ان ہی شخصیتوں کو اپنے احساسات و تاثرات کا موضوع بنایا ہے جن سے اس کے گوناگوں تعلقات اور گہرے روابط تھے، یا اگر براہِ راست ملاقات نہیں تھی، لیکن ذوق و وجدان اور مسلک میں اُن سے ہم آہنگی تھی، جیسے شیخ حسن البنا شہید، کہ اگر چہ مصنف نے براہِ راست اُن کو دیکھا اور برتا نہیں تھا، لیکن شیخ شہید کی تربیت، نفسِ گرم اور ان کے حسنات کی جلوہ گری کا مشاہدہ بچشمِ خود کیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کتاب کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں جس کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے اور مختلف انسانی طبقات کے متعلق معلومات متفرق کتابوں سے جمع کر دی جاتی ہیں اور قطعاً کسی تاثر اور جذبے سے خالی ہوتی ہیں، اور نہ ہی یہ کتاب عام تراجم اور تذکرے کی کتابوں کی طرح صاحبِ سوانح کی وفات کے برسوں بعد لکھی گئی ہے، ایک دو کو مستثنیٰ کر کے تقریباً تمام ہی شخصیتوں کے متعلق احساسات و تاثرات اُن کی وفات کے معاً

www.abulhasanalinadwi.org

بعد لکھے گئے یا تعزیتی تقریروں میں ان کا اظہار کیا گیا، اس طرح یہ کتاب جیتے جاگتے مرقع کی شکل اختیار کر گئی ہے، اور تذکرے وسوانح کی کتابوں میں منفرد اسلوب رکھتی ہے۔

مصنف کے قلم سے سوانح وتراجم اور تذکرے کے موضوع پر جو کتابیں اب تک سامنے آئی ہیں، اگرچہ موضوع کے اعتبار سے ان میں ہم آہنگی اور وحدت ہے، لیکن ان کے اسالیب میں جدّت وانفرادیت ہے۔

مصنف کا نقطۂ نظر تاریخ نگاری اور سیرت نویسی کے متعلق یہ ہے کہ کسی نسل وقوم کی تاریخ اور کسی دعوت وتحریک اور دین ومذہب کی تعلیمات کو کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین وآرائش کے بغیر سامنے رکھ دینا چاہئے کہ جمالِ فطرت اور حسنِ حقیقت کو ظاہری رنگ وروغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ وبو کی ضرورت نہیں ہوتی، دوسری صفت جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دوسرے مؤرخین اور سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے عام مزاج وانداز اور لگے بندھے ڈگر سے ہٹ کر انھوں نے اپنی کتابوں میں ان تاریخی دستاویزوں اور مصادر ومراجع سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جو بظاہر اس موضوع پر نہیں تھیں، مگر ان میں وہ قیمتی لعل وجواہر موجود تھے جو براہِ راست خاص اس موضوع پر لکھنے والوں کو ملنے دشوار تھے، اگرچہ اس نازک علمی وتاریخی سفر میں بڑے نازک موڑ اور سخت وہمت شکن گھاٹیاں بھی آئیں جن سے گزرنا آسان نہ تھا کہ یہ موضوع (تاریخ نویسی اور سیرت نگاری) ''بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز تھا''، لیکن محض توفیق الٰہی کی خاص دستگیری، وسیع قلب، متوازن فکر، وسیع وطویل اور عمیق مطالعہ کی قوت وہمت اور مشقِ شناوری کی بدولت وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکے (۱)۔

مصنف کے قلم سے اسلام کی دعوتی وفکری اور تجدیدی تاریخ اور شخصیات پر اسلامی کتب خانہ میں پہلی بار ایک مربوط ومفصل سلسلہ تاریخ دعوت وعزیمت کے موضوع کا اضافہ ہوا جو دعوتی وفکری تاریخ کے تحلیل وتجزیہ کے ساتھ مختصر سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کا کامیاب نمونہ ہے۔

---

(۱) اس کے کامیاب نمونے آپ کو تاریخ دعوت وعزیمت، نبی رحمت، اور المرتضیٰ جیسی تصنیفات میں نظر آئیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی سیرت وقصص کے موضوع پر بچوں کے لیے جو علم کلام تیار کیا گیا اور جس کے عربی، انگریزی اور فرنچ ایڈیشنوں نے قبولیت عام حاصل کی، پھر عصر حاضر کے نوجوانوں اور غیر مسلموں کے ذہن ونفسیات کو سامنے رکھ کر سیرت نبوی کے موضوع پر جو کتاب سامنے آئی ان دونوں کے اسالیب میں انفرادیت اور ندرت اور کلّموا النّاس علی قدر عقولھم کے شاہکار نمونے ہیں۔

اس طرح چودہ سو سال بعد سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ذات گرامی پر جو سیرت ترتیب دی گئی، اس کا اسلوب اچھوتا اور دلوں کو چھوتا ہے، یہ کتاب سیرت وتاریخ کا نیا منہج پیش کرتی ہے۔

اگر چہ یہ کتاب (پرانے چراغ) سوانح اور تذکرے کے درجہ کی چیز نہیں ہے، لیکن اس کے مطالعے سے نہ صرف ان معاصر شخصیتوں کے افکار وخیالات اور احساسات وجذبات کی صحیح اور سچی تصویر نظر آئے گی بلکہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس عہد کے ماحول، رفتار زمانہ، انداز فکر ونظر، انسانی تہذیب وتمدن، سیاسی وسماجی اور علمی وادبی قدروں اور حالات کے مدّ وجزر کا صحیح اندازہ ہو سکے گا اور یہ معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں بقول لسان العصر اکبر الہ آبادی ع

”کیا چیز جی رہی تھی کیا چیز مر رہی تھی“

مصنّف نے جن شخصیتوں کو دیکھا، برتا اور پرکھا ہے ان میں نہ صرف تنوع اور رنگا رنگی ہے بلکہ زمانی رقبہ ایک صدی اور مکانی رقبہ عالم عربی تک محیط ہے، خود مصنّف کا عہد بھی دو صدیوں کا سنگم ہے اور جس ادارے اور فکر کی وہ نمائندگی کرتے ہیں وہ قدیم وجدید کے حسین امتزاج کا جامع اور اس کا اولین داعی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ دعوتی وفکری میدانوں میں ندوی طرزِ فکر کی اہمیت وافادیت بڑھتی ہی جائے گی۔

آئندہ کے مصنّفین اور دعوتی وعلمی کام کرنے والوں کو اس کتاب کے صفحات میں ”اس صدی کے دلوں کی دھڑکنیں اور دماغ کی سلوٹیں“ آسانی سے نظر آئیں گی اور وہ اس ”نگار خانۂ رقصاں“ میں زندہ ومتحرک اور جیتی جاگتی حقیقتیں ”صحیح تناسب اور متوازن

www.abulhasanalinadwi.org

ٹمپریچر" کے ساتھ دیکھ سکیں گے، اس لیے کہ مصنّف کے لیے سوانح نگاری کا فن "سو پشت سے ہے پیشۂ آباء......" کے مرادف ہے اور "مشرق ومغرب کے میخانے ان کے دیکھے ہوئے ہیں" معاصر شخصیتوں کی طویل رفاقت وصحبت اور اُن کے مطالعے ومشاہدے کا جو موقع مصنّف کو ملا ہے اس کی بنیاد پر نفس انسانی کی تہ تک رسائی، اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی- جو علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے دشوار اور نازک اور بہت جلد متأثر ہونے والی صنف ہے- کا حق بھی وہی ادا کرسکتا ہے، جو نفس انسانی کے احساسات وجذبات، اس کے سوز وساز، سرور وشوق، اس کی روح کی تپش اور دل کے گداز سے بہت کچھ واقف ہو۔

وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

ہم مصنّف کتاب کے صمیم قلب سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اصحاب دعوت وعزیمت کی ایک مسلسل ومربوط تاریخ وتذکرہ پیش کرکے اسلام کی تاریخ پر ملّتِ اسلامیہ کا اعتماد ویقین ہی بحال نہیں کیا بلکہ اس کا یہ ایمان ویقین بھی تازہ ہوا کہ بیسویں صدی کے دورِ انحطاط میں جب ایسے روشن آفتاب وماہتاب ہوسکتے ہیں تو گزشتہ صدیوں کی مردم خیزی کا کیا حال ہوگا، پھر مرکز اسلام سے دور رہتے ہوئے بھی ایسی طاقتور اور نابغۂ روزگار شخصیتوں کا وجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثمرہ اور آپ کا مستقل معجزہ تو ہے ہی اسلام کی قائدانہ صلاحیت اور اس کے سدا بہار درخت کے ہمیشہ برگ وبار لانے اور ہر زمانے میں مردانِ کار اور نوادرِ روزگار پیدا کرنے کی لافانی صلاحیت کی دلیل وحجت اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اس کا امتیاز وکمال بھی ہے، جس میں اس مذہب کا کوئی جواب نہیں ـــــ تَبَارَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَاءِ بُرُوْجاً وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجاً وَّقَمَراً مُّنِيْراً.

ناشر

www.abulhasanalinadwi.org

عالمِ عربی کے چند نامور معاصر

اور

دینی احباب

- شیخ حسن البنا شہیدؒ
- سید قطب شہیدؒ
- شیخ صالح قزازؒ
- شیخ محمد علی الحرکانؒ
- شیخ عبداللہ ابراہیم انصاریؒ
- ڈاکٹر سعید رمضان مصریؒ
- شیخ محمد الغزالیؒ
- شیخ علی طنطاویؒ

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ حسن البنا شہیدؒ

اسلام (۱) اَبدی اور خدا کا پسندیدہ دین، اور اُمّت مسلمہ اس کا شاداب اور سدا بہار درخت ہے، یہ خدائی ترکش ہے کہ نہ اس کے تیر ختم ہوتے ہیں اور نہ نشانہ خطا ہوتا ہے، سب سے بڑا ثبوت اس اُمّت میں ایسے مصلحین ومجاہدین، خداداد صلاحیتوں سے مالا مال، مُویّد من اللہ، نادرۂ روزگار اور اسلام کے لیے باعثِ صد افتخار شخصیتیں ہیں، جو ناساز گار حالات مخالف ماحول اور بیم ورجا کی تیرہ وتاریک فضا میں ایک ایسی قوم میں پیدا ہوتی ہیں، جو فکری زوال واضمحلال، روحانی افلاس، ارادے کی کمزوری، عزم وہمت کی پستی، اخلاقی فساد، راحت طلبی وعافیت پسندی، ہر قوت وطاقت کے سامنے سپر اندازی اور اصلاح حال سے مایوسی کا شکار ہوتی ہے، اس وقت یہ پوری نسل ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک پریس سے شائع ہونے والی کتاب کا کوئی ایڈیشن ہو کہ جس کے ایک نسخے کو پڑھ کر باقی سارے نسخوں کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے، اس ماحول ومعاشرے میں نہ کوئی ندرت وجدّت ہوتی ہے، نہ حوصلہ مندی وعالی ہمّتی کا جذبہ، اس ماحول میں عام ورائج

---

(۱) شیخ حسن البنّا مرحوم کی کتاب "مذکرات الدعوۃ والداعیۃ" (ایک دعوت اور داعی کی ڈائری اور تأثرات وواقعات) کا نیا ایڈیشن بیروت سے شائع ہو رہا تھا، اس کے ذمہ دار اور محرّک شیخ حسن البنا کے لائق وناموَر داماد ڈاکٹر سعید رمضان مدیر رسالہ "المسلمون" نے راقم سطور کو مقدمہ لکھنے کے لیے خط لکھا، راقم کو اپنی دوسری مصروفیتوں اور آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے عرصہ تک موقع نہیں ملا، اس نے چاہا کہ اس کام سے معذرت کردے، لیکن ڈاکٹر سعید رمضان کا تار آیا کہ جب تک آپ کا مقدمہ نہیں آئے گا کتاب نہیں چھپے گی، مجبوراً نقاہت کی حالت میں اس کو اِملا کرانا پڑا اور کتاب اس مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی، پیش نظر مضمون اس کا ترجمہ ہے جو مولوی شمس الحق ندوی مدیر "تعمیر حیات" کے قلم سے ہے، مقالہ نگار نے اس پر نظر ڈالی ہے، نظر ثانی کے بعد وہ شائع ہو رہا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

چیزوں کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی اور نہ عام معیار سے اونچی کوئی چیز نظر آتی ہے، پوری زندگی ایک ٹرین کے مانند ہے جس کو ایک ہی انجن کھینچ رہا ہے اور شکم پروری و مادّہ پرستی، خود غرضی و مصلحت اندیشی، لطف اندوزی و نفع خوری کا انجن ہے، یا مادّی قوت اور ہوس واقتدار کا انجن ہے، پوری زندگی ایک ہی کھیل یا ایک ہی ڈرامہ نظر آتی ہے جو بڑی مہارت وفن کاری کے ساتھ اسٹیج کیا گیا ہو، اور انسانیت یا تاریخ اسلام کے اسٹیج پر اس کو بار بار دکھایا جارہا ہو، اور اس کا ہر ہیرو اپنا پارٹ پوری چابک دستی وسلیقہ مندی کے ساتھ ادا کررہا ہو اور آخر میں یہ ڈرامہ تماشائیوں کی تالیوں یا مقتولین و مجروحین کی آہ وبکا پر ختم ہو جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پورے عالم عربی خصوصاً مصر میں یہی ڈرامہ اسٹیج ہورہا تھا، قافلہ رواں دواں تھا، زندگی کی ٹرین اپنے محدود مقاصد کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل رہی تھی، ایک ہی طرح کی آوازیں آرہی تھیں، ایک ہی راگ الاپا جارہا تھا، کہ پردے کی آڑ سے اچانک ایک شخص نمودار ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ پرانے ملبے کی تہہ اور تاریخ کی سلوٹوں سے ایک مرد آہن باہر آجاتا ہے، اور اس مطمئن اور غافل قافلے کو چونکا دیتا ہے جو چند حقیر مقاصد کی حصول یابی کے سوا کچھ نہیں جانتا، جس کو اپنی دنیاوی ضروریات اور جسمانی راحت وآرام کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی۔

پردے کے پیچھے سے آنے والا یہ شخص قافلہ والوں کو ہاتھ دکھاتا ہے، ٹرین کے سامنے خطرے کی جھنڈی ہلاتا ہے، اصلاحِ حال اور انسانیت کے عام رجحان اور اس کے انجام، اُمّتِ مسلمہ کے مقام اور اس کی اصل ذمّہ داری کے بارے میں از سرِ نو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، اس اُمّت کو اس کا پیغام یاد دلاتا ہے، وہ بگڑے ہوئے حالات، اخلاقی پستی، گمراہ کن عقائد، جاہلی رسوم وعادات، شکم پروری وہوس پرستی اور قوت وطاقت کے سامنے سرافگندگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، وہ ایک صاف ستھری زندگی، ایک نیک چلن اور انصاف پسند معاشرہ، اور نئے اور پختہ ایمان کی دعوت دیتا ہے، وہ ایسے اسلام کی دعوت دیتا ہے جس کی جڑیں مضبوط اور زندگی کے تمام شعبوں میں پیوست ہوں، یہ شیر دل شخص

بڑی بلندی سے عقابی روح کے ساتھ ایسی بلند اور گونجتی ہوئی آواز لگاتا ہے کہ قافلے میں کھل بلی مچ جاتی ہے، اس سے جذبات واحساسات میں ایسا کیف وسرور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو نظر انداز کر کے اور اس کو نا قابلِ التفات سمجھ کر اپنی رفتار کا جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا، کچھ لوگ گوش برآواز ہوتے ہیں، کچھ تھمتے ہیں، پھر آواز لگانے والے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، تھوڑا ہی وقت گزرتا ہے کہ قافلہ والوں کی بڑی تعداد اس کے اِرد گرد جمع ہو جاتی ہے، یہ داعی اس مجموعے سے ایک نیا قافلہ تیار کرتا ہے، اور پھر یہ قافلہ اس کی دل لگتی باتوں پر سرمست وسرشار ہو کر، خدا پر بھروسا واعتماد کر کے بنامِ خدا سفر شروع کرتا ہے، ایسے ماحول ومعاشرے کے خلاف آواز بلند کرنے والے ان داعیوں کی زندگی ایسی درخشاں وتابناک ہے کہ اس سے دعوت واصلاح کی تاریخ میں چار چاند لگ جاتے ہیں، یہ داعیانِ اسلام کا وہ قافلہ ہے جس سے تاریخ اسلام کا کوئی عہد کبھی خالی نہیں رہا۔

اس کتاب کا مصنف جس کا مقدمہ لکھنے کی مجھے سعادت حاصل ہو رہی ہے ان شخصیتوں میں سے ہے جنھیں دستِ قدرت بناتا اور سنوارتا ہے اور خدائی تربیت اسے پروان چڑھاتی ہے، پھر صحیح وقت اور صحیح جگہ پر اس کو کھڑا کر دیتی ہے، فکرِ صالح اور قلبِ سلیم رکھنے والا جو شخص بھی تعصب سے بلند ہو کر اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ شخص خداداد صلاحیتوں سے مالا مال ہے، وہ کسی خاص ماحول یا درس گاہ، تاریخ اور زمانہ، یا محنت وکدّ وکاوش، یا مشق وتجربہ کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ توفیقِ خداوندی، حکمتِ ربانی اور اس دین کے ساتھ اس کی عنایت کی پیداوار ہے، وہ ایسا ہونہار پودا ہے جس کی نگہداشت کسی بڑے کام اور بڑی امید کے لیے کی جاتی ہے جہاں اس کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔

جو شخص بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق وسطیٰ اور خاص طور سے مصر کے حالات سے واقف ہو اور عالمِ اسلام کا یہ اہم اور مرکزی حصہ عقیدہ وجذبات، اخلاق ومعاشرت، عزم وارادہ اور جسم وقلب کی جس کمزوری کا شکار تھا اس پر اس کی نظر ہو، ممالیک (مصر کا حاکمِ خاندانِ غلاماں) ترکوں اور خدیو خاندان کے دورِ حکومت نے جو اثرات اس

www.abulhasanalinadwi.org

پر چھوڑے تھے، پھر اس میں برطانوی سامراجیوں نے جو اضافہ کیا تھا، اور مغربی تمدّن اور موجودہ غیر دینی تعلیم، اور مفاد پرست ذہنیت رکھنے والی سیاسی پارٹی بندی نے جو ذہن تیار کیا تھا وہ بھی اس کی نگاہ کے سامنے ہو۔

اس عہد کے علماء کی کمزوری اور قوت و مادّیت کے سامنے ان کی سرافگندگی پر بھی نظر ہو جس نے اس میں مزید نزاکت پیدا کر دی تھی، ان علماء میں سے اکثر امامت و رہنمائی کا منصب چھوڑ چکے تھے اور دعوت وارشاد اور جہاد و مقابلہ کے میدان کو خیر باد کہہ کے حالات کی رَو میں بہہ رہے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آواز پست ہو چکی تھی، بے حیائی و بے راہ روی اور الحاد و دہریت کے داعی سرگرمِ عمل تھے، مقبول و کثیر الاشاعت اخبارات ورسائل نے فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والی دعوتوں اور تخریب پسند تحریکوں کے لیے اپنا دامن وسیع کر رکھا تھا، یہ اخبارات و رسائل دین اور دینی قدروں، اخلاق اور اس کے اصولوں کا مذاق اڑا رہے تھے، بلادِ عربیہ عموماً اور مصر خصوصاً سطحیت پسندی، ضعف و انحطاط، جذباتیت و اخلاقی انارکی اور روحانی زوال کی آخری منزل کو پہنچ چکا تھا۔

ان ملکوں کے یہ شب و روز جس شخص کے علم میں ہوں، پھر وہ ان کی تصویر مصر سے نکلنے والے "الأھرام" "المُقَطَّم" "الھلال" اور "المُصوِّر" کے آئینے میں دیکھے، پھر ان کتابوں میں اس کا مشاہدہ کرے جو مصری ادباء و صحافی پیش کر رہے تھے، وہ ادباء و صحافی جن پر مصری نوجوان فریفتہ تھے، اور ان کے دل و دماغ پر ان کا جادو تھا، پھر وہ شخص اس پوری صورت حال کا صحیح خدّ و خال اور پورا عکس مصر کی پُر مسّرت تقریبوں اور جشن کی محفلوں اور مجلسوں میں دیکھے، نوجوانوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے ذوق و رجحان کا ان کی محفلوں اور جلسوں میں مشاہدہ کرے، وہ اسکندریہ اور اس کے ساحل کے حیا سوز مناظر دیکھے، اس نے اسکاوٹوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہو، کھیل اور ورزش کے میدانوں میں رہا ہو، سنیما گھروں میں مقامی و بیرونی فلموں کو دیکھا ہو، ان مخرّبِ اخلاق افسانوں کو پڑھا ہو جو مصری پریس سے سیلاب کی طرح اُبل رہے تھے اور نوجوان ان پر پروانوں کی طرح گرتے

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، اس نے زندگی کے میدان میں لوگوں سے گھل مل کر وقت گزارا ہو، وہاں پیش آنے والی چیزوں کو دیکھا ہو، زندگی سے الگ تھلگ رہ کر خیالی دنیا میں وقت گزارنے والا نہ ہو، تو اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ مسلمان ان پر آشوب گھڑیوں میں کیسی زبوں حالی کا شکار تھے اور عالمِ اسلام کے اس اہم خطے میں جس کو عالمِ عربی کا قائد و رہنما ہونا چاہیے تھا، جو صدیوں سے اسلام کے لیے سینہ سپر اور علومِ اسلامیہ کا مرکز رہا، جس نے ہمیشہ عالمِ عربی کی مدد کی تھی، اور اس کو سہارا دیا تھا، اور اسلامی تاریخ کی نازک اور مشکل ترین گھڑیوں میں اس کو بچایا تھا، جس میں سب سے عظیم اور قدیم اسلامی و ثقافتی مرکز "جامع ازہر" اب بھی موجود ہے، دعوتِ اسلامی کس زبوں حالی کا شکار تھی؟

جس نے اس پُر آشوب دور کو کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ قریب رہ کر دیکھا ہو، وہی اس شخصیت کی عظمت و انفرادیت کو سمجھ سکتا ہے جو یکا یک پردے کے پیچھے سے باہر آ گئی، اور پہلے مصر پھر پورے عالمِ عربی کو اپنی دعوت و تربیت، جہاد اور طاقتور شخصیت کے ذریعے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اللہ تعالیٰ نے اس رجلِ رشید اور فردِ فرید میں ایسی قوتیں وصلاحیتیں جمع فرمادی تھیں جو انسانی نفسیات اور علم الاخلاق کے ماہرین اور متعدد نقاد ومؤرخین کے نزدیک متضاد تھیں، بے مثال و تاباں عقل، اعلیٰ درجے کی فہم و ذکاوت، اُبلتا ہوا جوش و ولولہ، ایمان و یقین سے لبریز دل، قوی روحانیت، فصیح و بلیغ زبان، انفرادی زندگی میں غلو و تقشف سے پاک زُہد و قناعت، حوصلہ مندی و عالی ہمتی، جوش و شوقِ فراواں سے بھرپور دل، بلند پرواز و عقابی روح رکھنے والی ہمت، سحر آفریں دور بیں نگاہ، اپنی دعوت کی روح و مزاج کی حفاظت کا اہتمام، ذاتی معاملات میں حد درجہ تواضع و خاکساری اور اقبالؔ کے اس شعر کا صحیح مصداق۔

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

راقم سے بہت سے لوگوں نے بیان کیا کہ وہ روشنی کے ہلکے پَرتَو کی طرح تھے

www.abulhasanalinadwi.org

جس میں نہ ناگواری و تیزی ہوتی ہے نہ سایہ و تاریکی، ان اعلیٰ صفات اور خداداد صلاحیتوں نے ایک ایسی دینی واجتماعی قیادت کی تشکیل میں ان کی مدد کی جس سے زیادہ مؤثر وعمیق اور نتیجہ خیز دینی وسیاسی قیادت مدّتِ دراز سے عالمِ عربی میں وجود میں نہیں آئی تھی، ان صفات نے ایک ایسی دینی اسلامی تحریک پیدا کردی جس سے زیادہ ہمہ گیر وفعّال تحریک خصوصاً عرب ممالک میں عرصے سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی، یوں تو قدرتی صلاحیتوں سے مالا مال یہ داعی جامعِ کمالات تھا، مگر دو صفتیں اس میں ایسی تھیں جو بہت کم داعیوں، مصلحین اور قائدین میں پائی جاتی ہیں(۱) پہلی صفت اپنی دعوت وتحریک سے غیر معمولی شغف اور اس پر کامل اطمینان وانشراح اور اس کے لیے پوری فنائیت اور اپنی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں، وسائل اور طاقتوں کے ساتھ اس میں ہمہ تن مشغول رہنا، ان داعیوں اور قائدین کے لیے جن سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لیتا ہے اور عمومی فائدہ پہنچاتا ہے یہ اہم اور بنیادی شرط ہے۔

ان کی دوسری اہم خصوصیت وصفت، تربیت ومردم سازی کے کام میں ان کی حیرت انگیز کامیابی ہے، انھوں نے ایک نئی نسل تیار کی، وہ ایک پوری قوم کے مربی تھے، وہ ایک علمی، فکری اور اخلاقی مکتبِ فکر کے بانی تھے، پڑھے لکھے لوگوں اور اہلِ منصب میں جو بھی ان کے ساتھ کچھ دن رہا ان کے فکر ورجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، اپنے ہم نشینوں پر ان کا اثر ایسا گہرا تھا کہ عرصہ گزر جانے اور طرح طرح کے انقلابات وتغیرات پیش آنے کے باوجود بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، یہ اثر ایسا ''شعار'' وعلامت بن گیا ہے کہ زمان ومکان کی تبدیلی کے باوجود وہ اسی سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

اس کا افسوس ہے کہ مصر یا بیرونِ مصر مجھے ان سے ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہوسکی، پہلا سال جس میں اللہ تعالیٰ نے میرے لیے حج وزیارت مقدّر فرمائی تھی اور میں پہلی بار ہندوستان سے باہر نکلا تھا، وہ ۱۹۴۷ء تھا، جس میں شیخ حسن البنّا حجاز مقدّس تشریف

---

(۱) ان عنقا صفت لوگوں میں ایک مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (بانی جماعت تبلیغ) دوسرے ان کے لائق وہونہار فرزند اور خلف رشید مولانا محمد یوسف صاحب تھے، یہ دونوں حضرات ان دونوں چیزوں میں آخری مثال تھے۔

نہ لائے تھے، بلکہ وہ اس سال مصر سے باہر نہیں نکلے تھے، حالانکہ کم ایسا ہوتا کہ وہ اپنی دعوت وتحریک کے لیے رفقاء کے ساتھ حج کے موقع پر حجاز نہ آتے ہوں اور اپنی دعوت کو پھیلانے اور حج کے لیے باہر سے آئے ہوئے وفود سے ملنے کی خاص کوشش نہ کرتے ہوں۔

حجاز میں مجھے ان کے بعض شاگردوں اور کارکنوں سے ملنے کا موقع ملا اور میں نے ان کے اندر ایک زبردست قائد و مربی کے اثرات نمایاں طور پر محسوس، جب ۱۹۵۱ء میں مجھے مصر جانے کا موقع ملا تو وہ جامِ شہادت نوش کر چکے تھے، ان کی عمر ابھی صرف بیالیس سال تھی، اس میں شک نہیں کہ ان کی شہادت نے لاکھوں مسلمانوں کو سوگوار اور دل گرفتہ بنا دیا، اور عالمِ اسلام اس تاریخ ساز شخصیت سے محروم ہو گیا، ان سے ملاقات نہ ہونے کا قلق ہمیشہ رہے گا، تاہم مصر میں مجھے ان کے تربیت یافتہ اصحاب سے ملنے کا اچھی طرح موقع ملا اور ان کے درمیان میں ایک فردِ خاندان کی طرح رہا، مصر کے زمانۂ قیام میں میں نے ان کے والد بزرگوار ممتاز محدث و محقق شیخ عبدالرحمٰن البنا سے ملاقات کی اور ان سے شیخ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں گرانقدر معلومات حاصل کیں اور پھر اپنی کتاب ''شرق اوسط کی ڈائری'' میں اس ملاقات کا حال اور یہ قیمتی معلومات درج کیں، میں ان کے رفقاء اور ارکان جماعت سے بھی ملا اور ان ملاقاتوں اور معلومات سے اس دعوت کے قائد اور اس مکتبِ فکر کے بانی کی پوری تصویر میرے سامنے آگئی اور مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور مطابقِ حال تصویر ہے۔

مصر کے اسی سفر میں ان کی یہ کتاب ''مذکرات الدعوۃ والداعیۃ'' میرے ہاتھ لگی، ان کی شخصیت اور دعوت کو سمجھنے کے لیے میں نے اس کتاب کو ان کی ایک بنیادی کتاب اور ان کی شخصیت کی سب سے بڑی کلید پایا، اس کتاب کو پڑھنے والے ہر شخص کو ان کی عظمت و طاقت کے سرچشمے، ان کی کامیابی اور دلوں پر ان کے اثر و نفوذ کے اسباب کا پتہ بہ آسانی لگ جائے گا۔

اس کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ان کی طاقت وقوت کا اصل سرچشمہ فطرتِ

www.abulhasanalinadwi.org

سلیم، دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی، دینی غیرت وحمیت، اسلام کے لیے اضطراب وبے چینی، اس زمانے کے فاسد ماحول پر ان کی بے چینی اور تشویش، اخلاص وللٰہیت، عبادت کا ذوق وشوق اور دل کے ٹارچ کو ذکر ودعا، توبہ واستغفار اور آہِ سحر گاہی کے ''دِسلِس'' سے بھرنا تھا، ان ساری خصوصیات وصفات کے ساتھ قوم کے افراد اور عوام الناس سے ان کی محفلوں اور مشغولیت کی جگہوں میں ملنا، غفلت کے اڈوں پر ان سے ملاقات کرنا اور حکمت وتدبّر کے ساتھ دھیرے دھیرے ان کی تربیت کرنا، ہمہ وقت متحرک اور کام میں مشغول رہنا، ان کا شعار تھا، اور یہی ساری صفات اسلامی وربانی دعوت اور ایسی دینی تحریک کی جان ہوتی ہیں، جو معاشرے میں تعمیری واصلاحی انقلاب لانا چاہتی ہے اور وقت کے دھارے اور تاریخ کے رخ کو موڑنا چاہتی ہے، اس لحاظ سے دعوت واصلاح کے میدان میں کام کرنے والے ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا اور اس پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے غور وفکر کرتے رہنا نہایت مفید ہے۔

اس اہم دعوت کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا جس نے عالم عربی کی نئی نسل میں اسلام کی سدا بہار صلاحیت اور اس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا، جس نے جدید نسل کے دلوں میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی، ان کے احساس کمتری وشکست خوردگی کا مقابلہ کیا جس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا، اس دعوت نے نوجوانوں کی بے راہ روی، ان کی اندرونی کمزوری اور ہوا وہوس کے پیچھے دوڑنے کی ذہنیت کا مقابلہ کیا، اور اس کے تنِ نازک میں جان ڈال دی، اور اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

کا نقشہ کھینچ دیا، ان کی اس دعوت سے یہ جدید نسل تازہ دم ہوگئی، اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور اس نے شجاعت وجوانمردی اور صبر وثابت قدمی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا، اس تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور اس کے نقوش کو مٹانے کی کوشش اور اس کے چلانے والوں کو قید وبند اور جلاوطنی کی سزائیں اور رونگٹے کھڑے کردینے والی اذیتیں وہ

بدترین جرم ہے جس کو تاریخ اسلام کبھی معاف نہیں کرسکتی (۱)، یہ ایسا المیّہ ہے، جس کو عالمِ اسلام کبھی فراموش نہیں کرسکتا، یہ عالمِ عربی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہوسکتا، اس جرم کا کفارہ ملک کی کسی بڑی سے بڑی تعمیری وسیاسی خدمت سے نہیں ادا کیا جاسکتا، یہ اتنا وحشت ناک جرم ہے کہ جس کی مثال صرف تاتاریوں کی وحشت وبربریت یا قدیم مسیحی دنیا کے دورِ تعصب میں ملتی ہے۔

❑❑❑

---

(۱) شیخ حسن البنا کی شہادت اور جماعت "الاخوان المسلمون" کے خلاف قانون بنائے جانے اور تحریک کی قانونی بندش اور ممانعت کی طرف اشارہ ہے، مصنف کو ۱۹۵۱ء میں مصر کے دوران قیام کا وہی زمانہ اور ماحول ملا۔

www.abulhasanalinadwi.org

سیّد قطب شہیدؒ

اسے حُسنِ اتفاق ہی کہنا چاہئے کہ سید قطب شہیدؒ سے میں پہلی بار اس مقدّس شہر میں متعارف ہوا جسے مرکزِ اسلام اور نزولِ وحی کا مقام ہونے کا شرف حاصل ہے، یہ تعارف دید وشنید ملاقات وگفتگو کا نہیں، بلکہ خالص علمی وفکری تعارف تھا، جو ان کی مشہور وبلند پایہ تصنیف "العدالة الاجتماعية فی الاسلام" کے ذریعے ہوا، یہ قصہ ۱۹۵۰ء کا ہے، جو اس سے بہت پہلے بھی ہوسکتا تھا، اور ادبی وفکری ملاقات کے سارے امکانات موجود تھے، کیوں کہ مشرق عربی میں رواں دواں اسلامی ثقافت کے قافلے سے میرا تعلق کبھی منقطع نہیں رہا، میں مستقل اس کی کوشش کرتا رہا کہ اس قافلے کی ہمرکابی سے محروم نہ رہوں، عرب ممالک کے مطالعے سے نکلنے والی تمام چیزوں کے حاصل کرنے اور پڑھنے کا میرا شوق حرص کی حد تک بڑھا ہوا تھا، مصر کے مطالعے سے جو چیزیں بھی نکلتی رہیں، اچھی ہوں یا بری، کھری ہوں یا کھوٹی، میری کوشش ہوتی تھی کہ ہر کتاب، ہر تحریر میری نظر سے گزر جائے، چنانچہ میں عبّاس محمود العقّاد، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، احمد حسن الزیات اور ان سے پہلے مصطفےٰ لطفی منفلوطی اور رافعی وغیرہ کو پڑھتا رہا تھا، مصر سے شائع ہونے والے دو ممتاز ومعروف ہفت روزہ پرچے "الرسالة" اور "الثقافة" پابندی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، یہ دونوں صرف ہفت روزہ رسالے نہیں تھے بلکہ دو ادبی اسکول تھے، دونوں کے نقطہائے نظر الگ اور دونوں کا اپنا اپنا اسلوب تھا، اس دور میں مصر کے بیشتر ادباء اور نوجوان اہلِ قلم انھیں دو اسکولوں میں بٹے ہوئے تھے، اور میں دونوں رسالوں میں لکھنے والے اہلِ قلم سے واقف تھا۔

"الرسالة" میں سید قطب نام کے ایک صاحبِ قلم کے مضامین میری نظر سے

www.abulhasanalinadwi.org

گزرتے تھے جو اکثر ادبی وتنقیدی مسائل وافکار پر لکھا کرتے تھے، یہ بات بھی مخفی نہیں تھی کہ یہ عقاد کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی مدافعت اور ان کے مخالفین پر تنقید میں پیش پیش رہتے تھے۔

لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ مجھے ان سے پہلا، گہرا اور بھرپور تعارف بلد امین میں ہو، اور کعبۃ اللہ کے زیر سایہ حاصل ہو، اور اچھی زمین میں اچھا پودا ثابت ہو "وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ" (الأعراف:٥٨) (اور پاکیزہ شہر اپنے رب کے حکم سے اپنے پودے نکالتا ہے)۔

قصہ یوں ہے کہ حجاز کے مشہور ادیب اور میرے محترم دوست استاذ احمد عبدالغفور عطّار، عقاد اور سید قطب کے شیدائیوں میں سے تھے، سید قطب کو انسان اور ادیب دونوں حیثیتوں سے بہت پسند کرتے تھے، وہ ان دونوں ادیبوں کا تذکرہ بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے، ۱۹۵۰ء کی سردیوں کی ابتدا میں طائف کے ایک سفر میں ہم دونوں ایک ساتھ ہو گئے، اور مکّہ مکرّمہ سے قریب اس پہاڑی مقام پر چند دن ساتھ گزارنے کا موقع ملا، باذوق وہم خیال رفیق سفر سے سفر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے، استاد احمد عبدالغفور عطّار کی دلچسپ علمی وادبی گفتگو نے اس سفر کو دلچسپ وخوشگوار بنا دیا تھا، اسی موقع پر انھوں نے سید قطب کی کتاب "العدالة الاجتماعية فى الاسلام" مطالعے کے لیے دی، جگہ پُر بہار تھی، اور موسم خوشگوار اور ذہن مطالعے کے لیے آمادہ وتیار، میں کتاب پڑھتا رہا، متأثر بھی ہوتا رہا، اور لطف بھی لیتا رہا، مجھے اس نوجوان صاحبِ قلم کی تحریر میں افکار اور ان کی پیش کش کا نیا اور اچھوتا انداز نظر آیا جو اسلام پسند اہلِ قلم اور خاص طور سے اس وقت کے عرب اہلِ قلم میں نظر نہیں آتا تھا، اس کی وضاحت کے لیے قدرے تفصیل درکار ہے۔

مشرقی اور مغربی زبانوں میں انیسویں صدی مسیحی کے نصف اخیر میں بہت سے مسلمان اہلِ قلم ابھرے اور شہرت کی منزلیں طے کیں، مصر وہندوستان میں اور ترکی اور ایران میں بھی، لیکن ان کی تحریریں اور تصنیفات پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے، جیسے یہ لوگ

www.abulhasanalinadwi.org

ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں، اور ایسے مقدمات یا ایسی شخصیات کا دفاع کر رہے ہیں، جو شکوک وشبہات کے کُہر میں گھرے ہوئے ہیں، ان کا مقدمہ کمزور ہے اور دلائل ناکافی، ان کی ساری کوشش اور محنت اس بات پر صرف ہوتی تھی کہ مخالفین کمزوریوں سے صرفِ نظر کرلیں، اور جو فیصلہ صادر کریں اس میں زمان ومکان کے فرق کا اور ان کے موکل (وہ دعوت وتحریک ہو یا شخصیت) کو جن دشوار حالات کا سامنا تھا اس کا لحاظ رکھیں، اور یہ کہ جن حالات میں ان لوگوں نے کام کیا، وہاں اس سے زیادہ کر دکھانا ممکن ہی نہیں تھا، اس طرزِ کلام کو معذرت خواہانہ (APOLOGETIC) یا دفاعی (DEFENSIVE) کہنا زیادہ صحیح ہے۔

اس اسلوب وانداز کو اختیار کرنے والوں میں درجات کے تھوڑے فرق کے ساتھ مصر میں شیخ محمد عبدہ (اللہ ان کو معاف فرمائے) رفاعہ طہطاوی اور قاسم امین ممتاز تھے، اور ہندوستان میں سر سید احمد خاں، سید امیر علی، صلاح الدین خدا بخش اور منشی چراغ علی وغیرہ نے یہی اندازہ اختیار کیا، محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین بھی کم وبیش اسی راہ پر چلتے رہے، یہ حضرات اپنی تعلیم وتربیت کے اثر سے اور انگریز حکومت کے رعب ودبدبے کی وجہ سے غالباً یہ سمجھتے تھے کہ مغربی تہذیب وتمدن کی عظمت وشوکت ایک بدیہی حقیقت ہے، اس میں نقد ونظر کی گنجائش ہی نہیں، یہ انسانی عقل اور انسانی علوم کی ترقی کا آخری زینہ ہے، مغربی تہذیب اور اس کے اقدار وافکار کے بارے میں جرح وتعدیل اور ان پر بحث ومباحثہ کا ان لوگوں کے ذہن میں خیال بھی نہیں آتا تھا، اور اس کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس تہذیب یا ان افکار ونظریات پر قوت واعتماد کے ساتھ تنقید کریں، ان کو چیلنج کریں یا جن بنیادوں پر اس تہذیب کی عمارت استوار ہوئی ہے ان کو بحث ونظر کا موضوع بنائیں، یہ اسلوب وانداز اس پُر اعتماد (ہجومی) طاقتور اور علمی اسلوب سے قطعاً مختلف تھا، جسے امام غزالیؒ نے یونانی فلسفہ پر تنقید کے لیے "تہافۃ الفلاسفۃ" میں یا ارسطو کی منطق پر تنقید کے لیے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے "الرد علی المنطقیین" میں اختیار کیا تھا، ان کے بعد صدیوں تک یہ اسلوب متروک ہی رہا، یہاں تک کہ مغرب کی ترقیوں

www.abulhasanalinadwi.org

کا دور آیا اور اس نے دل و دماغ کو مسحور کر لیا۔

راقم سطور پر اللہ کی مہربانی تھی، اور اس کی حکمت کہ ایسے ماحول میں اس کا نشو ونما ہوا جو مغربی تہذیب وتمدن کی سحر طرازیوں اور دلفریبیوں سے محفوظ بلکہ اس کا باغی، اور افراط وتفریط سے دور صحیح اسلامی عقائد وتعلیمات کے اثرات سے معمور تھا، اور زمانہ بھی ایسا ملا جب ملک میں آزادی کی تحریک اور سیاسی شورش کے اثر سے مغرب کا جادو ٹوٹ رہا تھا، ایسے مشفق مربی کی تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا جس نے قدیم وجدید دونوں تعلیم حاصل کی تھی، دونوں کا عطر کشید کر لیا تھا، دونوں کے اچھے اور مفید حصوں کو اخذ کر کے چھلکوں اور غیر مفید اجزا کو چھوڑ دیا تھا، اور مغربی تہذیب اور اس تہذیب کے نمائندوں پر منصف ومعتدل ناقدوں میں سے تھے (۱) پھر ایسے اساتذہ سے تلمّذ کا شرف حاصل ہوا جو علمی مہارت کے ساتھ ذہنی وفکری آزادی، اخلاقی جرأت اور نقد ونظر کی صلاحیت وہمّت سے بھی بہرہ ور تھے، اس ماحول اور اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایسی تحریروں کو قبول کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی، جن میں کمزوری، شرمندگی یا شکست خوردگی کے اثرات ہوں، جو صرف دفاع پر مبنی ہوں اور جن میں جرأت وہمّت پر سکون وسلامتی کو اور فتح وظفر کے مقابلہ میں اپنی جان کی خیر منانے کو ترجیح دی گئی ہو، اس شکست خوردہ ادب کا کوئی نمونہ سامنے آتا تو ذوق اس کو قبول نہیں کرتا تھا، اور طبیعت کھٹی ہو جاتی تھی، ذہن عالی ہمتی، بلند نگاہی، عزتِ نفس اور ایمان وعقیدہ پر اعتماد واعتزاز کی طرف مائل تھا، ان قوموں سے نفرت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی جنھوں نے اسلام پر حملے کیے اور نوع انسانی کو شکوک وشبہات، خواہشات نفسانی، مادّہ اور طاقت کی پرستش کے گڑھے میں ڈھکیل دیا، جنھوں نے مکر وفریب کو اپنا شعار بنا رکھا تھا، ذہن ان قوموں کی عظمت، ان کی طرف سے مدافعت یا ان کے سایہ میں پناہ لینے کو کسی طرح قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا، خواہ ایسی تحریریں کتنے ہی بڑے اہلِ قلم کی طرف سے کیوں نہ آئیں۔

---

(۱) راقم کے برادر بزرگ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی بی ایس سی، ایم. بی. بی ایس، سابق ناظم ندوۃ العلماء مراد ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

پہلی شخصیت جس کے ادب سے راقم کے ذہن وضمیر کو اطمینان وآسودگی ملی جس سے اعتماد واعتزاز، عالی ہمتی، بلند نظری اور وفورِ جذبات کی نئی خوراک ملتی تھی، اور جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ رگوں میں خون کی رفتار تیز ہوگئی، بدن میں جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں، شعور وافکار میں حرکت پیدا ہوگئی اور امیدوں اور آرزوؤں کو نئی زندگی مل گئی، وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کا ادب تھا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی ابدیت اور ہر دور میں اس پیغام کے حاملین میں قیادت کی صلاحیت پر ایمان رکھتے تھے، انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کی عظمت وقوت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کے بڑے بڑے نمائندوں اور رہنماؤں کو چیلنج کیا۔

معاصرین کی کتابوں اور تحریروں کا مطالعہ جاری رہا اور ایک نومسلم اور ایک خاندانی مسلمان کی تحریروں میں یہی خود اعتمادی اور علمی پختگی کا رنگ نظر آیا، محمد اسد (سابق LEOPOLD WEISS) اور مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، اول الذکر کی انگریزی کتاب (ISLAM AT THE CROSS ROAD) کا مطالعہ کیا، اور ثانی الذکر کے مقالات ترجمان القرآن میں پڑھتا رہا، جن میں مغربی تہذیب اور اس کی بنیادوں پر تنقید ہوا کرتی تھی، بعد میں یہ مقالات ''تنقیحات'' کے نام سے ایک کتاب میں جمع کیے گئے، یہ دونوں حضرات مغربی تہذیب کو ایک ایسے علمی مسئلہ کی طرح لیتے تھے جس میں بحث ونظر کی بڑی گنجائش ہے، علمی، سماجی اور تمدنی مسائل پر اور مذاہب، تہذیبوں اور فلسفوں کے تقابلی مطالعے پر یقین واعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔

مجھے مصر اور دوسرے عرب ممالک کے اہلِ قلم میں بھی ایسے طاقتور عنصر اور ایسی بلند نگاہی کی تلاش رہتی تھی، اور مصری ادباء ومصنفین میں صرف عقاد کی تحریروں میں اس کی جھلکیاں نظر آتی تھیں، جن میں وہ آزاد رو محقق اور بالغ نظر ناقد نظر آتے تھے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ عرب اہلِ قلم کے اسلوبِ تحریر اور طرزِ فکر میں سید جمال الدین افغانی کے اسکول نے بہت اثر ڈالا ہے، یہ جب میدانِ سیاست میں آتے تو استعماری طاقتوں پر جرأت وہمت کے ساتھ تنقید کرتے اور ان پر سخت حملے کرتے، نہ سزاؤں اور

دھمکیوں سے ڈرتے نہ قید و بند اور ملک بدر ہونے کو خاطر میں لاتے، لیکن وہی لوگ جب مغربی تہذیب کو موضوع بناتے، یا سیاسی نظام، اقتصادی فلسفوں اور عمرانی علوم پر لکھنے بیٹھتے تو ان کے قلم جیسے تھک جاتے، زبان لڑکھڑانے لگتی، اسلوب کمزور پڑ جاتا، ان کی تحریروں سے یہ جھلکنے لگتا کہ مغرب ہی ہر چیز میں مثالی نمونہ ہے، اور ترقی کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ کسی طرح ان کے مقام تک پہنچا جائے اور انھیں کی نقل کی جائے، عربی زبان کے مشہور ترین اہلِ قلم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافة في مصر" اسی طرزِ فکر کی بلند ترین چوٹی پر نظر آتی ہے، اس زمانے میں جو کچھ بھی پڑھنے کو ملتا تھا وہ شعر و ادب ہو یا علمی و تحقیقی بحثیں یا تاریخی مطالعے اور جائزے، ایسا لگتا جیسے سب ایک ہی دُھن پر نغمہ سرا ہیں۔

مکّہ مکرّمہ میں جب مجھے یہ کتاب "العدالة الاجتماعية في الاسلام" تحفے میں ملی تو یہ (خاص طور سے جدید عربی کتب خانہ میں) میرے لیے ایک غیر متوقع چیز تھی، مجھے ایسا لگا جیسے میری کوئی عزیز اور کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی، یا میں نے کوئی نیا انکشاف کیا، اس کتاب کا مصنّف اس معذرت خواہانہ اسلوب سے آزاد تھا جسے ایک مدت سے مسلمان اہلِ قلم نے اپنا شعار بنا رکھا تھا، اس نے دفاع کے بجائے حملے کا انداز اختیار کیا تھا، اور مغربی افکار کے بارے میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اور ان آزاد ناقدین کی سطح سے گفتگو کی تھی، جن پر کسی سماج، ثقافت، سیاست یا مصلحت کا دباؤ نہ ہو، جن کی بحث و تحقیق کی غرض و غایت صرف حقیقت کی تلاش ہو اور جنھوں نے مغربی تہذیب و تمدّن کو کتابوں میں نہ پڑھا ہو، بلکہ اس میں زندگی گزار کر اور اس کو برت کر دیکھا ہو، مسیحیت اور یونانی و رومی تمدّنوں کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا ہو، جدید اقتصادی اور اجتماعی فلسفوں اور نظریات کو جانچا اور پرکھا ہو اور مغربی تہذیب اور اس کے طویل تجربات کی تحلیل اور تجزیہ کر سکتا ہو۔

اس کتاب میں میرے لیے سب سے زیادہ مؤثر اور جاذبِ قلب و نظر جو چیز تھی وہ مصنّف کا اپنے دین کی صلاحیت، اس کی برتری اور اس کی ابدیت پر ایمان، اور یہ کہ یہی ایک ایسا پیغام ہے جس میں نوعِ انسانی کی سعادت و کامرانی کی ضمانت ہے، اگرچہ اس

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی ملیں جن میں مصنف سے میں اتفاق نہیں کرسکا اور دل میں خیال آیا کہ کاش کتاب ان قابلِ گرفت چیزوں سے خالی ہوتی یا فاضل مصنف نے ان باتوں کی تلاش و تحقیق پر مزید توجہ دی ہوتی اور ان برگزیدہ شخصیتوں کے بارے میں احتیاط سے قلم اٹھایا ہوتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف عطا کیا تھا، (۱) اور غلطیوں سے پاک ذات صرف اللہ کی ہے (۲)۔

بعد میں اللہ تعالیٰ نے مصنف کتاب سے شخصی تعارف، ان کے ساتھ بار بار اور دیر دیر تک بیٹھنے اور آزادانہ تبادلۂ خیالات کا موقع بھی عنایت فرمایا، ۱۹۵۱ء کے ابتدائی دنوں میں راقم سطور نے قاہرہ کا سفر کیا تو ان سے ملاقات کا مصمم ارادہ تھا ہی، لیکن پہل انھی کی طرف سے ہوئی کہ انھوں نے ہمارے مشترک دوست اور قاہرہ میں "المطابع العربیۃ" کے مالک الحاج حلمی منیاوی (مؤمن صالح جنھیں اپنے ایمان و عقیدے کی وجہ سے وطن چھوڑنا پڑا، خطرات میں زندگی گزاری اور وطن سے باہر ہی وفات ہوئی، اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے) سے مطالبہ کیا کہ حلوان میں ان کے مکان میں ہم لوگ اکٹھا ہوں، چنانچہ جمعہ ۱۷/۵/۱۳۷۰ھ (۲۳/۲/۱۹۵۱ء) کو ہماری ملاقات ہوئی جسے بھلایا نہیں جاسکتا، وہ بڑے خلوص سے اور بہت کھل کر ملے، وہ میری کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پڑھ چکے تھے، جو ان کے ذوق و رجحان سے ہم آہنگ تھی، اس میں باتوں کو پیش کرنے کا انداز و اسلوب بھی ان کے اپنے اسلوب سے ملتا ہوا تھا، اس کتاب میں اسلام کو عالمی اور ابدی پیغام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو اسی لیے بھیجا گیا

---

(۱) سید قطب نے خود بھی اس بات کو محسوس کیا، چنانچہ سیدنا عثمانؓ کے بارے میں کتاب کے پہلے ایڈیشن میں جو عبارت تھی بعد کے ایڈیشنوں میں بدل دی گئی۔

(۲) یہاں ناقدانہ نظر سے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سید قطب مرحوم نے بعض قرآنی اصطلاحوں کی جو تعبیر و تشریح کی ہے اور ان کا جو مرکزی نقطہ، اصل روح، اور مرکزی خیال قرار دے کر اس پر زور دیا ہے، اس سے راقم کو پورا اتفاق نہیں ہے تفصیل کے لیے راقم سطور کی کتاب "عصر جدید میں دین کی تفہیم و تشریح" شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" ملاحظہ ہو، لیکن یہ اختلاف و تنقید علمی و فکری حدود میں ہے، اور شہید مرحوم کے پورے احترام و اعتراف کے ساتھ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہے کہ باقی رہے اور پروان چڑھے، رہنمائی اور قیادت کرے، دنیا میں صرف اسی پیغام کو رہنمائی اور قیادت کا منصب ومقام حاصل ہے اور اس پیغام کے حاملین کے لیے عزّت وسر بلندی لکھ دی گئی ہے، رہے دوسرے ادیان ومذاہب تو ان کا ستارہ غروب ہو گیا، ان کا وقت ختم ہو چکا، ان ادیان کی اساس پر جو تہذیبیں قائم ہوئیں، ان کے چراغوں کا تیل ختم ہو گیا، اور ان کی بتّی تک جل چکی تھی، جذبات وخیالات اور ایمان وعقیدہ کی ہم آہنگی کا فطری تقاضا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے اور اپنا دل کھول کر رکھ دیتے، اس مجلس میں سید قطب زیادہ تر اپنی زندگی، اپنے تجربات اور زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ کون سے اسباب وعوامل تھے جنھوں نے زندگی کو ایک نیا رخ دیا اور ان کو صفِ اول کا اسلامی ادیب وانشا پرداز، مشہور ومؤثر داعی، نئی نسل کا مربی اور ایک مستقل مؤثر، دلکش اور ثمر بار ادبی وفکری مکتبِ فکر بنا دیا، جوان کی شہادت کے بعد بھی پھل دے رہا ہے، یہ گفتگو سید قطب کی شخصیت اور ان کے افکار کو سمجھنے کے لیے علمی وتاریخی اہمیت کی حامل تھی، جس سے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں پر لکھنے والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں (۱)۔

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، کبھی مختلف اسلامی پروگراموں اور "جمعیة الشبان المسلمین" کے جلسوں میں ہم ساتھ شریک ہوئے اور حلوان میں اُن کے گھر پر بھی ملاقاتیں اور مجلسیں رہیں، خیالات کی ہم آہنگی اور باہمی اعتماد وخلوص نے مجھے آمادہ کیا کہ میں ان سے اپنی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پر مقدمہ لکھنے کے لیے کہوں، وہ اس کتاب سے متاثر تھے، ہر جمعہ کو ان کے گھر پر یونیورسٹی کے فضلاء، ادباء، مفکرین اور تعلیم یافتہ نوجوان جمع ہوتے تھے، اس علمی مجلس میں ایک ہفتہ میری کتاب بحث ومباحثہ کا موضوع بن چکی تھی، اس مباحثہ میں میں بھی شریک تھا، اور اس کتاب کے ساتھ سید قطب

---

(۱) یہ گفتگو راقم کے سفرنامہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" میں دیکھی جا سکتی ہے، ملاحظہ ہو ص: ۸۸ تا ۹۰ سید قطب کے مزید حالات اسی کتاب کے صفحات ۱۴۹، ۱۵۰/ اور ۱۸۵، ۱۸۶ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

کے اہتمام کو بھی دیکھ چکا تھا، اسی طرح اس کتاب کے بہت سے پڑھنے والوں کے ساتھ میرا بھی احساس تھا کہ اس پر ڈاکٹر احمد امین کے مقدمہ نے کتاب کی قیمت کو کم کر دیا ہے، کیوں کہ وہ مقدمہ جوش اور جذبہ کے ساتھ نہیں لکھا گیا تھا، بلکہ صرف ذمّہ داری ادا کی گئی تھی، یا فرمائش پوری کی گئی تھی، اور صاحبِ مقدمہ اس کتاب کی بنیادی فکر سے متفق نہیں تھے، یا کم از کم اس کے پُر جوش حامی نہیں تھے، اردن کے سابق حکمراں شاہ عبداللہ بن حسین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "اس مقدمہ نے کتاب کو نقصان پہنچایا ہے"، اور اس میں ڈاکٹر احمد امین کا کوئی قصور نہیں، کیوں کہ فکر و تحریر میں ان کا ایک خاص انداز تھا اور ہر ادیب و محقق کے لیے نہ ضروری ہے نہ ممکن کہ جس کتاب پر بھی مقدمہ لکھے اس سے لُطف اندوز بھی ہو اور پُر جوش بھی، بہرحال نئے مقدمے کا خیال میرے ذہن پر چھا گیا اور اس کو دبا نہیں سکا اور یہ بہتر بھی ہوا، سید قطب نے اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا اور جو دوسرے ایڈیشن سے مستقل کتاب کی زینت ہے، ایک مستقل قیمتی مقالہ ہے، اس میں انھوں نے تاریخ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے، نیز یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ کس طرح لکھنی چاہیے، کتاب جس مقصد کی طرف دعوت دے رہی ہے، انھوں نے اس مقصد کی اخلاص اور جذباتی تعلق کے ساتھ اور بڑی طاقت اور جوش کے ساتھ وکالت کی ہے، جو سید قطب کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔

سید قطب نے مؤلّفِ کتاب کے ساتھ اسی لطف و کرم پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انبیائے کرام کے قصوں پر مشتمل مسلمان بچوں کے لیے مؤلف ہی کی دوسری کتاب "قصص النبیّین للاطفال" کے تیسرے حصّہ پر بھی ازراہ کرم مقدمہ لکھا اور اس میں انھوں نے مؤلّف کے لیے ایسا اعتراف کیا، جس کی توقع ایک بلند نظر، وسیع الظرف اور وسیع القلب مومن صادق ہی سے ہو سکتی ہے، انھوں نے لکھا:۔

"میں نے بچوں کے لیے لکھی گئی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں، انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے قصے بھی پڑھے ہیں، قرآن مجید میں مذکور قصوں پر مشتمل سلسلۂ

www.abulhasanalinadwi.org

کتب "القصص الدینی للأطفال" کی تالیف میں خود بھی شریک رہا ہوں، لیکن میں بغیر کسی رو رعایت کے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ زیرِ نظر قصہ میں سید ابوالحسن کا کام زیادہ جامع اور مکمل ہے، اس میں بڑے لطیف اشارے، کہانی اور سلسلۂ واقعات کے مقاصد کی وضاحتیں اور کہانی کے بیچ بیچ میں ضروری تفصیلات اور بڑے اہم ایمانی حقائق کی طرف بلیغ اشارے ہیں، جو بچوں اور بڑوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتے ہیں"۔

اس وقت اس کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سید قطب ادیب وانشا پرداز یا محقق ومفکّر کے حدود سے آگے بڑھ کر عملی جدوجہد کے میدان میں بھی داخل ہوں گے، مجاہدین ومؤمنین کی جماعت کی قیادت کریں گے اور ظلم وسفاکی اور وحشت وبربریت کے مقابلے میں دنیا کے سامنے ہمّت وشجاعت اور عزم وثبات کا نادر نمونہ پیش کریں گے، جس سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور روح لرز اٹھے، اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی اور ان کی جدّ وجہد تصنیف وتالیف اور اسلامی نظریات کی ترتیب وتشریح تک محدود رہے گی، باقی ذمّہ داریاں مسلمانوں کی اگلی نسل کے مہم جُو نوجوانوں کے لیے چھوڑ دیں گے جیسا کہ بہت سے قدیم اور معاصر داعیوں نے کیا، ان کے ساتھ پہلی ملاقات میں ان کی صحت اور ان کے اسلوب کے درمیان بڑا فرق نظر آیا تھا کہ کمزور صحت، نحیف ونزار جسم لیکن بڑا طاقتور، چیلنج کرنے والا اور پرجوش اسلوب کہ انسان اس کی گرمی اور قوت محسوس کیے بغیر نہ رہے، دہکتا ہوا قلم جس سے چنگاریاں نکلتی تھیں جیسے قلم نہیں آگ کا انگارہ ہے، جسمانی صحت اور اسلوبِ نگارش کے اس فرق نے مجھ پر اثر ڈالا تھا، اور میں نے اپنے تأثرات اپنے سفرنامہ میں لکھ بھی دیئے تھے (۱)۔

غالباً وہ خود بھی حالات وحادثات میں پوشیدہ محرّک قوت سے واقف نہیں تھے، جو صاحبِ واقعہ کے لیے بھی اتنے ہی غیر متوقع اور حیرت انگیز ہوتے ہیں، جس قدر دوسروں کے لیے، ان کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مستقبل کے لیے پردۂ غیب نے کیا کچھ چھپا رکھا ہے، وہ

(۱) ملاحظہ ہو مذکرات سائح فی الشرق العربی، ص: ۸۹، ۹۰۔

اپنے کو دعوت اسلامی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل سمجھتے بھی نہیں تھے، اس سلسلے میں میرے سفر نامہ میں بعض قابلِ توجہ حقیقتیں آ گئی ہیں، جن پر ایک بار پھر نظر ڈالنی چاہیے، اس سے عظیم اسلامی ادیب کے ایمان، ان کی تواضع وکسر نفسی اور ان کی نظر میں قیادت کے "تقدس" اور گراں بار ذمہ داریوں کے احساس وشعور کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں میں اس سفر نامہ کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں جو ایک اہم اور قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے:۔

"اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ پہلا شخص جو اس کام کی نگرانی کرے کون ہو؟ بعض اہلِ مجلس نے سید قطب کی طرف اشارہ کیا، ان کی تعریف کی، اور ان سے کہا کہ جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں، وہ خلوص قلب، پختہ عقیدہ اور اچھے اخلاق کی آئینہ دار ہیں، اس پر سید قطب بول اٹھے اور بہت کھل کر نہایت بے تکلفی کے ساتھ فرمایا کہ میں اپنے کو اس تعریف وتوقع کا اہل نہیں سمجھتا، کتابوں کا شائع ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ مصنف نے اسلامی تربیت اور اصلاحِ نفس کی پہلی منزل طے کر لی ہے، میں اپنے ماحول میں شر وفساد کی ہونے والی جنگ اور راحت وآسائش اور بے فکری سے واقف ہوں اور ایمان وجہاد جس ایثار قربانی اور زہد وروحانیت کے طالب ہیں، اس کے فرق کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ آخری منزل ابھی دور ہے، اصل معیار وہ ہے جو قرآن نے مقرر کیا ہے "قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ. الآية".

اگر میں اپنے اس مکان اور جھونپڑے، ملازمت وبے کاری، فقر ومالداری کے اسباب کو برابر نہیں سمجھتا تو میں حقیقتِ ایمان اور اسلامی تربیت سے دور ہوں، میں خود کو اور غیروں کو دھوکا نہیں دینا چاہتا (۱)"۔

لیکن یہی سید قطب جب گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، جیل میں ڈالے گئے، اور اذیتیں پہنچائی گئیں، یہاں تک کہ ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۶ء) میں اللہ تعالیٰ نے انھیں شہادت سے سرفراز

(۱) مذکرات سائح فی الشرق العربی، ص:۱۸۵۔

www.abulhasanalinadwi.org

فرمایا، تو انھوں نے ایسی شجاعت واستقامت کا مظاہرہ کیا کہ لوگ حیران رہ گئے، انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ انھوں نے جو نظریہ پیش کیا تھا، دوسروں سے پہلے وہ خود اس پر یقین وایمان رکھتے تھے، اور اپنی پاکیزہ روح اور اپنے خون کے آخری قطرے سے اس کی قیمت ادا کی، انھوں نے اپنی جان پہلے ہی سے بیچ رکھی تھی، ان کے اور خدا کے درمیان معاملہ طے ہو چکا تھا، دستاویز لکھی جا چکی تھی، گواہوں کی گواہیاں بھی ثبت ہو چکی تھیں، ان کے شیدائیوں، ان کے ادب کے قدردانوں کو، اور ان کی تحریروں اور افکار و نظریات میں زندگی گزارنے والوں کو اس کی اطلاع بہت بعد میں ہوئی، اس طرح وہ معرکہ ختم ہوا جس سے ان کا دل گھبرا رہا تھا، اس معرکے میں شک کے مقابلے میں یقین کو، تردّد وضعفِ ایمان کے مقابلے میں سکون واطمینان کو، اور ارادہ کی کمزوری کے مقابلے میں عزم مصمّم کو کامیابی حاصل ہوئی، گرفتاری، اذیتیں اور شہادت وغیرہ اس معرکے کا حتمی نتیجہ اور سچی تصویر تھی، جس میں وہ جیل کی کوٹھری اور پھانسی کے تختے سے پہلے اپنے ذہن ودماغ اور اپنے دل کی گہرائیوں میں برسرِ پیکار تھے۔

مجھے یقین ہے کہ سید قطب کے آثار زندہ رہیں گے، ان کی طرف لوگوں کی توجہ، ان کی کتابوں کے ساتھ لوگوں کے شغف، ان کے علمی وفکری ورثے کو زندہ رکھنے کی خواہش اور ان کے نام اور کارناموں کو زندہ جاوید بنانے کی کوششوں میں اضافہ ہوگا، اور میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کے لیے جس "حیات" کی خوشخبری دی ہے، اس میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں، قرآن کی آیت "بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" میں لفظ "احیاء" کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے، جتنا عام مفسرین نے سمجھا اور لکھا ہے، میرے خیال میں شہید کے چھوڑے ہوئے آثار کی بقا اور ان کی شہرت واشاعت، اس کے نام اور اور کارناموں سے لوگوں کو شغف، اس تذکرے اور حالات میں لوگوں کی دلچسپی، معاصرین کا اعتراف اور آئندہ آنے والوں میں ذکرِ خیر بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے، یہ لوگ موت کو گلے لگاتے ہیں اور اللہ زندگی ان کے لیے مقدّر کر دیتا ہے، مخالفین واعداء ان کا نام ونشان مٹانا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی عزّت وشہرت میں اضافے کا فیصلہ کرتا ہے، اور فیصلہ اللہ ہی کا نافذ ہوتا ہے، وہ علیم بھی ہے، قدیر بھی۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

معالی الشیخ محمد صالح قزّ از مرحوم

سابق سکریٹری جنرل رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ مکرّمہ

رابطۂ عالمِ اسلامی کے برقیہ اور سعودی عرب کے اخبارات سے معالی الشیخ محمد صالح قزّ از کی (۶ رفروری ۱۹۸۹ء) وفات کا علم ہوا، جس سے دل ودماغ کو ایک صدمہ ہوا، اور ۳۰-۳۵ سال کی طویل مدّت کے تعلقات کی یاد، مشاہدات وتأثرات، ان کی منفرد دینی خدمات، اوران کی خصوصیات وفضائل، اورتوفیقِ الٰہی اور سعادتوں کی یاد تازہ ہوگئی، جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خصوصی طور پر نوازا تھا، اور جن سے برصغیر ہندوپاک کا کیا ذکر، ارض پاک میں بھی، جہاں ان کی عمر گزری، لوگ عام طور پر واقف نہیں، ان کے خلوص وشفقت اوران کی بے لوث ملّی خدمات کا حق سمجھ کر، اوران کی زندگی کے بعض امتیازی پہلوؤں اور کارناموں سے قارئین کو واقف کرانے کی غرض سے یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں۔

ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ (ستمبر ۱۹۵۰ء) کو مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی ہمرکابی میں حجاز کی حاضری اور حج کی سعادت دوسری بار نصیب ہوئی، اور تقریباً چار ساڑھے چار مہینے مکہ معظمہ میں قیام رہا، اس زمانۂ قیام میں مکّہ معظّمہ کے ممتاز علماء، حرم شریف کے اساتذہ ومدرسین اور مکہ معظمہ کی سربرآوردہ شخصیتوں سے تعارف کا موقع ملا، اوران سے دینی وعلمی روابط پیدا ہوئے، میرا اپنے عزیز رفقاء کے ساتھ (جو کئی مہینے پہلے سے دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں مقیم تھے) بھوپال کی رباط واقع محلّہ شامیہ میں قیام تھا، ان کے ذریعے سے راقم کے دعوتی عربی رسائل جو اس وقت تک چھپے تھے، اہل علم اور اہلِ فکر حضرات تک پہنچ چکے تھے، حج سے فراغت کے بعد جب میرا طویل قیام رہا تو ان

www.abulhasanalinadwi.org

علماء واعیان کے یہاں ہم لوگوں کی آمد ورفت اور ان حضرات کی رباط میں تشریف آوری کا سلسلہ شروع ہوا، جو ان کی مسافر نوازی، عالی ظرفی، اور عربی اسلامی اخلاق کا نمونہ تھا۔

انھیں کرم گستروں اور عزّت بخشنے والوں میں شیخ محمد صالح قزّاز بھی تھے جو مکّہ معظّمہ کے دیندار اور صاحب علم اعیان ورؤساء میں شمار ہوتے تھے، اور اسم با مسمّٰی تھے، ان کا مکان حرم شریف سے متصل باب الباسطیہ پر تھا، بالعموم جو عرب علماء اور دینی دعوت اور دینی فکر سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اپنی ملاقات کا شرف بخشتے، یا ان کی خدمت میں حاضر اور ملاقات کا اتفاق ہوتا، وہ امتیازی عربی اخلاق اور روایت کے مطابق ضیافت کا بھی شرف بخشتے، ہم مسافروں کی ادنیٰ تحریک ودعوت پر بلا تکلف رباط تشریف لے آتے اور دعوت قبول کرتے، پھر اپنے یہاں یاد فرماتے اور دعوت وضیافت سے نوازتے۔

لیکن اس ضیافت ومہمان نوازی کا جو طریقہ شیخ صالح قزّاز صاحب نے اختیار کیا وہ بالکل انوکھا تھا، اور ان کی ذہانت، دینی ذہن اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کا (جس میں وہ امتیاز خاص رکھتے تھے) نمونہ، انھوں نے ایک دن فرمایا کہ آپ نے غارِ ثور کی بھی زیارت کی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا، اس لیے کہ غارِ حراء کی متعدد بار زیارت کرنے کے باوجود غارِ ثور کی زیارت کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ وہ مکّہ معظّمہ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ اہتمامِ خاص اور رہبر اور ذرائع حمل ونقل کے بغیر وہاں جانا اور پہاڑ پر چڑھنا ہر ایک کے لیے بالخصوص ایک غیر ملکی کے لیے بہت مشکل تھا، یہ مبارک اور بلند طالع غار وہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کی رفاقت میں قیام کا شرف بخشا، اس شرف کی وجہ سے حضرت ابو بکرؓ کو قرآن شریف میں "ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ" کا وصف ولقب حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے "یارِ غار" اردو میں مخلصانہ رفاقت اور محبت وصحبت کی طوالت کے لیے ایک محاورہ اور ادبی تعبیر بن گئی، اس غار تک پہنچنا بھی (جس کے لیے دو پہاڑوں کی چڑھائی ضروری ہے) جواں ہمت، جواں عمر اور شوق وعقیدت کا طالب ہے۔

شیخ صالح نے کہا میں اس کا انتظام کروں گا، آپ حضرات تیار رہیں، ہم لوگوں نے بڑے تشکر و امتنان کے ساتھ یہ دعوت قبول کی، انھوں نے سواریوں اور رہبروں کا انتظام کیا اور خود بھی شریکِ قافلہ ہوئے، ہم لوگوں کے ذہن میں صرف اتنا ہی تھا کہ شیخ کی معیّت و رہبری میں اور ان کے مہیّا کیے ہوئے وسائل اور انتظامات کی سہولت کے ساتھ زیارت کا شرف حاصل کریں گے۔

اگلے دن صبح کو موٹروں پر یہ قافلہ غارِ ثور کے لیے روانہ ہوا، جو مکّہ مدینہ کے راستے میں مکّہ معظّمہ سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ندوی فضلاء کی اس جماعت کے ساتھ جو رباط بھوپال میں مقیم تھی تبلیغی جماعت کے متعدد احباب بھی تھے، پہاڑ پر چڑھنا شروع ہوا تو تھوڑے تھوڑے فاصلہ کے بعد شیخ کے خدّام مالٹا اور موسم کے پھلوں سے ضیافت کرتے، ہم لوگ غارِ ثور تک پہنچے، اس میں اترے اور کچھ دیر وہاں وقت گزارا، پھر واپسی کا سفر شروع ہوا، نیچے اترتے اترتے ہم سب لوگ خاصے تھک چکے تھے، ظہر کا وقت بھی ہو چکا تھا، نیچے پہنچے تو دیکھا کہ دسترخوان بچھا ہوا ہے اور شیخ کی طرف سے پُر تکلّف ضیافت کا انتظام ہے، اس وقت اندازہ ہوا کہ شیخ نے ضیافتِ روحانی اور ضیافت جسمانی کو اپنے دینی ذوق اور ذہانت سے جمع فرمایا ہے، اور یہ ایسی ضیافت تھی جس کا بدل کوئی دوسری ضیافت نہیں ہو سکتی تھی، ہم لوگوں نے ان کے اس حسنِ انتخاب اور جدّت و ذہانت کی داد دی اور اس سے ہمارے ان کے تعلقات میں مزید استحکام و خلوص پیدا ہوا۔

راقم کا تیسرا سفرِ حجاز دس برس کے فصل سے مئی ۱۹۶۲ء میں ہوا، یہ سفر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ — جس کا قیام اسی زمانے میں عمل میں آیا تھا — کی مجلس استشاری (Judiciary Committee) کی رکنیت کی بنا پر ہوا تھا، جس کی دعوت اور انتظام، حکومت سعودیہ کی طرف سے کیا گیا تھا، میں اپنے چند رفقاء کے ساتھ مکّہ معظّمہ کے مشہور ہوٹل "لوکاندہ مصر" میں ٹھہرا ہوا تھا، ایک دن ایک شخص تلاش کرتا ہوا آیا، اس نے شیخ محمد صالح قزّاز کا خط دیا جس میں یہ لکھا تھا کہ ذی الحجہ کی ۱۴ر تاریخ کو ایک اسلامی مؤتمر ہوگی، قصر ملکی میں اس کا جلسہ ہے، جس

میں ملک سعود خود شریک ہوں گے، آپ سے شرکت کی استدعا ہے، مقررہ تاریخوں پر جلسہ ہوا، جس میں ملک ادریس سنوسی (فرمانروائے لیبیا) اور ممالک عربیہ و عالم اسلامی کی بہت سی اہم شخصیتیں شریک ہوئیں، وہیں "رابطۃ العالم الاسلامی" کے نام سے ایک عالمی تنظیم کا قیام عمل میں آیا، اور بنیادی ارکان کا انتخاب ہوا جن میں یہ خاکسار بھی تھا، حکومت سعودیہ کے سابق وزیر مالیات اور حجاز کی ایک ممتاز شخصیت شیخ محمد سرور الصّبان، جو حکومت کے سیاسی مشیر، ادبی و علمی ذوق کے جامع، اور حجازی حلقے میں مقبول و محترم ہونے کی وجہ سے خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے، رابطہ کے امین عام (سکریٹری جنرل) منتخب ہوئے، شیخ محمد صالح قزّاز قدیم زمانے سے ان کے بڑے معتمد اور معاون و شریک کار تھے، وہ رابطہ کے دفتر (سکریٹریٹ) اور انتظامات میں اُن کے دست راست رہے، اب حجاز کے سفر کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو تقریبیں اور بہانے پیدا کردیئے، ایک جامعہ اسلامیہ کی مجلس منتظمہ میں شرکت، دوسرے رابطۂ عالمِ اسلامی کی رکنیت اور اس کے سالانہ اجتماعات اور کمیٹیوں میں حاضری، اس طرح شیخ محمد صالح قزّاز سے ملاقاتوں کا موقع بار بار ملنے لگا اور ان کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے، ایسے ہی کسی ایک سفر میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ حکومت توسیع حرم کے منصوبے اور کام کی نگرانی اور ذمہ داری میرے سپرد کرنا چاہتی ہے، تمھاری کیا رائے ہے؟ یہ جہاں ان کے اعتماد و اعزاز کا ایک نشان تھا کہ ایسے اہم معاملے میں انھوں نے اپنے اس نیاز مند سے مشورہ لیا، وہاں میرے لیے بھی ایک سعادت اور خوش بختی کی بات تھی کہ میں اس عظیم سعادت و توفیق میں جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آسکتی، اور اس پر بڑے بڑے باتوفیق اور خوش نصیب انسانوں کو رشک آنا چاہیے، میں بھی کسی درجہ میں شریک ہوں، میں نے اس کی پُر زور تائید کی اور کہا کہ آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں، اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہوسکتی ہے! انھوں نے رضامندی دے دی اور توسیع حرم کا سارا کام اُن کی نگرانی میں عمل میں آیا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

www.abulhasanalinadwi.org

خدا کا ان پر فضل خاص تھا کہ مسجد نبوی کی توسیع کا کام بھی انھیں کے سپرد ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دونوں شرف عطا فرمائے۔ ع

''صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم''

معالی الشیخ محمد سرور صبان نے ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۳ء) سے اپنی وفات کے دن تک جو ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) میں ہوئی آٹھ سال تک امین عام (سکریٹری جنرل) کے فرائض بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیئے، جس میں اُن کے معتمد خاص شیخ محمد صالح قزاز کے سرگرم تعاون اور صائب مشوروں کا بھی حصّہ تھا، شیخ محمد سرور نے ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ میں انتقال کیا اور شیخ محمد صالح قزاز انتخاب اور اکثریت کی تائید سے اُن کی جگہ پر امینِ عام منتخب ہوئے، انھوں نے اپنی مخلصانہ جدّ وجہد اور دن رات کی سرگرمی سے رابطہ کا عالمی پیمانے پر تعارف کرایا اور اس کے دائرۂ اثر کو بہت وسیع کر دیا، ۱۹۷۳ء کے وسط میں انھوں نے سارے اہم مسلم وعرب ممالک اور مغربی دنیا میں رابطہ کی طرف سے وفود کے بھیجنے کا پروگرام بنایا، جن میں رابطہ کے ممتاز اراکین، نامور علماء اور اہلِ فکر شامل ہوں، وہ ان ممالک میں مسلمانوں کے حالات ومسائل اور ان کی ضروریات کا علم حاصل کریں، وہاں کے اداروں اور تحریکات کے بارے میں معلومات مہیا کریں، رابطہ کا تعارف کرائیں، اور واپس آکر رابطہ کو رپورٹ پیش کریں اور نشاندہی کریں کہ رابطہ ان کی کیا اور کس طرح مدد کر سکتا ہے، اور اس پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، انھوں نے کسی ایک وفد میں شرکت کے لیے مجھ سے بھی خواہش ظاہر کی اور ان ممالک کی طویل فہرست میرے سامنے رکھی جو ان وفود کے پروگرام میں شامل تھے، ان میں مغربی ممالک بھی تھے اور مشرقی اسلامی ممالک بھی، میں نے لسانی مناسبت اور سابقہ علمی واقفیت کی بنا پر اپنے لیے اس وفد کا انتخاب کیا جس کو افغانستان، ایران، شرق اردن، لبنان، شام اور عراق، چھ ملکوں کا دورہ کرنا تھا، انھوں نے اس وفد کی قیادت کے لیے (بر بنائے محبت واعتماد) مجھ حقیر ہی کا انتخاب کیا، اس وفد میں مکّہ معظمہ کے مشہور صاحبِ قلم اور اسلامی مباحث پر لکھنے والے ادیب وکاتب استاذ احمد محمد

جمال، لبنان کے ممتاز عالم شیخ سعدی یٰسین، سری لنکا کے وزیر مملکت اور رابطہ کے رکن حنیفہ محمد حنیفہ ارکانِ وفد میں شامل تھے، لیکن بعض قانونی مشکلات اور ذاتی مجبوریوں کی بنا پر صرف استاد احمد محمد جمال، اور بحیثیت سکریٹری وفد کے ہمارے رفیق عزیز ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی (جو اس وقت رابطہ میں ایک شعبے کے ذمہ دار اور سکریٹری تھے) ہم سفر ہو سکے، شیخ صالح قزاز نے میری سہولت کے لیے مولوی عبداللہ عباس صاحب کو ہندوستان بھیج دیا، تا کہ وہ میرے لیے سفر کی سہولتیں مہیا کریں اور اس کے انتظامی و قانونی مراحل کی تکمیل کریں۔

یہ سفر ۴ر جون ۱۹۷۳ء اور ۲۰ر اگست ۱۹۷۳ء کے درمیان ہوا، اس سفر کی پوری روئداد میرے عربی سفر نامہ "من نهر كابل الى نهر اليرموك" اور اس کے اردو ترجمے "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" میں آ چکی ہے، اس سے کسی قدر ان وفود اور سفروں کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اور یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس سے اسلامی تعارف، ان ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے حالات و مسائل سے واقفیت، ان کی حوصلہ افزائی اور ان کو مفید مشورہ دینے، پھر عالمِ اسلامی کے سب سے بڑے با وسائل بین الاقوامی ادارہ "رابطة العالم الاسلامی" اور اس کے ذریعے اس کی سر پرست مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والی حکومت سعودیہ کو واقف کرانے میں کیا فوائد مضمر تھے، راقم نے سفر کے بعد مدینہ طیبہ میں بیٹھ کر اس سفر کی ایک مفصل رپورٹ رابطہ کو پیش کی، جس میں ان ممالک کی صحیح صورت حال سے آگاہ کیا گیا تھا، اور ان کی ضروریات و توقعات اور ان کی مدد کرنے کے ذرائع اور طریق کار کی نشاندہی کی گئی تھی، امید ہے کہ یہ روئدادیں اور معلومات فائدہ اور نتیجہ سے خالی نہ رہی ہوں گی۔

۳۱ر اکتوبر تا ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی لکھنؤ میں منعقد ہوا، جو ہندوستان کی اسلامی ملّی طویل تاریخ میں ایک نقش تابندہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس میں کم سے کم عالمِ عربی کے اتنے کثیر التعداد اور سر برآوردہ نمائندے شریک ہوئے جس کی مثال ہندوستان میں ہونے والے کسی بین الاقوامی اجتماع میں اس سے پہلے

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں ملتی (۱)۔ ۱۹۷۳ء میں میں نے بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء کے اس اجلاس کی سب سے پہلی دعوت شیخ محمد صالح قزّاز ہی کی خدمت میں پیش کی تھی، انھوں نے دعوت قبول کی اور وعدہ کیا کہ رابطہ کا ایک وفد اس کے لیے بھیجا جائے گا، یہ گفتگو حرم شریف سے متصل دفتر تعمیرات میں ہوئی، جہاں طواف وسعی کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں، اس اجلاس کی غیر معمولی کامیابی میں اس مبارک آغاز کو بھی خاص دخل تھا، جو اس متبرک مقام میں عمل میں آیا "وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ" شیخ خود تو اس اجلاس میں بعض مجبوریوں کی بنا پر شرکت نہیں کر سکے، لیکن رابطہ کے ایک موقر وفد نے شرکت کا شرف بخشا۔

۱۱/۱۲/۱۳/ مئی ۱۹۷۶ء کی تاریخوں میں رباط، مراکش میں رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (Islamic Universities Fedration) کا جس کا میں شروع سے رکن تھا، جلسہ ہونا طے پایا، سکریٹریٹ نے مجھے اس کا دعوت نامہ ہندوستان بھیجا، لیکن میں اس وقت حجاز مقدس میں تھا، شیخ محمد صالح قزّاز کے پاس بھی اس کا دعوت نامہ آیا تھا، وہ اپنی ایک دوسری مصروفیت کی بنا پر اس کی شرکت سے معذور تھے، انھوں نے مجھے اپنے بجائے اس کانفرنس میں رابطہ کا نمائندہ منتخب کیا، میں اس وقت مدینہ طیبہ میں تھا، مجھے ان کا پیغام پہنچا کہ ہم نے تمھارے اور تمھارے رفیقِ سفر مولوی محمد رابع ندوی کے سفر کے سب انتظامات مکمل کر دیئے ہیں، تم مکہ معظمہ آجاؤ اور سفر کے لیے تیار رہو (۲)۔

میں نے ۱۹۶۴ء میں بمبئی میں آنکھ کا "کٹر یکٹ" کا آپریشن کرایا تھا، جو کامیاب نہیں ہوا، مجھے ضعف بصارت کی سخت تکلیف تھی، جس کی وجہ سے براہِ راست پڑھنے لکھنے سے (بالخصوص لکھنے سے معذوری تھی) شیخ محمد صالح قزّاز کو اس کا بڑا افسوس تھا، اور وہ بار بار

---

(۱) اجلاس میں ممالک عربیہ کے فاضل نمائندوں کی تعداد چھپن تھی، ممالک عربیہ کے علاوہ یوگنڈا، روس، ایران، تھائی لینڈ، نیپال، مشرقی افریقہ اور بنگلہ دیش کے نمائندے بھی تھے، اجلاس عام کی صدارت عالم اسلام کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز اور دانشگاہ جامعہ ازہر کے شیخ ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے کی، جو اپنی صوری و معنوی دینداری اور علم میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔

(۲) سفر کی تفصیل "کاروانِ زندگی" باب دہم ص ۲۳۲-ص ۲۳۸ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مجھے یورپ جانے اور ماہرین فن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے، اس سلسلے میں سب سے زیادہ ان کو اور زعیم قضیہ فلسطین اور مشہور قائد و مجاہد الحاج سید امین الحسینی مفتی فلسطین کو دلچسپی تھی، اور وہ بار بار تاکید کرتے، اس سفر سے واپسی میں اسی ضرورت کے لیے لندن اترنا ہوا، اور وہاں کے ایک ماہرِ امراضِ چشم سے مشورہ کیا گیا، جو اگرچہ نتیجہ خیز نہیں ہوا، لیکن اسی کے نتیجے میں بالآخر ۱۹۷۱ء میں امریکہ جاکر دوسری آنکھ کا آپریشن کرایا، جو الحمدللہ کامیاب اور نتیجہ خیز رہا اور راقم براہ راست لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گیا، اس میں ان دونوں مخلص اور دردمند بزرگوں کی ہمدردی اور فکر مندی کو بھی دخل تھا۔

شیخ محمد صالح قزاز کی سکریٹریٹ کے دور ہی میں منظمات اسلامیہ کا اجلاس عام مکہ معظمہ ۱۳۹۴ھ کو اور اس کے بعد "احیاء رسالة المسجد" کے نام سے مساجد کے پیغام اور افادیت کو زندہ اور وسیع کرنے کے لیے رمضان ۱۳۹۵ھ میں ایک عالمی مؤتمر منعقد ہوئی جس میں دنیا کے مختلف ممالک کی مساجد اور اسلامی انجمنوں کے نمائندے شریک ہوئے اور اسی سے "المجلس الأعلى العالمي للمساجد" کا وجود عمل میں آیا جو ابھی تک کام کر رہی ہے، اور اس کے ذریعے سے مساجد کو تقویت اور نئی سرگرمی اور حرکت حاصل ہوئی، انھی کے زمانے میں رابطہ کی نئی عمارت منیٰ میں تعمیر ہوئی، جہاں رابطہ کے جلسے ہوتے تھے، اور عالمِ اسلام کے اور حکومت کے ممتاز ترین مہمان ایامِ حج میں قیام کرتے ہیں۔

شیخ محمد صالح کی وفات پر جو تعزیتی مضامین حجاز کے پرچوں میں نکلے ہیں، ان میں سے ایک مضمون سے جو عزیز گرامی محمد محمود الحافظ ندوی کا لکھا ہوا ہے (جو عرصے سے رابطہ کے ایک اہم شعبہ کے ذمہ دار ہیں، اور رابطہ ہی کے ترجمان "اخبار العالم الاسلامی" کی قریبی اشاعت میں شائع ہوا ہے) معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے اس طویل منصب ذمہ داری کے عہد میں خالصۃً رضا کارانہ کام کیا اور اس اہم عہدہ کی (جو وزارت کے برابر سمجھا جاتا ہے) کوئی تنخواہ نہیں لی، یہاں تک کہ رابطہ کے سلسلے میں وہ جو سفر کرتے تھے، اور رابطہ کے اہم مہمانوں اور مختلف ممالک کی اہم شخصیتوں اور وہاں کی حکومتوں کے ذمہ داروں کی رابطہ کی

www.abulhasanalinadwi.org

طرف سے دعوت ہوتی تھی، اس کے مصارف بھی وہ اپنی جیب خاص سے برداشت کرتے تھے، یہ بات میرے اور دوسرے ارکان رابطہ کے لیے بھی (جو سالہا سال سے رابطہ کے رکن ہیں، اور ان سے قریبی تعلق رکھتے تھے) ایک انکشاف اور ملّی و اسلامی تنظیمات اور تحریکوں میں کام کرنے والوں کے لیے ایک درخشاں مثال اور قابل تقلید نمونہ ہے۔

توسیع حرم مکی و مسجد نبوی کی جو ان کی نگرانی اور ذمہ داری میں عمل میں آئی قابلِ صد رشک سعادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری سعادت ان کے لیے مقدر فرمائی کہ "تحفیظ القرآن" کی مجلس اور تنظیم کی ذمہ داری ان کے حصے میں آئی، اور انھوں نے اس کو بڑے ذوق وانہماک اور مشغولیت و سرگرمی کے ساتھ انجام دیا، واقفینِ حال جانتے ہیں کہ جدید تعلیم و معاشرتی وتہذیبی تغیر اور "اقتصادیات" کے دباؤ سے خود جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس میں جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا، حفظِ قرآن اور تجوید کے ساتھ وہ اعتنا اور اہتمام باقی نہیں رہا تھا، جو اس سے پہلے تھا، اور جس میں بلاد عربیہ اور بالخصوص حجاز مقدس کو استادی اور سند کا درجہ حاصل تھا، پاکستان کے ایک باتوفیق و خوش نصیب تاجر الحاج یوسف سیٹھی صاحب مرحوم نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اپنے مصارف سے جا بجا حجاز میں، اور افریقہ کے دور دراز ممالک میں "تحفیظ القرآن" کے مدارس اور حلقے قائم کیے اور وہاں کے لوگوں کو تعاون واشتراک عمل کی طرف توجہ دلائی، اس کے نتیجہ میں خود حکومت سعودیہ، اور حجاز و نجد کے مخیر تجار اور اہلِ توفیق نے اس کی طرف توجہ کی اور مکہ معظمہ میں حرم شریف ہی کی ایک بالائی منزل میں اس کا مرکزی ادارہ قائم ہوا، رابطہ سے سبکدوشی کے بعد شیخ قزاز نے نہ صرف اس کی ذمہ داری قبول کی بلکہ اپنی زندگی اور اوقات اس کے لیے وقف کر دیے، راقم بھی جب کبھی ان سے ملنے گیا تو حرم شریف کی اسی بالائی منزل میں ان سے ایسے حال میں ملاقات ہوئی کہ کمسن اور نوجوان عرب اور شریف گھرانوں کے فرزند، قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں، اور اس کی مشق و تلاوت میں مصروف ہیں، اور شیخ ہمہ تن متوجہ اور سراپا انہماک، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس عرصے میں کتنے سو کی تعداد میں حفاظ و قراء تیار ہو گئے اور "بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا" (ہماری ہی دولت ہم کو ملی) کا تحقق ہوا، اور اس کا منظر دیکھنے میں آیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ ان چند آخری برسوں میں اپنے ضعف وپیری اور بعض تجربات کی بنا پر بالکل خانہ نشین اور عزلت گزیں ہو گئے تھے، اور بہت مخصوص احباب واعزہ کے علاوہ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے، گویا وہ سفر آخرت کی تیاری میں تھے، اور ان کا سارا وقت عبادت وتلاوت اور ضروری سکون وراحت میں گزرتا ہوگا۔ میں نے کئی مرتبہ حرم کی حاضری کے موقع پر ان کی خدمت میں حاضری دینے اور شرفِ زیارت وسلام کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا ظاہر کی، لیکن دوستوں اور واقفین حال نے کہا کہ وہ بالکل یکسو اور گوشہ نشین ہیں، خوش بختی سے نومبر ۱۹۸۸ء میں جب رابطہ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو میں نے اپنے عزیز میزبان ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی سے باصرار کہا کہ وہ ٹیلیفون پر شیخ کو میری اس خواہش وتمنا کی خبر پہنچادیں، پھر جو کچھ بھی جواب ملے، شیخ کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے بخوشی آنے کی اجازت دی اور خیر مقدم کیا، ۱۵ ریا ۱۶ نومبر کو میں مولوی عبداللہ عباس ندوی اور عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ سراپا انتظار تھے، بڑی بشاشت اور انشراح سے ملے، ان کی سماعت یا حافظہ پر کوئی اثر نہیں تھا، فرمایا کہ میں تو کئی مرتبہ تم کو خواب میں دیکھ چکا ہوں، مجھے اپنی اس دیر حاضری اور محرومی پر افسوس ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اس کے لیے پوری کوشش اور اصرار کیوں نہیں کیا، خدا کا شکر ہے کہ میں اس حسرت وندامت سے بچ گیا کہ سالہا سال سے ان کی زیارت نہیں ہوئی تھی، اور انھوں نے سفر آخرت اختیار کرلیا، خدانخواستہ اگر ایسا ہوتا تو یہ حسرت رہ جاتی اور فارسی کے شاعر کے بقول ع

"یک حرف کاشکیست کہ صد جا نوشتہ ایم"

کا معاملہ ہوتا۔

اللہ تعالیٰ جانے والوں پر ہزار رحمتیں نازل فرمائے اور حرمین، قرآن شریف اور دین وملت کی خدمت کرنے والے کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ نصیب فرمائے جو ان منفرد وممتاز خدمات اور اس کی رحمت بے پایاں کے شایانِ شان ہو۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ محمد علی الحرکان

خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے یہ المناک اطلاع ملی کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے تیسرے جنرل سکریٹری شیخ محمد علی الحرکان کا انتقال ہو گیا۔ رابطہ عالم اسلامی عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے مسائل ومشکلات سے دلچسپی رکھنے اور ان کے ساتھ فراخ دلانہ تعاون کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تنظیم ہے، اور شیخ حرکان مرحوم پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت وتعاون میں سرگرم حصہ لینے اور اہم خدمات سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد جمعہ ۵ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

شیخ حرکان کی وفات اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے میدان میں ایک اہم حادثہ ہے، اطراف واکنافِ عالم میں وسیع رابطہ عالم اسلامی کی، اور خاص طور سے رابطے کے تحت قائم عالمی تنظیمِ مساجد کی سرگرمیوں اور خدمات کے روح رواں تھے، مساجد کی اس تنظیم کے ذریعے رابطہ نے روئے زمین پر پھیلی ہوئی امداد وتعاون کی ضرورت مند لاتعداد مساجد کی امداد کے لیے اپنے وسیع وسائل کو وقف کر رکھا تھا، دنیا کے جو علاقے اسلامی حکومت کے سایے سے محروم ہیں، رابطہ نے ان کا خاص خیال رکھا اور فراخ دلانہ مدد کی، اس مقصد کے لیے رابطہ نے دنیا کے مختلف علاقوں میں علاقائی تنظیمیں بھی قائم کیں جن کے ذریعے مساجد اور ان کے پیغام کی خدمت کی جاتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے حالات وضروریات پر نظر رکھی جاتی ہے، اسی طرح شیخ حرکان مرحوم کے دور میں رابطہ کی آواز میں مزید طاقت وقوت پیدا ہوئی، اس کی نمائندگی مؤثر ہوئی اور جب بھی اور جہاں بھی مسلمانوں کو کچھ مسائل پیش آئے اور ضرورت ہوئی رابطہ نے آواز بلند کی اور عالمی پیمانے پر اس کی آواز کی قوت واثر کو محسوس کیا گیا۔

شیخ حرکان کے دور میں رابطہ کے ذریعے انجام پانے والی خدمات سے یہ چند تھیں،

www.abulhasanalinadwi.org

ہماری دعا ہے کہ اللہ ان کی مساعی کو قبول فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر کرے اور رابطہ عالم اسلامی کو ان کا مناسب اور اہل قائم مقام عطا فرمائے، جو اس اہم عالمی اسلامی تنظیم کی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دے سکے، جیسے کہ اللہ نے شیخ حرکان کو شیخ محمد صالح قزاز کا جانشین بنایا تھا، انھوں نے بھی رابطہ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے، اس کا دائرۂ کار وسیع کرنے اور اس کی شہرت واہمیت میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی تھیں۔

مجھے ان دونوں حضرات کی رفاقت ودوستی کا شرف حاصل رہا ہے، شیخ حرکان سے پہلی مرتبہ ۱۳۶۶ھ میں متعارف ہوا جب مجھے پہلی بار حج وزیارت کی سعادت حاصل ہوئی، اس وقت وہ مسجد نبوی میں حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، اس موقع پر بارہا ملاقاتیں ہوئیں اور تعلقات مستحکم ہوگئے، پھر شیخ حرکان جدہ میں جج مقرر کیے گئے اور دوسری بار مجھے حج کا موقع ملا تو ان سے ملاقاتیں رہیں، رابطہ عالم اسلامی قائم ہوا تو انھیں بھی اس کا ممبر منتخب کیا گیا، میں بھی ممبر تھا اور رابطہ کے اجلاسوں میں ملاقاتیں بھی ہوتیں اور تبادلۂ خیال بھی ہوتا، پھر وہ سعودی حکومت میں وزیر عدل بنادیے گئے اور آخر میں شیخ محمد صالح قزاز نے خرابی صحت کی بنا پر رابطہ کے جنرل سکریٹری کے منصب سے استعفا دیا تو انھیں رابطہ کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ شیخ حرکان ایک ماہر اور وسیع النظر عالم دین بھی تھے، جدہ میں جج کی ذمہ داریوں نے علوم شریعت اور فقہ میں وسعت نظر، عمق اور عملی تجربے کے مواقع فراہم کیے، رابطہ میں زیر غور مسائل پر بحث ومباحثے میں ان کی وسعت نظر اور دقیقہ رسی کا اندازہ ہوتا تھا، وزارت عدل اور رابطہ کے جنرل سکریٹری کی مشغولیات نے انھیں تصنیف وتالیف کا موقع نہیں دیا، اگر یہ مشاغل نہ ہوتے تو ان کی وقیع علمی تصنیفات اور تحقیقی مضامین بھی سامنے آتے، شیخ حرکان کا انتقال صرف ایک ایسے شخص کا انتقال نہیں جس نے ایک بڑا انتظامی منصب اور ایک اہم اسلامی ادارہ سنبھال رکھا تھا، بلکہ اس کے ساتھ ہی ہم ایک ماہر عالم دین اور ایک قابل احترام ہستی سے محروم ہوگئے ہیں، میں اس حادثے پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہوں اور ان کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر کی دعا کرتا ہوں۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاریؒ

۱۵؍اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اچانک یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ نہ صرف قطر اور نہ صرف بلادِ عربیہ بلکہ عالم اسلامی اور عہدِ حاضر کے ایک راسخ العلم عالم، خادمِ دین، اسلاف کی علمی یادگاروں اور مفید اور بیش قیمت تصانیف کی ایک بڑی تعداد کو (جو ابھی تک مخطوطہ اور قلمی شکل میں اہلِ علم کے دسترس سے باہر تھی) طبع کرا کے ان کو اہلِ علم اور تحقیقی کام کرنے والوں تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دینے والے حکومت قطر کے ریاست امورِ دینیہ اور شعبہ ''احیاء التراث الاسلامی'' کے صدر و روحِ رواں شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری نے لندن میں جہاں وہ بغرضِ علاج تشریف لے گئے تھے، وفات پائی، ان کی نعش قطر لائی گئی، اور سپردِ خاک کی گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

بہت کم لوگوں کو اور خاص طور پر برصغیر ہند و پاک میں اہلِ علم و واقفیت کو بھی اس کا علم ہوگا کہ مرحوم کن خوبیوں اور خصوصیات کے حامل تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان سے خدمتِ علم و دین، علمی خزانوں کی نشر و اشاعت اور دینی اداروں اور کوششوں کی اعانت اور حوصلہ افزائی کا کتنا مفید و عظیم کام لیا۔

راقم سطور کے تعارف و ربط و تعلق کی مدت بیس سال سے متجاوز ہو رہی ہے، اور اس کو مرحوم کو اُن کے شہر اور جائے قیام پر مجالس و اجتماعات اور سفر و حضر میں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور وہ ان کی دینداری، استقامت، علم و دین دونوں میں درجۂ رسوخ پر فائز ہونے، خلوص، سادگی، تواضع و اخلاق اور تعاون علی البر والتقوی کے جذبے سے اتنا متاثر ہوا جتنا فضلاء اور اعیانِ عرب میں سے چند خاص شخصیتوں سے متاثر ہوا ہوگا، اور اس میں غالباً ان کے علو

www.abulhasanalinadwi.org

خاندانی اور قبیلۂ انصار سے اس نسبت گرامی کو بھی دخل تھا، جس کی رِقّتِ قلبی، لینت و تواضع، ایمان و تفقہ فی الدین کی شہادت صادق و مصدوق کی زبان وحی ترجمان نے دی ہے، جس پر دنیا کے بڑے سے بڑے عالی نسب اور عالی نسبت اشخاص کو بھی رشک آجائے گا۔

اس کے علاوہ حضرات انصار کے بارے میں جو شہادتیں، دعائیں اور ہدایات و وصیتیں حدیث و سیرت میں منقول ہیں، وہ اہلِ علم کی نظر میں ہیں، شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری مرحوم کا خاندان ایک عرصے تک ایران میں رہا، پھر حجاز منتقل ہوا، ان کے متعدد اعزہ اور اہلِ خاندان مدینہ طیبہ میں سکونت رکھتے ہیں، اور راقم ان سے ملتا رہا ہے، ان سب میں صحت اعتقاد و علوِ اخلاق اور دینداری دیکھی۔

شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری مرحوم مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ کے فضلاء میں سے تھے، جو مشہور عالم ربانی اور مجاہدِ اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مصنف ''اظہار الحق'' کا قائم کیا ہوا ہے، اس لیے وہ ہندوستان کے اہلِ علم اور وہاں کی ملّتِ اسلامیہ سے خصوصی ربط اور واقفیت رکھتے تھے، جب وہ حج و زیارت کے لیے آتے تو مدرسہ کے قدیم ناظم مولانا سلیم رحمت اللہ صاحب کیرانوی مرحوم اور ان کے بعد ان کے فرزند گرامی مولانا محمد شمیم صاحب ان کا استقبال اور ان کی ضیافت کرتے، راقم کو بھی متعدد بار ایسے مبارک موقعوں پر شرکت و یکجائی کا موقع ملا، پہلی ملاقات و تعارف تو کویت کے اس سفر میں ہوا جو جنوری ۱۹۶۲ء میں پیش آیا تھا، اور جس میں واپسی میں ایک دو روز دوحہ میں قیام کیا گیا تھا (جو قطر کا دارالحکومت ہے) اور وہاں کے فضلاء و اعیان سے ملنا ہوا تھا، اور اس مسجد میں جس میں وہ امامت کرتے تھے، ان کی اجازت سے تقریر کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔

لیکن اصل ربط و تعلق قطر کی اس سیرت کانفرنس کے موقع پر ہوا جو مرحوم ہی کی دعوت اور تحریک اور ان کے انتظام و اہتمام میں محرم ۱۴۰۰ھ (نومبر ۱۹۷۹ء) میں دوحہ میں منعقد ہوئی، یہ سیرت کی تیسری عالمی کانفرنس تھی، جو پاکستان و ترکی میں ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۷ء میں ہونے کے بعد حکومت قطر کی دعوت و مصارف پر دوحہ میں ہو رہی تھی، اگرچہ ضابطہ سے حکومت قطر اس کی

www.abulhasanalinadwi.org

داعی ومیزبان تھی، لیکن اس کے روح رواں شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری مرحوم ہی تھے، اوران ہی کا شغف، کانفرنس کے موضوع ومقصد سے قلبی وایمانی وابستگی اورذات نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) سے قلبی وایمانی ربط وتعلق نے اس میں جان ڈال دی تھی، یہاں پر میں قارئین کی سہولت کے لیے اپنی کتاب ''کاروانِ زندگی'' کا ایک اقتباس پیش کررہا ہوں، جس سے اس کانفرنس کا نقشہ اورتاثر قارئین کے سامنے آجائے گا۔

''مجھے کثیر التعداد کانفرنسوں، ندوات ومجالسِ مذاکرہ (سیمناروں) میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے، لیکن میں نے اس فیاضی، مستعدی اورفراخ دلی کا مظاہرہ اس سے پہلے کسی کانفرنس میں نہیں دیکھا تھا (اورنہ ایسی سکینت وروحانیت اوربرکت ودلآویزی محسوس کی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نورانی شامیانہ پورے جلسہ اورشہر پرمحیط ہے)(۱) شرکاء بھی اپنی کمیت وکیفیت کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے، امریکہ سے لے کرانڈونیشا تک اور مراکش ورباط سے لے کرعراق وخلیج تک کے چوٹی کے عالم، مسلم جماعتوں، تنظیموں کے سربراہ اورجامعات کے فاضل اساتذہ شریک تھے، شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری نے میری کتاب ''السیرۃ النبویۃ'' (جوکچھ ہی عرصہ پہلے مرتب ہوکر دارالشروق جدہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی) کا نیا ایڈیشن صرف کثیر سے شائع کیا تھا، تاکہ وہ کانفرنس کے مندوبین کو کانفرنس کے موضوع کی نسبت سے ہدیہ کی جائے، یہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۴۲۲ صفحات پرآیا اورمجلد شکل میں مندوبین کوپیش کیا گیا۔

ہمارے پہنچنے پر کانفرنس کے سکریٹریٹ کی طرف سے خط ملا کہ عالمِ اسلام سے جو وفود آئے ہیں، ان کے نمائندہ کی حیثیت سے تقریر آپ کو کرنی ہے، آپ مقالہ تیار کرلیں، عرب ممالک کی موتمرات میں صدر کے خطبہ کے بعد سب سے اہم کلمۃ الوفود ہوتا ہے، جس کا کسی مندوب کو دیا جانا اعزاز واعتماد کی نشانی ہے، اگلے دن جمعہ تھا، مضمون لینے کے لیے جب نمائندہ آیا توہم لوگ مسجد جانے کی تیاری کررہے تھے اورمیں کچھ لکھ نہ سکا تھا، اس تحریر کو

---

(۱) بریکٹ کے الفاظ منقول عبارت میں اضافہ ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

چھپنا اور اجلاس میں تقسیم ہونا تھا، جو اگلے ہی دن صبح کو منعقد ہونے والا تھا، میں نے مضمون سے معذرت کی اور کہا کہ خدا کے فضل سے یہاں چوٹی کے علماء وفضلاء موجود ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے، مجھے معاف رکھا جائے، مجھے لکھنے کے لیے وقت نہیں ملا، یکشنبہ ۵/محرم ۱۴۰۰ھ کو جب ہم لوگ جلسہ گاہ پہنچے تو وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور اس میں ترکی ومغربِ اقصیٰ، امریکہ ویورپ سے لے کر جنوبی ومشرقی ممالک تک کی ممتاز شخصیتیں موجود تھیں، جن میں بہت سے چہرے جانے پہچانے تھے، اس نے دیکھا کہ نشستوں پر پروگرام چھپا ہوا رکھا ہے، اس میں کلمۃ الوفود میرے ہی نام ہے، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں برجستہ تقریر کروں اور اللہ جو کہلوائے وہ کہوں، میں تقریر کرنے جب کھڑا ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ دل ودماغ اس دلآویز موضوع کی حلاوت اور جس ذات گرامی سے اس کو نسبت ہے اس کی عظمت ومحبت سے معمور ہی نہیں مخمور ہیں (کیا عجب ہے کہ اس کانفرنس کے حقیقی داعی وروح رواں شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کا اخلاص اور عقیدت بھی اس میں کام کر رہی ہو) مضامین ہی نہیں الفاظ اور جملوں کا ورود ہو رہا ہے، اس وقت اس کی حکمت معلوم ہوئی کہ پہلے یہ تقریر کیوں تیار نہیں ہو سکی، میں نے پہلے پاکستان وترکی کی کانفرنسوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی موزونیت اور ان ملکوں پر بعثت محمدی کے احسانات کا ذکر کیا اور اس انقلاب بلکہ نئی زندگی کا جو ان کو اس کے طفیل میں ملی تھی، یہ ان کی احسان شناسی اور شکر گزاری کا مظاہرہ اور ان احسانات ونعمتوں کا ادنیٰ خراج تھا، جو انھوں نے ادا کیا، اس کے بعد میں نے کہا کہ یہ تیسری کانفرنس موزوں وقت اور موزوں جگہ پر ہو رہی ہے، وقت پندرہویں صدی ہجری کی آمد آمد کا ہے، اور جگہ جزیرۃ العرب، پھر میں نے جزیرۃ العرب اور امت عربیہ کے تعلق سے بعثت محمدی کے اس احسان کا تذکرہ کیا جو دنیا کی سب قوموں اور ملکوں سے بڑھ کر عرب پر ہے، اس موقع پر میں نے علامہ اقبال کا شعر فارسی میں پڑھا کیوں کہ فارسی کے سمجھنے والے بھی موجود تھے، پھر عربی میں اس کا ترجمہ وشرح کی، شعر تھا۔

از دم سیراب آں اُمّی لقب لالہ رست از ریگ صحرائے عرب

www.abulhasanalinadwi.org

''اسی نبی امیؐ لقب کے فیضِ نفس سے صحرائے عرب کے ریگزار سے گل و لالہ لہلہا اٹھے''۔

میں نے جب اس کا تشریحی ترجمہ کیا اور عرب کے حالات پر اس کو منطبق کیا تو بہت سی آنکھوں میں آنسو اور بہت سے چہروں پر مسرت و تأثر کی چمک تھی۔

میری تقریر کے بعد شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری نے تقریر کی اور وہ اجلاس کمیٹیوں کی تشکیل پر ختم ہوا، جنھوں نے اپنی علمی و تحقیقی کام شروع کیے، متعدد ایسے فاضلانہ مقالات پیش ہوئے جو عظیم علمی و تحقیقی قدر و قیمت کے حامل تھے، اور اس طرح یہ کانفرنس اپنے نتائج وافادیت کے لحاظ سے بھی ممتاز رہی، مسلسل پانچ دن کے اجلاس پر یہ کانفرنس بخیر وخوبی ختم ہوگئی، اور مہمان ان قیمتی کتابوں کے ساتھ جو ان کو ہدیہ کی گئی تھیں، پورے اعزاز و راحت کے ساتھ اپنے اپنے وطن واپس ہوئے''۔(۱)

سیرت کانفرنس کا ذکر جو شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری مرحوم کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے، اور وہ اُن کے حسنات کا ایک قابلِ ذکر حصہ تھی، قدرے تفصیل کے ساتھ تیمناً وتبرکاً بھی کیا گیا کہ اس سے ان کی روح کو شادمانی حاصل ہوگی، اور کیا عجب ہے کہ وہی ان کے لیے اجر وثواب اور تقرب کا بڑا ذریعہ بن جائے۔

در خرمنِ کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کی غالباً ندوۃ العلماء اور لکھنؤ میں پہلی تشریف آوری اپریل ۱۹۸۱ء میں ادب عربی کے اس بین الاقوامی سیمنار کے موقع پر ہوئی جس کا موضوع ''عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کے ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش'' تھا، اس میں حصہ لینے کے لیے متعدد عرب ممالک کے ممتاز فضلاء وادباء لکھنؤ آئے، جن میں شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری بھی تھے، اس سیمنار کے انعقاد کے دنوں میں جمعہ کا دن بھی پڑا،

(۱) کاروانِ زندگی حصہ دوم ص ۲۸۷- ص ۲۹۳ باختصار۔

www.abulhasanalinadwi.org

عرب و ہند کے علماء وفضلاء کی بڑی تعداد کی موجودگی میں شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری ہی کو ان کے علمی و دینی مرتبہ اور صلاح کی بنا پر نماز جمعہ پڑھانے کی دعوت دی گئی، اور انھوں نے جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔

۷/۸/ جنوری ۱۹۸۶ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رابطۂ ادب اسلامی کی پہلی کانفرنس ہوئی، اور اسی میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی، اس میں بھی شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری خاص طور سے شریک ہوئے اور تربیتی ادب پر مفید مقالہ بھی پڑھا، ان کی اس دلچسپی اور زحمت فرمائی سے ان کی ذہنی وسعت، ذوق کے تنوع اور حقیقت پسندی کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایک خالص عالم دین ہونے اور حکومت کے ایک معزز منصب پر فائز ہونے کے باوجود ادب کے ایجابی و سلبی، تعمیری و تخریبی اثرات سے واقف تھے، اور ادب اسلامی کے احیاء و اشاعت اور ترویج کے اہم کام میں جو نئی نسل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، تعاون سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری مرحوم کا بڑا کارنامہ جو ان کے لیے عظیم صدقۂ جاریہ کا حکم رکھتا ہے وہ علمائے سلف کی کثیر التعداد قلمی و نادر کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں انجام کو پہنچایا، ان کتابوں کی فہرست بڑی طویل ہے، جو ان کی سرپرستی اور ان کے شعبے کے اہتمام اور حکومت قطر کے مصارف پر شائع ہوئیں، ان کتابوں میں ہم اہلِ ہند اور دین کی دعوت و تبلیغ، اسلام کی صداقت اور قرآن مجید کے اعجاز اور امتیاز کے اثبات کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ جس کتاب کا نام لینا یہاں پر مناسب اور ضروری ہے وہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی صاحب کی بے نظیر کتاب "اظہار الحق" کی شایانِ شان طباعت و اشاعت کا کام ہے، جس میں انھوں نے صحف سابقہ میں تحریفات واقع ہونے کے ایسے دلائل دیے ہیں جو ریاضی کے نتائج اور مسلمات کی طرح واجب التسلیم اور ناقابل تردید ہیں، اس کے متعلق لندن ٹائمز کی ایک اشاعت میں کہا گیا تھا کہ: "اگر یہ

کتاب چھپتی رہی تو دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت نہ ہوسکے گی"، شیخ مرحوم نے راقم السطور سے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی اور اس نے اپنی سعادت اور دینی ووطنی نسبت کی بناپر اہتمام سے یہ فرض انجام دیا، اب وہ بسیط مقدمہ اس کتاب کا ایک جزو بن گیا ہے۔

اس اعتماد اور عزت افزائی کے علاوہ انھوں نے راقم کی متعدد کتابیں حکومت قطر کے شعبۂ نشریات کی طرف سے اس کے مصارف پر بڑے اہتمام سے شائع کیں جن میں علامہ خمینی کی تردید میں راقم کی کتاب "صورتان متضادّتان" (جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کی بڑے پیمانے پر شیخ اور ان کے شعبے کی طرف سے اشاعت وتقسیم ہوئی، وہ ہر اس موقع پر جہاں اہلِ علم اور صاحبِ ذوق جمع ہوں، ایسی متعدد کتابوں کو پہنچانے اور تقسیم کرنے کا اہتمام کرتے تھے، راقم جب رابطہ کی ایک اہم مؤتمر میں شرکت کے لیے جو وسط اکتوبر میں مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی، حجاز حاضر ہوا تو ۷ا اکتوبر کو مکہ کے بعض دوستوں نے مکہ کی ایک بڑی مسجد میں تقریر کا انتظام کیا، جس میں سعودی عرب کے عالم جلیل اور صدر رابطۂ عالم اسلامی شیخ عبدالعزیز بن باز نے بھی شرکت فرمائی، میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ میری دو کتابیں "ماذا خسر العالم" اور "صورتان متضادتان" بڑی تعداد میں موجود ہیں، اور لوگوں کو دی جارہی ہیں، اور یہ خالصۃً شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کے حکم وایما پر ہو رہا ہے جو اس وقت مکہ معظّمہ میں موجود تھے۔

ان کا ایک بڑا احسان جو نا قابل فراموش ہے، اور سیرت کے موضوع سے ان کی قلبی وابستگی کی دلیل ہے، وہ یہ کہ جب انھوں نے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی شہرۂ آفاق تصنیف سیرۃ النبی کا ذکر سنا اور ان کو اس کی اہمیت ومقبولیت کا علم ہوا، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک ندوی فاضل استاذ محمد اسماعیل مدراسی ندوی (سابق استاذ جامعۃ الجزائر) نے اس کے بعض حصوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے تو انھوں نے اس ترجمہ کے حصول کی کوشش کی، افسوس ہے کہ صرف اس کے پہلے حصہ کا ترجمہ دستیاب ہوسکا، انھوں نے ترجمہ حاصل کرکے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کے سپرد کیا اور ایک

www.abulhasanalinadwi.org

گرانقدر رقم اس کی طباعت کے لیے پیش کی، یہ ترجمہ توفیق الٰہی سے جب زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر عرب فضلاء اور اس موضوع پر مطالعہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو ایک طرف سیرت نبوی کے فکر و مطالعہ میں وسعت و ترقی اور رہنمائی حاصل ہوگی، جو اس عمل کی اصل قیمت اور جو اس کا ذریعہ بنا اس کے لیے باعث سعادت و قربت ہے، دوسری طرف ہندوستان کے عالم محقق اور خادم سیرت کے امتیاز و عزت کا ایک نقش ہوگا جو مسلمانانِ ہند کے لیے باعثِ فخر اور موجبِ شکر ہوگا، اور یہ بھی شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری مرحوم کے ان حسنات باقیہ اور صدقات جاریہ میں گرانقدر اضافہ کرے گا، جن کی تعداد توفیقِ الٰہی اور سعادتِ خداداد سے بہت بڑی ہے۔(۱)

افسوس ہے کہ ان کی وفات سے علماء راسخین، صاحب وجاہت و رسوخ خادمینِ دین کی صفِ اول بلکہ اس کے صدر نشینوں میں ایک اہم مخلص و باتوفیق شخصیت کی جگہ خالی ہوگئی، جس کا قحط الرجال کے اس عہد اور علمی رسوخ، دینی تصلب اور اسلامی حمیت کے روز افزوں زوال کے اس دور میں پر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجے بلند فرمائے اور ان کو ان دینی وملی خدمات اور اسلاف کے مساعی و کارناموں کے احیاء کے اس عمل عظیم پر حیات جاودانی بخشے کہ الجزاء من جنس العمل

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

□□□

(۱) سیرۃ النبی کا یہ عربی ترجمہ نظر ثانی کے بعد جلد مطبع کے حوالے کیا جانے والا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن خوبصورت عربی ٹائپ میں مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہوگا، امید ہے کہ اس کے بعد مصر، بیروت اور حجاز میں بھی اس کے ایڈیشن نکلیں گے، اس کے لیے بہت عرصے سے بلاد عربیہ کے صاحب ذوق و باخبر حضرات اس کتاب کے مطالعے کے مشتاق ہیں۔ والأمر بید اللّٰہ.

www.abulhasanalinadwi.org

ڈاکٹر سعید رمضان مصریؒ

۱۰/ربیع الاول ۱۴۱۶ھ (۸/اگست ۱۹۹۵ء) سہ شنبہ کو اچانک جنیوا سے ٹیلیفون آیا کہ ۶/ربیع الاول ۱۴۱۶ھ (۴/اگست ۱۹۹۵ء) کو جمعہ کے دن ایک عزیز ترین دوست اور پُر زور خطیب، داعیِ اسلام ڈاکٹر سعید رمضان کا انتقال ہوگیا، یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ان کی نعش جنیوا سے قاہرہ لائی گئی اور شیخ حسن البنا کے جوار میں تدفین عمل میں آئی، مرحوم ۱۹۲۶ء میں مصر کے شہر اور تاریخی قصبہ طنطا میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۵ء میں جنیوا میں وفات پائی (۱)۔

یہ خبر راقم اور اس کے حلقے کے ان افراد پر جو مرحوم کی شخصیت، ان کے ممتاز کمالات اور ان کی دینی خدمات سے واقف تھے، پھر راقم سے ان کے برادرانہ ومخلصانہ تعلقات اور گہرے روابط سے بھی آشنا تھے، بجلی بن کر گری۔

واقعہ یہ ہے کہ کم سے کم عالم عربی میں کسی دینی وتحریکی شخصیت، دعوتی میدان میں کام کرنے والے اور خادمِ اسلام سے راقم کا ایسا برادرانہ تعلق اور عزیزوں اور افرادِ خاندان کی طرح انس ومحبت اور اتحاد واعتماد اس نصف صدی کے عرصے میں نہیں رہا جتنا ڈاکٹر سعید رمضان مرحوم سے رہا ہے۔

مرحوم مصر کے رہنے والے تھے، وہ عالم عربی کی عظیم ترین وموثر ترین، مرد آزما مرد آفریں تحریک الاخوان المسلمون کے بانی وقائد الامام الشہید الشیخ حسن البناؒ کے داماد اور ان کے تربیت یافتہ، محبوب ومعتمد، رکن جماعت اور اس کے ترجمان وکارگزار تھے، انھوں نے قانون کی بھی تعلیم حاصل کی اور کامیاب وکیل وبیرسٹر بھی تھے، بعد میں برلن سے ایک

---

(۱) یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ان کی نعش جنیوا سے قاہرہ لائی گئی اور شیخ حسن البنا شہید کے جوار میں تدفین عمل میں آئی، مرحوم ۱۹۲۶ء میں مصر کے شہر اور تاریخی قصبہ طنطہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۵ء میں جنیوا میں وفات پائی۔

www.abulhasanalinadwi.org

علمی ودینی موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، عالم عربی کے ممتاز ترین اور سحر انگیز خطیبوں میں تھے، قاہرہ سے "المسلمون" کے نام سے ایک مؤقر دینی ودعوتی رسالہ نکالا، جس نے عالم عربی میں اور عالم اسلام کے بعض دور دراز گوشوں (انڈونیشیا وغیرہ) میں ایک مدرسۂ فکر اور دبستانِ دعوت کی شکل اختیار کر لی، لوگ اس کو انفرادی واجتماعی طور پر پڑھتے تھے، اور اس کی فکر کو پھیلاتے تھے، پھر جب ان کا مصر میں قیام حکومتی تغیرات اور سیاسی حالات کی وجہ سے ناممکن ہوگیا تو انھوں نے اس کو کچھ عرصہ دمشق سے جاری رکھا، پھر وہ جنیوا منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے یورپ میں تعلیم پانے والے طلبہ اور مقیم مسلمانوں کی رہنمائی اور دینی غذا رسانی، اور اس حریف ونا آشنائے اسلام بلکہ حریفِ اسلام خطۂ ارضی میں اسلام کے تعارف وترجمانی کے لیے ایک دعوتی مرکز (Islamic Centre) قائم کیا، جس کا (اپنے قدیم تعارف وتعلقات کی بنا پر) راقم کو مستقل رکن ومشیر بنایا، چند عرب ارکان کے علاوہ پاکستان کے ممتاز دینی کارکن ومشیرِ حکومت وقانون داں مولانا ظفر احمد صاحب انصاری اور ممتاز ہندوستانی فاضل ومحقق ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی مصنف (Introduction to Islam) مقیم پیرس کو بھی سنٹر کا رکن اور مشیر بنایا گیا اور راقم نے یورپ کا پہلا سفر اس میں شرکت ہی کے لیے کیا، اور تین مرتبہ اس کی نوبت آئی، انھیں کی تحریک وایما پر اس نے اسلام کے "فردوسِ مفقود" و "ارضِ مغصوب" اسپین کا سفر کیا۔

"المسلمون" عرصے تک جنیوا سے بھی نکلتا رہا، جس میں راقم کے مضامین نمایاں طریقے پر شائع ہوتے تھے، راقم کا پہلا مضمون جس نے عالم عربی میں وسیع اور مؤثر پیمانے پر اس کا تعارف کرایا وہ اس کا مقالہ "ردة ولا أبابكر لها" تھا، جو رسالے کی شکل میں چھپ کر بھی شائع اور مقبول ہوا، بعض اوقات منیٰ وعرفات میں بھی بانٹا گیا، اس رسالے میں بتایا گیا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اور ذہین ومؤثر طبقے میں دین سے انحراف بلکہ کہیں کہیں فکری ودینی ارتداد بھی پیدا ہو رہا ہے لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ابوبکر صدیقؓ کی طرح عزیمت وغیرت والی شخصیت یا ادارہ وتنظیم نہیں، ان کی غیرتِ دینی کا اظہار ان کے اس جملے سے ہوتا ہے جو تاریخ

www.abulhasanalinadwi.org

میں محفوظ چلا آرہا ہے "أینقص الدین وأنا حی" کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کمی پیدا کی جاسکتی ہے؟ پھر مرحوم کی فرمائش پر راقم نے حج وصوم پر مقالے لکھے جن میں بعد میں زکاۃ وصلاۃ پر مقالے لکھ کر "الارکان الاربعہ" کے نام سے ایک پوری کتاب تیار کرلی، جس کا اردو انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا اور وہ اس موضوع پر مذاہب کے ایک تقابلی مطالعے اور اسرار شریعت پر ایک وقیع کتاب اور علمی کوشش سمجھی جاتی ہے۔

جب ۱۹۶۶ء میں الامام الشہید الشیخ حسن البنا مرحوم کی خود نوشت سوانح یا ڈائری "مذکرات الدعوة والداعية" کے نام سے پریس میں آئی تو ڈاکٹر سعید رمضان مرحوم نے خاکسار ہی سے فرمائش کی کہ میں اس پر مقدمہ یا تعارف لکھ دوں، میں نے موضوع اور صاحب موضوع کی عظمت ونزاکت کی وجہ سے معذرت کی، اور کہا کہ کسی اور زیادہ واقف وموزوں شخصیت، یا ذاتی شناسا اور رفیقِ کار سے مقدمہ لکھوالیا جائے، مرحوم نے راقم کو تار دیا کہ کتاب آپ کے مقدمے کے بغیر چھپ نہیں سکتی، چنانچہ مقدمہ لکھا گیا اور کتاب قاہرہ اور بیروت سے ۱۹۶۶ء-۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

ذیل میں اپنے سفرنامہ مختصر "مذکرات سائح فی الشرق العربی" (۱) اور کاروان زندگی سے مرحوم کی ملاقاتوں، ان کی سرگرمیوں اور بعض تقریبات واجتماعات کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں، جن سے ان کے امتیازی اوصاف وکمالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

۲۰/ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ (۲۸/جنوری ۱۹۵۱ء) کو ڈاکٹر سعید رمضان سے قاہرہ میں پہلی ملاقات ہوئی، راقم نے ان کا نام سن رکھا تھا اور ان کا تحریک "الاخوان المسلمون" اور اس کے بانی الامام الشہید الشیخ حسن البنا سے رشتہ وتعلق معلوم ہو چکا تھا، انھوں نے بھی اپنے پاکستان کے قیام کے زمانے میں (جو ماضی قریب میں ہوا تھا) اس عاجز کا نام وہاں کے ندوی فضلاء واحباب سے سنا تھا اور بعض عربی رسائل دیکھے تھے۔

۲۷/ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ (۴/فروری ۱۹۵۱ء) کو قاہرہ کی عدالتِ فوجداری میں

---

(۱) اس کا ترجمہ "شرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اخوان کا مقدمہ پیش تھا اور سعید رمضان صاحب کو وکیلِ صفائی کی حیثیت سے بحث کرنی تھی، راقم نے بھی اپنے رفقاء اور مصری احباب کے ساتھ خصوصی اجازت سے عدالت کے کمرے میں داخل ہونے اور بیٹھنے کا موقع حاصل کرلیا، انھوں نے مقدمے کو بڑی مؤثر تقریر اور بے مثال جرأت کے ساتھ پیش کیا، حق و باطل کی قدیم جنگ آزمائی اور نبوی تعلیمات سے شیاطین کی ازلی کشمکش پر روشنی ڈالی، آخر میں یہودیوں کی اسلام دشمنی، ان کے منصوبوں اور عالم اسلام کے لیے پیدا ہونے والے خطرات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے بتایا کہ ان خطرناک حالات میں تحریک اخوان المسلمین وجود میں آئی اور اس نے اس صورت حال سے نبرد آزمائی کی، اس سے عدالت کا ماحول دینی فضا سے بدل گیا اور حاضرین کے دلوں پر رقت وخشیت طاری ہوگئی، انھوں نے جب اس سلسلے کی احادیث و آیات پڑھیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور عدالت کے گوشوں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔

۱۹۶۲ء میں ان کی دعوت پر مکہ معظمہ میں ایک اجتماع ہوا، جس میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے حجاج اور فضلائے عرب شریک ہوئے، وہاں انھوں نے ایک بڑی مؤثر تقریر کی، پھر ایک خصوصی اجتماع مکہ معظمہ ہی میں ایک دوست یا کسی ادارہ کے بالا خانے پر ہوا، وہاں انھوں نے تقریر میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا اور حاضرین بہت متاثر ہوئے۔

اسی سال ۱۹۶۲ء کے حج کے موقع پر انھوں نے ذمہ دارانِ حکومت اور سعودی عرب کے اہل الرائے کو ایک ایسے بین الاقوامی اسلامی مرکز کو قائم کرنے کا مشورہ دیا جس سے پورے عالم اسلام تک مسلمانوں کو درپیش مسائل و مصائب کی اطلاع دی جاسکے، ان کا تعاون حاصل کیا جاسکے، اور ان حملوں اور پروپیگنڈوں کا جواب دیا جاسکے جو مخالف محاذوں خاص طور پر مصر کی طرف سے پھیلائے جاتے ہیں (۱)۔

چنانچہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ (۱۹۶۲ء) کو رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا، جس کے وہ ایک فعال رکن اور کارکن قرار پائے اور کئی سال وہ اس میں شرکت کے لیے مکہ معظمہ

---

(۱) یہ ذہن میں رہے کہ یہ زمانہ جمال عبد الناصر کی صدارت و حکومت کا تھا جس کا بڑا نشانہ سعودی حکومت اور اسلامی تحریکیں تھیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

حاضر ہوتے رہے(۱)۔

۱۹۵۶ء میں جب راقم سطور دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر استاذ زائر(Visiting Professor) کی حیثیت سے دمشق میں مقیم تھا، ان کی دعوت پر دمشق میں ایک وسیع اور عمومی اسلامی مؤتمر کا انعقاد ہوا، جس کا آغاز ۲۶/جون ۱۹۵۶ء سے ہوا اور ۲۸/جون ۱۹۵۶ء تک جاری رہی، محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا بحیثیت صدر کے منتخب ہوئے، اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور خاکسار راقم کو نیابت کا اعزاز بخشا گیا، پاکستان کے علامہ مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی دیوبندی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری شرکت کے لیے آئے تھے، ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی (سابق وزیر اعظم شام) ڈاکٹر ناظم القدسی صدر پارلیمنٹ اور شکری القوتلی صدر جمہوریہ شام کی تائید وتعاون کی وجہ سے کانفرنس کامیاب اور اعتماد واحترام کی فضا میں ہوئی۔

بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر یا صحت کی خرابی کی وجہ سے جنیوا کا اسلامک سنٹر بھی تعطل کا شکار ہوگیا اور رسالہ ''المسلمون'' بھی بند ہوگیا، کئی سال تک ان سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی، اکتوبر ۱۹۸۵ء میں جب آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے سلسلے میں لندن کا سفر ہوا تو ۱۳/اکتوبر کو اسلامک سنٹر بیکر اسٹریٹ لندن میں راقم کی تقریر کا ایک پروگرام تھا، وہاں اچانک ڈاکٹر سعید رمضان پر نظر پڑی جو جنیوا سے لندن صرف ملنے کے لیے آئے تھے، انھوں نے راقم کو جنیوا آنے کی دعوت دی تھی، لیکن جب اس سے (بعض موانع کی بنا پر) معذرت کی گئی تو وہ خود لندن آگئے، دیر تک لپٹ کر روتے رہے، پھر قیام گاہ پر آکر ملے اور اگلے دن صبح ایرپورٹ پر آکر رخصت کیا۔

یہ بھی لائق ذکر ہے کہ وہ دو مرتبہ ہندوستان اور بالخصوص لکھنؤ آئے، دہلی کے مختصر قیام میں دفتر جمعیۃ العلماء واقع گلی قاسم جان دہلی میں ان کا ایک پروگرام رکھا گیا، وہ

---

(۱) افسوس ہے کہ بعض غلط فہمیوں یا ان کی صاف بیانی وصاف گوئی کی وجہ سے وہ اس رکنیت سے محروم کردیے گئے اور ان کا حجاز جانا موقوف ہوگیا۔

زمانہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کی نظامتِ جمعیت کا تھا، انھیں نے ڈاکٹر سعید رمضان کے قیام کا، ارکان پارلیمنٹ کی قیام گاہ کے ایک حصے میں انتظام کیا تھا، لکھنؤ سے راقم، مولانا محمد عمران خاں صاحب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور برادرزادۂ عزیز سید محمد الحسنی (محمد میاں مرحوم) ان سے ملنے اور ان کو لکھنؤ لانے کے لیے دہلی گئے تھے، دفترِ جمعیت میں انھوں نے عربی میں تقریر کی اور راقم نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، پھر وہ لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کی تکریم واستقبال میں جلسہ ہوا اور انھوں نے ایک مؤثر تقریر کی جو صحیفہ الرائد (عربی) ندوۃ العلماء کے شمارہ جمادی الآخرہ ۹ ۱۳۷ھ میں شائع ہوئی، یہ پروگرام ۱۶/دسمبر ۱۹۵۹ء کو رکھا گیا۔

دہلی کے ایک سفر میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ملاقات کی خواہش ظاہر کی، راقم نے مولانا کے دفتر سے رابطہ قائم کیا، اور انھوں نے وزارت تعلیم ہی کے مرکز میں ملاقات کے لیے وقت دیا، مولانا حسب مزاج ومعمول اخلاق وتپاک سے ملے، مہمان عزیز سے انھوں نے عربی میں گفتگو کی، ڈاکٹر سعید رمضان نے اپنے رسالہ ''المسلمون'' کے چند شمارے مولانا کی خدمت میں پیش کیے۔

ان سے آخری ملاقات ۹ رستمبر ۱۹۹۳ء میں ہوئی، راقم اور اس کے رفقائے سفر عزیز القدر مولوی سید محمد رابع ندوی اور رفیق عزیز ومحترم محمد عثمان صاحب حیدرآبادی کو نیویارک سے جہاں شکاگو کی (All Religions Conference) میں شرکت کے بعد آنا ہوا تھا، حجاز مقدس حاضر ہونا تھا، معلوم ہوا کہ نیویارک سے اس دن جدہ کے لیے کوئی ڈائرکٹ فلائٹ نہیں ہے، جدہ کے لیے جہاز جنیوا میں ملے گا، چنانچہ وہاں سے ارادہ کرلیا گیا، عزیزی محمد رابع کو بہت اچھا خیال آیا کہ ڈاکٹر سعید رمضان کو (جن سے عرصے تک ملاقات نہیں ہوئی تھی) اس کی اطلاع کردی جائے، جہاز کے انتظار میں ۴ رگھنٹے جنیوا کے ہوائی اڈے پر ٹھہرنا تھا، چنانچہ ان کو ٹیلیفون سے اطلاع کردی گئی، وہ مع اپنے صاحبزادوں کے ہوائی اڈے پر آگئے، مل کر بہت روئے اور روانگی تک بیٹھے رہے، ان پر

بڑھاپے اور تجربات اور واقعات کی بنا پر حزن وملال کا بڑا اثر تھا، جب تک بیٹھے رہے بڑی محبت اور تعلق کا اظہار کرتے رہے، افسوس ہے کہ ان کا مصر جانا بھی عرصے سے قانوناً ممنوع تھا اور سعودی عرب سے بھی اب تعلقات نہیں رہے تھے، اسلامک سنٹر بھی تعطل کا شکار تھا، اس طرح وہ ایک طرح کی جلاوطنی اور تعطل کی زندگی گزار رہے تھے، اس مختصر اور محزون صحبت میں ان کی سرگرمیوں اور مشاغل کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی، کچھ دیر کے بعد جہاز کی روانگی کا وقت آگیا اور ہم لوگوں نے جنیوا سے پرواز کی، یہ نہیں معلوم تھا کہ کچھ عرصے کے بعد وہ عالم بالا کو پرواز کرجائیں گے، اور ان کو پھر اس دنیا میں دیکھنے سننے کا موقع نہیں ملے گا، اللہ تعالیٰ آخرت میں ان سے بہتر حالات میں بہتر مقام پر ملائے، وَالآخِرَةُ خَيْرٌ وَ اَبْقٰى اور ان کی دینی خدمات ومساعی اور ان کے اخلاص ودردمندی اور جہد ومستعدی کی بہترین جزاعطا فرمائے، اِنَّ اللّٰهَ لَايُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ.

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ محمد الغزالیؒ

عالم عربی بلکہ عالم اسلامی کے ایک راسخ العلم، صحیح الفکر، رجوع الی الاسلام کے طاقتور داعی اور مسلمان مفکر اور مصنف اور باحث شیخ محمد الغزالی کا ۱۹/شوال ۱۴۱۶ھ (۹/ مارچ ۱۹۹۶ء) کو اناسی سال کی عمر میں ریاض میں انتقال ہو گیا، شیخ کے خاندان کو مصر سے بلانے کے لیے خادم حرمین شریفین ملک فہد نے ایک مخصوص طیارہ مصر بھیجا، تاکہ ان کا خانوادہ جنۃ البقیع میں ان کی تدفین میں شرکت کر سکے، وہاں شیخ شہداء وصالحین اور دعاۃ ومحدثین کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔

راقم سطور جب جنوری ۱۹۵۱ء میں مصر گیا اور وہاں چار مہینے کے قریب اس کا قیام، اور دورہ رہا، اور وہاں کے مصنفین وادباء، اہلِ طرز خاص اور اصحاب فکر ونظر اور دین کے داعیوں اور ترجمانوں سے ملاقاتیں اور مکالمے رہے جن کی روداد راقم نے اپنے سیاحت نامہ اور روزنامچہ " مذكرات سائح في الشرق العربي "(۱) میں درج کی ہے، میں نے ان کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

میں شیخ محمد الغزالی سے ملنے کا خواہش مند تھا، وہ اخوان المسلمین کے نمایاں رکن اور مصر کی موجودہ دینی بیداری کی جدوجہد کے رہنماؤں میں ہیں، یہ آرزو پوری ہوئی، میں "الإسلام والمناهج الاشتراكية"، "الإسلام المفترى عليه" اور "من هنا نعلم" کے مصنف سے ملا، میں اس صاحب قلم سے ملا، جس سے اخوان کو صحیح فکر وروحانی غذا اور صالح اسلامی لٹریچر ملتا ہے، ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ان میں میں نے ایک صالح تعلیم یافتہ،

(۱) اس کا اردو میں ترجمہ مولانا شمس الحق صاحب ندوی استاد دارالعلوم ومدیر "تعمیر حیات" کے قلم سے "شرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سرگرم، زندہ دل، روشن دماغ شخص کو دیکھا، جس کے چہرے سے بشاشت ٹپکتی ہے، ان سے مل کر معلوم ہوا کہ ہم سے ہر ایک رسالوں اور کتابوں کے ذریعے دوسرے سے واقف ہے اور ان کتابوں میں اس کے فکر والوں کی تصویر دیکھ چکا ہے۔

وہ جن فضلائے دین کے ترجمانوں اور دعوتی و تحقیقی کام کرنے والوں اور وقت کے فتنوں اور مزعومہ روشن خیالی اور ترقی پسندی کی دعوت و کوشش کا مقابلہ کرنے والوں سے خاص طور پر متاثر ہوا اور ان میں اس نے وہ سطحیت و مرعوبیت اور مزعومہ روشن خیالی نہیں پائی، ان میں جامع ازہر کے فاضل اور تحریک اخوان المسلمین کے ترجمان شیخ محمد الغزالی تھے، جو شعبۂ اوقاف کے ڈائرکٹر، ادارۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے منیجر اور وزارت اوقاف کے وکیل بھی رہے(۱)۔

ان کی بڑی خصوصیت علوم شریعت میں گہری و وسیع نظر اور اس کی صحیح اور جرأت مندانہ ترجمانی تھی، راقم نے اپنے روزنامچۂ مصر پر نظر ڈالی تو سولہ مقامات وہ نکلے جن میں ان سے ملاقات یا مکالمہ رہا، یا ہم سفری و رفاقت، راقم نے ان کے ساتھ قاہرہ کے مضافات اور مصر کے بعض اضلاع اور مرکزوں کا دورہ بھی کیا جن میں بنہا، قویسنا اور عزیزیہ کا سفر اور مصر کے بعض دیہات شامل ہیں۔ وہ تقریباً ۳۸ کتابوں کے مصنف ہیں، ۱۴۰۹ھ کو ان کو اسلامی خدمات پر شاہ فیصل عالمی ایوارڈ ملا، سالِ رواں ۱۹۹۶ء میں المنظمة الإسلامی للتربية والعلوم اسیسکو نے بھی سلطان حسن عالمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا اور انعام کا اعلان بھی کر دیا، لیکن یہ خبر اس وقت شائع ہوئی جب شیخ اس دنیا سے رحلت کر چکے تھے، مرحوم خاکسار راقم کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" اور دوسری عربی تصنیفات کے بارے میں جو بلاد عربیہ سے شائع ہوئیں یا ان کی نظر سے گزریں اچھا خیال اور تاثرات رکھتے تھے اور راقم سطور سے ایک دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلق محسوس ہوتا تھا۔

□□□

(۱) شرق اوسط کی ڈائری، ص ۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ علی طنطاویؒ

ادیب کبیر اور صاحب طرز عربی کے انشا پرداز علامہ علی طنطاوی کا ۴/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ۱۹/ جون ۱۹۹۹ء کو انتقال ہوا، محب محترم عثمان صاحب حیدرآباد کے ٹیلی فون ان سے وفات کی اطلاع اچانک پہنچی، اور دل ودماغ پر بجلی کی طرح گری، وہ عرصۂ دراز سے حجاز مقدس میں مقیم اور معذور اور صاحب فراش تھے، گزشتہ ایک سفر میں ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی، وہ بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے، لیکن بڑی بشاشت ومسرت کے ساتھ ملے، استاذ علی طنطاوی عالم عربی کے ایک ممتاز ترین اہل قلم اور صاحب طرز ادیب تھے، ادبیت، حُسنِ تحریر، قدرت بیانی اور اسلامیت کے لحاظ سے ان کا اور سید قطب شہیدؒ کا کوئی نظیر نہیں تھا، ان دونوں کے اندر اسلام کی حقانیت وابدیت، زمانۂ حاضر کی دین بیزاری، احساس کمتری اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اس کی برتری وفوقیت کے خلاف ذہن اور نفسیات پائی جاتی تھیں، اور ان کا ان کی تحریروں میں اظہار ہوتا تھا، راقم کی دو کتابوں ''الطریق إلی المدینۃ'' اور ''کاروانِ زندگی'' کے عربی ترجمہ "فی مسیرۃ الحیاۃ" پر ان کا ادیبانہ اور فاضلانہ مقدمہ ہے، جو ادیبانہ بھی ہے اور محبانہ بھی، "الطریق إلی المدینۃ" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

''قریب تھا کہ میں اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھالیتا، لیکن برادرم ابوالحسن! میں نے جب آپ کی کتاب ''الطریق إلی المدینۃ'' پڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ میرا شوق واپس آرہا ہے، اور معلوم ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے خالی نہیں ہے، اسی طرح میرا ادب عربی پر سے اعتماد اٹھتا جارہا تھا، اس لیے کہ ادبائے عرب کے یہاں وہ بلند جذبات نہیں دیکھے جن کا شریف رضی اور بُرعی شعرائے نعت کے یہاں نمونہ دیکھا تھا، لیکن جب میں نے آپ کی کتاب ''الطریق إلی المدینۃ'' پڑھی تو میں نے اس کو پایا اور دیکھا کہ نثر میں شاعری کا مزا ہے۔''

"فی مسیرۃ الحیاۃ" جلد اول پر چودہ صفحے کا طویل مقدمہ ہے، اس میں بڑی عالی ظرفی،

www.abulhasanalinadwi.org

فراخ دلی کے ساتھ خاندان، رجحانات، تصنیفات اور طرزِ حیات اور طرزِ تحریر پر تبصرہ کیا ہے، راقم کی کتاب "مختارات" پر بھی انھوں نے تبصرہ کیا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس کی داد دی، دمشق میں ثانویہ شرعیہ کے لیے عربی ادب کے منتخبات تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس میں علامہ طنطاوی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، سب نے بالاتفاق راقم کی کتاب مختارات کا انتخاب کیا۔ خود شیخ طنطاوی اپنی خودنوشت سوانح "ذکریات" میں اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"مدارس کے لیے جن کتابوں سے میں واقف ہوں، ان میں سب سے بہتر کتاب صدیق ادیب داعی مخلص شیخ ابوالحسن ندوی کی "مختارات" ہے، اس کی ضرورت ہے کہ مصنفین اس کے اسلوب کو اختیار کریں۔"

ان کا تعلق اور یگانگت اور مناسبت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حجاز میں ریڈیو کے ایک مکالمے میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں رہنا پسند کریں گے؟ انھوں نے کہا: مکہ معظمہ میں جہاں اس وقت ہوں، یہاں کسی وجہ سے رہنا ممکن نہ ہوا تو اپنے مسکن دمشق میں، اور اگر وہاں بھی قیام ممکن نہ ہوا تو پھر لکھنؤ میں رہنا پسند کروں گا، ریڈیو کے سائل نے پوچھا کہ لکھنؤ کیا ہے؟ کہا کہ شیخ ابوالحسن ندوی کا وطن و مسکن، پھر اس کی بارے میں چند مدحیہ اور شوقیہ کلمات کہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کو راقم سے اور اس کے مرکز و دیار سے کتنا تعلق تھا، ان کی کتاب میں جو خودنوشت سوانح عمری (ذکریات) ہے، تئیں صفحے میں عاجز کا اور اس کی فکر و تصنیفات و دعوت اور ان مرکزوں کا ذکر ہے جس سے راقم کا تعلق ہے، معاصر اہل قلم ادباء کے یہاں اس کی مثال ملنی مشکل ہے ۱۹۵۴ء کے کسی مہینے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء ان کی آمد ہوئی تھی اور انھوں نے اساتذہ اور طلبہ کو خطاب بھی فرمایا تھا، دارالعلوم کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر بھی ان کو دعوت دی گئی لیکن بعض موانع کی بنا پر وہ تشریف نہیں لا سکے۔

راقم کی نظر میں سید قطب شہیدؒ اور شیخ علی طنطاوی عہد اخیر کے ممتاز ترین بلکہ منفرد اسلامی الفکر و قلم اور ممتاز ترین بلکہ بے نظیر اور بے مثال ادیب تھے، اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے اور درجے بلند کرے۔ وفات کے وقت ان کی عمر نوے سال کی تھی۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

ممتاز دینی داعی و روحانی مربی

- مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ
- مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ
- حضرت مولانا شاہ عبدالغفور مہاجر مدنیؒ
- مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلویؒ
- مولانا عبیداللہ صاحب بلیاویؒ
- مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ

راقم سطور کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس ہے، لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اس کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور عالمِ اسلامی سے واقفیت کے ایسے ذرائع اور مواقع میسر آئے جو (بلا کسی تحقیر و تنقیص کے) اس کے ہم وطنوں اور ہم عمروں میں سے بہت کم اشخاص کو میسر آئے ہوں گے، دنیائے اسلام اور بالخصوص ممالک عربیہ کے دینی، علمی اور روحانی حلقوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور برتنے کا اتفاق ہوا، دورحاضر کی مشکل سے کوئی تحریک اور کوئی عظیم شخصیت ہوگی جس سے ملنے اور سعادت حاصل کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔

اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو کسی کا ذاتی کمال اور سرمایۂ فخر نہیں) یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ایمان بالغیب کی دعوت، دعوت کے شغف اور انہماک اور تاثیر کی وسعت وقوت میں اس ناکارہ نے اس دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا کوئی ہمسر اور مقابل نہیں دیکھا، یوں ان کی نادرۂ روزگار شخصیت میں بہت سے ایسے کمالات پائے جاتے تھے جن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کی ایمانی قوت، ان کا اعتماد وتوکل، ان کی ہمت وجرأت ان کی نماز اور دعا، صحابۂ کرامؓ کی زندگی سے ان کی گہری واقفیت اور ان کے حالات کا استحضار، اتباعِ سنت کا اہتمام، فہم قرآن اور واقعاتِ انبیاء علیہم السلام سے عظیم نتائج کا استخراج، دعوت وتصنیف کے متضاد مشاغل کو جمع کرنے کی قوت، اور آخر میں ان کی غیر معمولی محبوبیت اور مقبولیت، یہ سب ان کی زندگی کے وہ پہلو اور نمایاں صفات ہیں، جن کے متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، اور جس کے لفظ لفظ کی تصدیق وہ سب لوگ کریں گے جن کو ان کی خدمت میں

کچھ دن رہنے کی سعادت یا کسی سفر میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے، اور ان کی تعداد ہزاروں کی ہے، لیکن درحقیقت یہ سب اور ان کے ماسوا اور بہت سے پہلو ان کی سوانح اور سیرت کا موضوع ہیں، اور ان میں سے بعض کمالات وامتیازات وہ ہیں، جن میں ان کے سہیم وشریک مل سکتے ہیں، اور بعض شخصیتیں ان میں ان سے فائق بھی ہو سکتی ہیں، لیکن راقم نے ان کے جن امتیازات کا یہاں انتخاب کیا ہے، ان میں (اپنے محدود واقفیت وعلم میں) ان کا کوئی سہیم وشریک اور ان کا کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا، والغیب عند اللہ۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے، ہم نے غیبی حقائق، اللہ کے وعدوں اور اور انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اطلاعات پر ایمان لانے اور ان کے اعتماد ویقین پر اپنی زندگی کی کشتی کو چھوڑ دینے کی ایسی واشگاف، طاقتور، اور بے لاگ دعوت کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی، جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کی قدرت کن فیکون، اس کے بلا شرکتِ غیرے پورے نظام عالم کو چلانے، اسباب کی بے حقیقتی، خواصِ اشیاء اور انسانی تجربات کی بے اعتباری، محسوسات ومشاہدات کو تحقیر ونفی، احکامِ الٰہی اور نظامِ تشریعی کے سامنے نظام تکوینی کی سپر اندازی ومغلوبیت، ایمانی صفات واخلاق اور اطاعت وعبودیت کے سامنے وسائل وذخائر کی بے حقیقتی، حاملینِ نبوت اور اہلِ ایمان ودعوت کا اربابِ اقتدار، اہلِ حکومت اور سرمایہ داروں کے مقابلہ میں فتح وغلبہ، خدا کے وعدوں کی ابدی صداقت اور سنۃ اللہ کی ہمہ گیری کا مضمون اپنی پوری ایمانی قوت اور اپنے والہانہ اندازِ بیان میں بیان فرماتے تو سننے والے اتنی دیر کے لیے اس حواس ومادہ پرستی کی دنیا سے منتقل ہو کر ایمان بالغیب کی دنیا میں پہنچ جاتے، اور اسباب ومسببات کا سلسلہ اور مقدمات ونتائج کا ربط وتعلق اتنا بے کار وبے حقیقت نظر آنے لگتا تھا کہ ہم جیسے مدرسی لوگوں کو بعض اوقات اس کی فکر پیدا ہو جاتی تھی کہ کہیں یہ دعوت سننے والوں میں ترکِ اسباب اور تجرد ورہبانیت کا رجحان نہ پیدا کر دے، لیکن اس دور مادیت میں جہاں ''اسباب'' نے ''ارباب'' کی شکل اختیار کر لی ہے، اور ایک عالم کا عالم اپنی قسمت کو مادی اسباب اور اپنی ذاتی کوشش وقابلیت

www.abulhasanalinadwi.org

کے ساتھ وابستہ کر چکا ہے، اور کسی دینی دعوت وتحریک کو وہ قلندر صفت افراد نہیں مل رہے ہیں، جن کا عشق ''آتش نمرود'' میں بے خطر کود کر عقل کو ''محوِ تماشائے لبِ بام'' کردے، بلکہ اس تھوڑے سے ایثار اور قربانی کی جنس بھی نایاب ہوگئی ہے، جس کے ایندھن کے بغیر کسی تحریک کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی، مادی ترقی اور مادی اقدار کی اہمیت وتقدس کی مسلسل اور پرجوش تبلیغ وتلقین نے خود اس امت کو متاثر کرلیا ہے، جس کی ساری طاقت اور جس کی فتح کا راز ایمان بالغیب کی قوت، رضائے الٰہی کی طلب اور جنت کے شوق میں مضمر تھا، مسلمان نے ذرائع معاش کو اپنا رزاق سمجھ لیا ہے۔

مادیت کی اس وبائے عام کے دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایمان بالغیب کی اس دعوت سے بعض اوقات سیکڑوں سامعین کے دل ایمان کے جذبے سے معمور اور قربانی کی لذت سے مخمور ہوجاتے تھے، اور وہ اس کے اثر سے ایثار وقربانی کے ایسے نمونے پیش کرنے لگے تھے، جن کو عقل ودلائل، حکمت ومصلحت اور علم وخطابت کی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا، اور جن کی بنیاد پر یہ تحریک دنیا کے دور دراز گوشوں میں پہنچ گئی، ہزاروں آدمیوں نے جن میں ہر طبقے کے لوگ تھے، مہینوں کے لیے گھر بار چھوڑ کر دوسرے براعظموں کا سفر کیا، اور دعوت وتبلیغ کے راستے میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کیں، انھوں نے بڑی دریا دلی اور عالی ہمتی کے ساتھ اپنا وقت اور اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کیا، اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی تو وہ ایمان بالغیب کی اس طاقت سے (جو اس دور میں مشکل سے کسی اور جماعت کو میسر آئی ہوگی) معاشرے کی اصلاح وانقلاب اور دنیا کے حالات میں تبدیلی کا اور زیادہ وسیع وعمیق کام لیتے اور افراد کی یہ قوتِ ایمانی اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی، ان کی ان مجالس میں کبھی کبھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مجالسِ وعظ کی جھلک نظر آنے لگتی تھی جن کی (غیر اللہ کی نفی سے لبریز) تقریروں نے ہزاروں دلوں اور دماغوں پر گہری چوٹ لگائی، جس وقت آدمی ان کے ان مواعظ کو (جو فتوح الغیب اور دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں) پڑھتا ہے تو معلوم

www.abulhasanalinadwi.org

ہوتا ہے کہ ایک شخص پوری بے باکی اور قوت کے ساتھ گرز چلا رہا ہے، اور اس کی ضرب سے مادیت کے ہزاروں بت پاش پاش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جیسے لوگ جن کا دماغ اسباب و مسببات کے باہمی تعلق سے کبھی آزاد نہیں ہونے پاتا اور جو مادی سعی و جہد کو بھی دین و شریعت میں ایک مقام دیتے ہیں، اور انسان کو اپنی سعی کا مکلّف و مامور سمجھتے ہیں، اور جو اس عالمِ اسباب میں مسلمانوں کی پست ہمتی اور بے عملی کو ان کے زوال کا ایک سبب قرار دیتے ہیں، وہ کبھی مولانا کے اس طرز کی کامیابی کے ساتھ نقل نہیں اتار سکے اور ان کے ذہن نے عین ان مجالسِ وعظ میں بھی اپنا کام کرنا نہیں چھوڑا، لیکن ہم کو اس کا صاف اعتراف ہے کہ ان کی اس دعوتِ ایمانی نے وہ نتائج پیدا کیے جن سے ہماری ''متوازن و معتدل'' دعوتیں (جن کی عصر حاضر کے حقائق پر نظر ہے) قاصر رہیں، اور صاف اندازہ ہوا کہ ؎

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

ان کا دوسرا امتیاز اپنی دعوت کے ساتھ ان کا ایسا شغف و انہماک تھا، جس کی مثال نہ صرف یہ کہ دینی دعوتوں اور تحریکوں کے میدان میں نظر نہیں آتی بلکہ جہاں تک اس کوتاہ نظر کی نظر و واقفیت کا تعلق ہے کسی مادی و سیاسی تحریک کے داعیوں میں بھی وہ استغراق، خود فراموشی، والہیت اور جذب کی کیفیت نظر نہیں آئی، ان کا یہ پہلو اتنا نمایاں اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ جب تک کسی شخص کو کچھ عرصے ان کی خدمت میں رہنے اور کسی سفر میں ان کی معیت کا موقع نہ ملا ہو وہ بہتر سے بہتر تصویر کشی اور واقعہ نگاری کے بعد بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، چند دن رہ کر آدمی ان کی مشغولیت و انہماک اور ان کے جذب و استغراق کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا تھا اور اس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی قوت و تازگی کہاں سے آتی ہے، اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ عام حالات میں ''عشق'' اور خاص حالات میں تائیدِ الٰہی اور نصرتِ غیبی کے سوا اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

معمولی بات یہ ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیس

www.abulhasanalinadwi.org

دن تقریر فرماتے، یہ تقریر ڈھائی تین گھنٹے سے کم نہ ہوتی، اس میں موسم کی سختی، دھوپ کی گرمی، صحت کی خرابی، مجمع کی کمی وزیادتی قطعاً اثر انداز نہ ہوتی، یہ مجاہدہ رمضان المبارک میں بہت بڑھ جاتا، جبکہ فجر کے بعد لوگوں کے سونے کا عام معمول ہے رمضان میں ان کی رات شب بیداری اور دعوت کے کام میں صرف ہوتی، اس کے باوجود فجر کی نماز کے بعد پوری قوت، تازگی اور نشاط کے ساتھ تقریر فرماتے، اور اسی قوت کے ساتھ آخر میں دعوت دیتے، عام دنوں میں چائے کے دوران اور چائے کے بعد پھر گفتگو اور تقریر کا سلسلہ شروع ہوجاتا، عام طور پر وہ جماعتوں کو رخصت کرنے کا وقت ہوتا، وہاں تشریف لے جاکر پھر اسی طرح تقریر فرماتے اور ہدایات دیتے کہ معلوم ہوتا کہ ابھی تک خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی، اور وہ اب ٹوٹی ہے، پھر اسی جذبے اور طاقت کے ساتھ دعا کرتے کہ معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے، نہ اس کے بعد کریں گے، سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے، اور سب کچھ اسی دعا میں کہہ دینا ہے، اس کے بعد بھی مختلف تقریبوں سے گفتگو اور خطاب کرنے کا سلسلہ جاری رہتا، پھر کچھ دیر تصنیف وتالیف کا کام کرتے، پھر کھانے کا وقت ہوجاتا، ظہر کے بعد پھر کوئی سبق پڑھاتے یا تصنیف وتالیف کا کام کرتے، ملنے جلنے اور ڈاک دیکھنے کا بھی سلسلہ جاری رہتا، کبھی بعد عصر اور بعد مغرب بھی کوئی تقریر ہوجاتی، اور اس میں بھی تازگی اور جوش کا وہی عالم ہوتا، عشاء کے بعد (جو اکثر بڑی تاخیر سے ہوتی) سیرت کی کوئی کتاب یا صحابۂ کرامؓ کے حالات کا کوئی مجموعہ سنانے کا معمول تھا، کتنا ہی تھکے اور جگے ہوئے ہوں اور کیسی خستہ اور شکستہ حالت ہو، اس معمول میں حتی الامکان فرق نہ ہوتا، دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا، سننے والے کو محسوس ہوتا کہ اس شخص نے دن بھر آرام کیا ہے۔

ہم جیسے پست ہمتوں کے لیے نظام الدین کا دو روز کا قیام بھی سخت آزمائش اور مجاہدہ تھا، میرا خود حال یہ تھا کہ اکثر اپنے دل سے خطاب کر کے کہتا ”بے ہمت! مولانا کے لیے ساری زندگی کا معاملہ ہے، تیرے لیے صرف دو دن کا معاملہ ہے“ لیکن بہانہ جو اور سہولت پسند طبیعت اپنی صحت کی کمزوری اور مولانا کی عالی ظرفی کا سہارا لے کر کوئی گوشہ

عافیت تلاش کر لیتی، اس وقت اگر کوئی تلاش کرنے والا تلاش کرتا تو خود زبانِ حال سے اس کو اپنا پتہ نشان اس طرح دیتا کہ۔

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

سفر میں تو یہ انہماک اور استغراق بہت بڑھ جاتا، پھر تقریروں کی تعداد، ان کی مقدار اور ان کے اوقات کی کوئی تحدید نہیں تھی، بعض دوستوں نے اندازہ لگایا ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے بولنے کی نوبت آتی۔(۱) اس میں بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا، اب اسی موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے، یہی ہر وقت کی دعا کی کیفیت ہوتی۔

مجھے حجاز کے آخری سفر میں حاضری کا موقع نہیں ملا، لیکن میں نے بالتواتر سنا ہے کہ وہاں یہ جوش وخروش اور یہ جذبہ وانہماک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا، مسجد نبویؐ میں صحنِ مسجد میں فجر کی نماز کے بعد تقریر شروع ہوجاتی اور دن چڑھ آتا، اور جن خوش قسمت آنکھوں نے تقریر کے آغاز میں گنبدِ خضرا پر چاندنی دیکھی ہوتی وہ دھوپ چڑھی ہوئی دیکھتے، مجھے یاد ہے کہ بھوپال کے ایک اجتماع میں مولانا نے مغرب کے بعد پوری قوت اور اپنی تقریر کے عام پیمانے کے مطابق بسیط تقریر کی، تقریر کے بعد تشکیل ہوئی، پھر دعا ہوئی، مجھے اطمینان تھا کہ اب اس تقریر کے بعد آرام فرمائیں گے کہ خدا جانے کہ نکاح کی تقریب سے یا کسی اور تقریب سے پھر کچھ بولنا شروع کیا، طبیعت مطمئن تھی کہ چند منٹ میں اس کا سلسلہ ختم ہوجائے گا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ مولانا میں نئی تازگی اور جوش آگیا، پھر اس طرح تقریر فرمائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دن بھر خاموش رہے ہیں، اور طبیعت جوش پر ہے۔

یہی حال دعا کا تھا، مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور

(۱) یہ اندازہ صرف تقریروں کا ہے، مجلسی گفتگوؤں کے اوقات اس کے علاوہ ہیں۔۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

جوش وخروش، اس کی رقت انگیزی اور اس کی تاثیر، مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آئی، جب دعا کرتے، حاضرین کا عجب حال ہوتا، خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا، دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں، اس کی مثال ماضی قریب میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ایک جانشین مولانا سید نصیر الدینؒ کے حالات میں نظر آئی کہ بیان کرنے والوں نے بیان کیا کہ دعا کے وقت رحمتِ الٰہی جوش میں نظر آتی، لوگوں پر ایک وارفتگی اور بےخودی کی کیفیت ہوتی اور بعض لوگ دیوانہ وار جنگل کو نکل جاتے، واقعہ یہ ہے کہ دعا کے وقت جو کیفیت لوگوں پر طاری ہوتی اور جو اثرات ان کے دلوں پر ہوتے، اگر کچھ دیر بھی باقی رہ جاتے تو لوگ دنیا کے کام کے نہ رہتے اور معلوم نہیں حالات میں کیا تبدیلی ہوتی، لیکن نظام عالم اسی طرح چل رہا ہے، اور ہم ضعیف البنیان ہر چیز کا اثر وقتی طور پر لیتے ہیں۔

ان کی تیسری امتیازی خصوصیت جس میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، ان کی تقریروں اور صحبت کا وہ اثر ہے، جو سامعین وحاضرین پر پڑتا، خاص طور پر ان سلیم طبیعتوں پر جن کا دل ودماغ دوسرے اثرات سے آزاد، اور ان کی طبیعتوں میں تسلیم وانقیاد کا مادہ غالب ہوتا، ان کی کیمیا اثر صحبت اور ان کی انقلاب انگیز تقریروں نے اتنی زندگیوں میں تبدیلیاں پیدا کیں اور اتنے دلوں اور دماغوں کو متاثر کیا کہ جن کا شمار کرنا ممکن نہیں، ان صحبتوں اور تقریروں کے اثرات اتنے گہرے ہوتے کہ صورت، سیرتِ زندگی، معاشرت اور یہاں تک کہ سوچنے اور بولنے کا طریقہ بھی بدل جاتا، سیکڑوں آدمی ہیں جو ان کی زبان بولنے لگے اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملے ان کو حفظ ہوگئے، کتنے اشخاص ہیں کہ جن کی دعاؤں میں ان کی دعاؤں کا رنگ آگیا، کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امیرانہ زندگی رکھنے والے لوگ ہیں جن کی زندگی اور معاشرت سرتاپا مغربی اور رئیسانہ تھی، اور وہ اب ایک درویش صفت مبلغ اور ایک فقیر منش اور جفاکش مجاہد نظر آتے ہیں، اور جن کی گرانقدر تنخواہوں اور آمدنیوں کا بڑا حصہ تبلیغ ودعوت، رفقاء کی امداد واعانت اور جماعت کی نصرت

www.abulhasanalinadwi.org

پر خرچ ہوتا ہے، اور ان میں ان کے گھر والوں کا اور ان کا اپنا وہی حصہ ہے جو ایک متوسط ملازم یا ایک اوسط درجے کے تاجر کا ہے، کتنی بڑی تعداد ان رفقاء اور نیاز مندوں کی ہے، جن کی زندگی، جن کا ذوقِ عبادت، جن کا جذبۂ خدمت اور جن کی خشیت وانابت، اور جن کی بے نفسی اور تواضع دیکھ کر اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے، حقیقی علم تو علام الغیوب کو ہے، لیکن ان کے اخلاص واخلاق کو دیکھ کر ان کی دینی ترقی اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جو زندہ ہیں (خدا ان کی زندگی میں برکت دے) ان کے متعلق کچھ کہنا خلافِ احتیاط ہے "فان الحی لا یؤمن علیه الفتنة(۱)" لیکن جانے والوں میں سے متعدد اصحاب کے نام لیے جاسکتے ہیں، جو ہمارے دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اور ان کے حالات اتنے رفیع ہوگئے جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ان میں سے میں صرف اپنے محبوب اور عزیز دوست حاجی ارشد صاحب مرحوم کا ذکر کروں گا جن کا (اپنے اعلیٰ عہدے اور ذمہ داریوں کے ساتھ) اخلاص وللہیت، تعلق مع اللہ، دعوت کے کاموں میں انہماک واستغراق، ایثار وقربانی کی کیفیت، تواضع وانکسار، خدمت کا جذبہ اور پھر اسی راہ کی قابلِ رشک موت اور شہادت برسوں دل کو تڑپاتی اور ان کی یاد تازہ کرتی رہے گی، جاپان میں اشاعتِ اسلام کے کام کا افتتاح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمایا تھا، اور اہلِ حجاز بھی ان کو عرصے تک یاد رکھیں گے، دنیا کے دور دراز ملکوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے، جو مولانا کی چند روزہ صحبت اور دو ایک تقریروں کے سننے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی بدل گئی اور ان کے اندر ایک خاص طرح کے ایمان ویقین کی کیفیت، دعوت کی سرگرمی، دعا کا سلیقہ، نمازوں میں کیفیت اور ایثار کی عادت پیدا ہوگئی، ایسے لوگ ہندوستان اور پاکستان کے باہر امریکہ یورپ اور افریقہ کے برِاعظموں میں بھی ملیں گے۔

جہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگا ہے

---

(۱) یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے الفاظ ہیں، فرمایا کہ دنیا سے چلے جانے والوں کی اقتدا کرو، اس لیے کہ جو زندہ ہے اس کے بارے میں فتنے سے اطمینان نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا کی دعوت اور شخصیت اپنے پورے شباب اور عروج پر تھی، ان کی ہمت کا طائرِ بلند پرواز کسی بلند سے بلند شاخ پر بھی آشیانہ بنانے کے لیے تیار نہ تھا، کوئی دور سے دور جگہ ان کو دور، اور کوئی مشکل سے مشکل کام ان کو مشکل نہیں معلوم ہوتا تھا، انھوں نے اپنی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری اور اپنی طبیعت کی بے چینی اور بے تابی سے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں اور دنوں میں کرلیا، اپنے والدِ نامدار کے بعد نئے ملکوں میں جماعتوں کے جانے کا افتتاح کیا اور ساری دنیا کو گھر آنگن بنالیا، حج کا مسئلہ اٹھایا(۱)، اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی، اور دیکھتے دیکھتے حجاج کی تعداد اور ان کی کیفیات میں عظیم فرق پیدا ہوگیا، اجتماعات، میوات کے محدود پیمانے سے نکل کر اتنے عظیم اور وسیع بن گئے کہ بڑی بڑی سیاسی کانفرنسیں اور بڑے بڑے پبلک جلسے (مجمع کی کثرت میں بھی) ان کے سامنے ماند پڑ گئے اور ان کی وہ کثرت ہوئی کہ مولانا کے لیے نظام الدین کا قیام مشکل ہوگیا، تبلیغی تقریروں میں غیر مسلموں سے خطاب، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، موجود مادی زندگی پر تنقید اور فساد کے سرچشمے کی نشاندہی کے باب کا افتتاح کیا، اور ان میں ایسی کشش پیدا کردی کہ سیکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم شریک ہونے لگے اور متاثر ہوئے، یہ سب کام بڑی طویل عمر چاہتے تھے، لیکن مولانا نے پچاس برس سے کم عمر اور اپنی ذمہ داری اور دعوت کے صرف بیس سال کے اندر انجام دیئے، اور یہ سب منزلیں طے کرکے اپنے خالق سے جاملے۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے(۲)

□□□

(۱) فریضۂ حج میں روح پیدا کرنے اور اس کو تبلیغ و دعوت کا ذریعہ بنانے کا مسئلہ۔

(۲) ماخوذ از مقدمہ "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ" تالیف مولوی سید محمد ثانی مرحوم، مقدمہ از قلم ابوالحسن علی ندوی ص ۲۰-۲۸۔

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ جن کی وفات ۳/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ (۱۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء) کوالہ آباد میں ہوئی، مولانا سید بدرعلی شاہ صاحبؒ کے سب سے نامور اور جلیل القدر خلیفہ تھے، مولانا سید بدرعلی شاہ صاحب کو اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے خلافت واجازت تھی، وہ راقم کے وطن رائے بریلی کے ایک مضافاتی قصبہ سدھونہ میں مدفون ہیں، جہاں وفات سے کچھ عرصہ پہلے سے سکونت اختیار فرمائی تھی، یہ رائے بریلی شہر سے گیارہ کلومیٹر پر واقع ہے، ۴ھ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں ان کی وفات ہوئی (۱)، راقم نے واقف کاروں اور اہلِ تعلق سے سنا ہے کہ وہ بڑے عالم تھے کئی سال مصر میں رہے (۲)، جامع ازہر قاہرہ سے علمی استفادہ کیا، حدیث کے بہت بڑے ذخیرہ کے حافظ تھے، یہ بھی روایت ہے کہ صحیح بخاری مکمل یاد تھی۔

راقم کو ایک بار ان کی زیارت کا شرف حاصل ہو، غالباً ۳۲-۱۹۳۳ء ہوگا کہ وہ اپنے محلے بازار جھاؤلال (حال محمد علی لین) کی مسجد میں جو مسجد نوازی کے نام سے مشہور ہے، عصر یا مغرب کی نماز کے وقت گیا تو دیکھا ایک بزرگ جو سادہ شرعی لباس میں ملبوس ہیں تشریف رکھتے ہیں، اور راقم کے برادر بزرگ و مربی ڈاکٹر مولوی حکیم سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ بھی مجمع میں تشریف فرما ہیں، معلوم ہوا کہ یہ بزرگ مولانا بدرعلی شاہ صاحب ہیں، کوئی اور گفتگو اس وقت کی یاد نہیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے بعض باوجاہت اشخاص ان سے بیعت ہوئے، جن میں میر سید احمد حسین صاحب مالک فرم، احمد حسین

---

(۱) اگر یہ روایت صحیح ہے کہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں ان کی ولادت ہوئی تو ان کی عمر قمری حساب سے ۱۱۶، اور شمسی حساب سے ۱۱۳ سال ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (۲) ایک روایت ہے کہ وہ سترہ سال وہاں رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ولدار حسین تاجر تمبا کو بھی تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ بیعت کے اس تعلق کے بعد غالباً حضرت ہی کی ہدایت وتذکیر پر انھوں نے فریضۂ حج کی ادائیگی کا شرف بھی حاصل کیا، اس واقعے کو اتنا زمانہ گزر گیا کہ اس کے ایک ایک حرف اور جز کی صحت کی ذمہ داری لینا مشکل معلوم ہوتا ہے، پھر اس کے بعد کبھی شاہ صاحب کی زیارت یا ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

مولانا محمد احمد صاحب کی ولادت باسعادت موضع پھولپور ضلع پرتاب گڑھ میں ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں ہوئی، آپ کے والد محترم کا اسم گرامی غلام محمد تھا، جو دیندار شخص تھے، اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے، اور آپ ہی کی تجویز وہدایت پر آپ کا نام محمد احمد رکھا گیا (۱)۔

۴۱-۱۹۴۰ء کے بعد جب نظام الدین کی حاضری اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق وعقیدت کے بعد لکھنؤ کی جماعت کے ساتھ قریب کے اضلاع اور شہروں کے دورے شروع ہوئے تو پرتاب گڑھ کے ایک دورے میں پہلی مرتبہ حضرت مولانا محمد صاحب پھولپوری کی زیارت ہوئی، لباس، گفتگو کسی چیز سے مشیخت اور امتیاز کا اظہار نہیں ہوتا تھا، لباس بھی سادہ اور گفتگو بھی سادہ، لیکن جن حضرت کا وعظ سنا تو اس میں وہ للہیت، روحانیت اور خالص یادِ خدا، ذکر آخرت، انابت الی اللہ اور اصلاحِ نفس کا رنگ پایا جو اب اس دور میں بہت کم مقررین وواعظین کی تقریروں میں نظر آتا ہے، یہ رنگ جہاں تک اپنے تجربہ ومعلومات کا تعلق ہے، تین عالموں اور مقررین کی تقریروں میں دیکھا، ایک مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی (۲) جونپوری کے ان مواعظ میں جو اپنے

(۱) حضرت مولانا کے تذکرے وحالات وخصوصیات کے لیے ملاحظہ ہو، مولانا قمر الزماں صاحب ناظم ومہتمم مدرسہ بیت المعارف بخشی بازار الہ آباد کی کتاب "اقوال سلف" کا چوتھا حصہ وتذکرہ شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی از مولانا عمار احمد صاحب۔

(۲) مولانا جونپور کے اس مشہور فاروقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو محلّہ قضیانہ جونپور میں آباد تھا، مولانا کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفائے خاص میں تھے، اور اخیر تک اس خاندان میں انھی کا رنگ قائم رہا، مولانا ابوبکر صاحب اور ان کے والد مولانا مکیؒ راقم کے جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے دست گرفتہ اور ارادت مندوں میں تھے، مولانا عرصے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے ناظم رہے، ۲۳ر شعبان ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو وفات ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

بچپن میں اپنے خاندانی مسکن ووطن دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں سنے تھے، دوسرے امام اہلِ سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی، تیسرے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ۔

اس زمانے تک حضرت کا قیام زیادہ تر پرتا پگڑھ ہی میں رہتا تھا، اور وہیں زیارت اور حاضری کا شرف حاصل ہوتا تھا، ایک مرتبہ حضرت کے وطن قصبہ پھولپور میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد حضرت کا قیام الہ آباد رہنے لگا، اور اس قیام وخدمت کا شرف غالباً مدرسہ بیت المعارف واقع محلہ بخشی بازار کو رہا، اس کے بعد ڈاکٹر ابرار احمد صاحب کو مستقل طور پر یہ شرف حاصل ہوا کہ حضرت ان کے دولت خانہ پر قیام فرمائیں، وہیں معتقدین اور نیاز مندوں کو اور باہر سے جانے والوں کو شرف مجالست واستفادہ حاصل ہوتا تھا، ان آخری برسوں میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری راہی ملک بقا ہوئے، راقم الہ آباد کا سفر صرف حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے اور استفادہ کی غرض سے کیا کرتا تھا، قیام تو حضرت کی اجازت سے ''بیت المعارف'' میں رہتا تھا، اور حضرت ازراہ شفقت کبھی کبھی وہاں بھی تشریف لاتے تھے، ورنہ زیادہ تر خصوصاً آخری سالوں میں جب ضعف بہت بڑھ گیا تھا، ڈاکٹر صاحب کے مکان پر شرف مجالست واستفادہ حاصل ہوتا، حضرت کی شفقت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کبھی کبھی رائے بریلی بھی تشریف لائے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تو کئی کئی روز قیام رہا۔

تقدیر الٰہی سے۔ اس پر جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ ایک طویل سفر سے ایک ہفتہ پہلے حضرت کی خدمت میں حاضری کا تقاضا پیدا ہوا، اور راقم سطور اپنے چند اعزہ ورفقاء کے ساتھ موٹر سے الہ آباد حاضر ہوا، حضرت نے۔ جو طویل علالت وضعف کی وجہ سے بالکل صاحب فراش تھے، اور حرکت کرنا بھی مشکل تھا۔ اٹھائے جانے کے لیے اصرار کیا اور کسی طرح آرام فرمانے پر راضی نہ ہوئے، چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے اور دیر تک بیٹھے رہے، شفقت اور کرم فرمائی کا وہی انداز تھا، اور آنے پر مزید مسرت وانبساط کا منظر، ہر

حاضری میں اسی طرح پذیرائی فرماتے رہے، رخصت کے وقت پھر اسی شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا اور جب تک موٹر روانہ نہیں ہوگئی، برابر پوچھتے رہے، اور اس کے بعد آرام فرمایا۔

راقم الٰہ آباد سے آنے کے بعد رابطہ ادب اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے بھوپال روانہ ہوگیا، وہاں ۱۲/ اکتوبر کو شب میں لکھنؤ سے ٹیلیفون کے ذریعہ حادثۂ وفات کی اچانک اطلاع ملی اور راقم سطور اور اس کے رفقائے سفر اور جو اعزہ ساتھ تھے، سب حزن والم میں ڈوب گئے، لیکن اس حزن وغم کے ساتھ یہ خیال کر کے تھوڑی سی تسلی ہوتی تھی کہ ایک ہی ہفتہ پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت کی زیارت کرادی، ان کی پر محبت نگاہوں، مشفقانہ اداؤں اور مخلصانہ دعاؤں کی یاد نے کچھ تسکین کا سامان کیا۔

بہرِ تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کی
جو بوقتِ ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

حضرت کے روحانی کمالات، اور نسبتِ فضلِ رحمانی کے گنج مراد کے جواہر پاروں سے واقفیت کے لیے چشمِ بصیرت کی ضرورت تھی، جو یہاں مفقود ہے لیکن حضرت کی دو خصوصیتوں سے ضرور واقفیت ہے اور ان کے چشم دید مشاہدہ کا شرف حاصل ہوا، ایک انتہائی سادگی وتواضع، شفقتِ بزرگانہ، بلکہ محبت پدرانہ ومربیانہ، دوسرے بلند پایہ عارفانہ کلام اور حضرت جگر مراد آبادی کے اس شعر کا مشاہدہ اور چشم دید نظارہ۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

حضرت کے یہاں عرفانِ محبت کا یہی نظارہ دیکھا، حضرت کے دیوان کا نام بھی کسی عارف نے صحیح طور پر ''عرفانِ محبت'' رکھا ہے، حضرت کے مقامِ عارفانہ، مراتب بزرگانہ، اور خصائص درویشانہ کے بارے میں کچھ لکھنے کے بجائے جس کے لیے چشم بصیرت، طولِ صحبت اور خصوصی معرفت درکار ہے، مناسب اور مستحسن یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے مجموعۂ اشعار ''عرفانِ محبت'' پر خود حضرت کی زندگی میں اس عاجز کے قلم جو پیش

www.abulhasanalinadwi.org

لفظ لکھا گیا تھا، اور کتاب کے مقدمہ وتعارف کے طور پر شائع ہوا اس کو نقل کر دیا جائے کہ اہلِ بصیرت ہی نہیں اہلِ بصارت کو بھی اس میں بہت کچھ نظر آئے گا۔

مولانا شبلیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب شعر العجم کے حصہ پنجم میں صوفیانہ شاعری کے باب کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی، جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا، شاعری اصل میں اظہارِ جذبات کا نام ہے، تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا، قصیدہ مداحی اور خوشامد کا نام تھا، مثنوی واقعہ نگاری تھی، غزل زبانی باتیں تھیں، تصوف کا اصلی مایۂ خمیر عشق حقیقی ہے، جو سرتاپا جذبہ اور جوش ہے، عشق حقیقی کی بدولت مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے سینہ ودل گرما دیے، اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے خالی نہیں ہوتا تھا، ارباب دل ایک طرف، اہلِ ہوش کی باتوں میں بھی تاثیر آگئی''۔(۱)

مولانا نے صحیح لکھا ہے لیکن یہ متصوفانہ شاعری مختلف طبعی، نسلی، نیز سیاسی اور تاریخی اسباب کی بنا پر ایران میں پیدا ہوئی، عربی شاعری میں صوفیانہ کلام نہ ہونے کے برابر ہے، اور اگر کہیں ہے تو اس میں نمک نہیں، حضرت علی مرتضیٰ، سیدنا زین العابدین اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یا بعض اولیاء کرام سے (جن کی زندگی عربی ماحول میں گزری) جو کلام منقول ہے اس کی نسبت صحیح نہیں، اور داخلی شہادتیں اس کی تردید کرتی ہیں کہ یہ ان کی زبان اور ان کا کلام ہے، عربی شاعری میں تصوف کا سارا سرمایہ سیدی ابن الفارض مصری (متوفی ۶۳۲ھ) کا عارفانہ وعاشقانہ کلام ہے، جو میخانۂ وحدت کے سرشار اور عربی کے قادر الکلام اور شیریں زبان شاعر تھے۔

اردو شاعری فارسی شاعری کی پروردۂ نعمت ہے، اس کا تغزل، اس کی تشبیب، بہار

---

(۱) شعر العجم حصہ پنجم (مطبع معارف اعظم گڑھ) صفحہ ۱۱۲۔

www.abulhasanalinadwi.org

کا مضمون، ساقی نامہ، مدحیہ قصائد کا گریز اور اس کی بہت سی مضمون آفرینیاں اور نازک خیالیاں فارسی شاعری کا چربہ اور کہیں کہیں اساتذۂ ایران کے اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے، جس کو (اگر بڑی احتیاط سے کام لیا جائے تو) توارد کہہ سکتے ہیں، لیکن اردو کی صوفیانہ شاعری ایران سے مستعار لی ہوئی چیز فارسی شاعری کی نقالی نہیں کہ یہاں جو کچھ ہے، اصل ہی اصل ہے، کیفیات باطنی ہیں، اور وارداتِ دل، چاشنی و نمکینی، ترکیب کی چستی اور کلام کی برجستگی استعاروں اور تشبیہات کی نزاکت و لطافت یہ سب چیزیں مانگے کی ہوسکتی ہیں، لیکن جوش و مستی، بے خودی و وارفتگی، بغیر باطنی کیفیت، اندرونی سرشاری اور میخانۂ عشق سے براہ راست ربط و تعلق کے پیدا نہیں ہوسکتی، راقم سطور نے ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کے حصہ سوم میں حضرت مخدوم بہاریؒ (۱) کے مکتوبات کے باطنی وادبی پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:۔

> ''ناقدینِ ادب نے وقت، ماحول، فضا، اور طبیعت کے فراغ کو ادب وشاعری کے لیے بہت زیادہ سازگار اور معاون عنصر تسلیم کیا ہے، اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ لبِ جو، کنارِ دریا، گوشۂ چمن، فصلِ بہار، نسیمِ سحر، صبح کا سہانہ وقت، ان کی شاعری اور ان کے ادب کے لیے محرک بن جاتا ہے، اور ان میں بہت سے لوگ ایسے مقام کی تلاش اور ایسے وقت کے انتظار میں رہتے ہیں، اس طرح یہ حقیقت تسلیم کرلی گئی کہ روح کی لطافت اور دماغ کا سکون ادبیات کے لیے بہت معاون ہے''۔

بعض اہلِ دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت اور قوت ہے، وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت و سرمستی کا نتیجہ ہے، اور اس کے لیے وہ کسی خارجی مدد اور مقام اور وقت کے محتاج

---

(۱) حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاریؒ متوفی ۷۸۲ھ (تفصیلی تعارف وحالات کے لیے ملاحظہ ہو ''تاریخ دعوت وعزیمت'' از مصنف حصہ سوم از صفحہ ۱۷۷ تا صفحہ ۲۳۹۔

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں ہوتے، ان کی خوشی و سرمستی کا سرچشمہ اوران کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے۔خواجہ میر درد نے جوخود صاحبِ دل اور صاحب درد تھے،اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے ۔

جائیے کس واسطے اے دردؔ میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ"(۱)

لیکن اردو میں یا تو اس دور کی صوفیانہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں، جب اردو نے بال و پر نکالے ہی تھے،اور زبان ابھی عہد طفلی میں تھی،اس زمانے کا صوفیانہ کلام پڑھیئے تو آج آپ کو لطف نہ آئے گا کہ متروکات سے بھرا ہوا اور ناموس الفاظ سے گھرا ہوا ہے، اس میں صرف میر سراج الدین سراج (م ۱۱۷۷ھ) کا استثنا ہے،جنھوں نے دکن کے ہوتے ہوئے خالص دلی کی زبان میں اپنے جذبات وواردات کا اظہار کیا ہے،اور زبان ایسی منجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اور خواجہ میر دردؒ کی ہو،ان کی ایک غزل کے مشہور شعر ہیں ۔

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت غیب سے ایک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

سراجؔ کے بعد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کے بعد خواجہ میر دردؔ کے ہاں تصوف کے حقائق ومضامین اوراس میخانے کی مستی اور سرشاری ملتی ہے،لیکن وہ تصوف کے اسرار وحقائق کے محرم اور صاحبِ حال ہونے کے باوجود اصلاً غزل گوشاعر تھے،ان

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت حصۂ سوم صفحہ ۲۴۴۔

www.abulhasanalinadwi.org

کے تغزل میں ان کی کیفیاتِ باطنی اور حرارتِ عشق کا اثر آگیا اور اس نے ان کے کلام کو حافظ کے کلام کی طرح سراپا انتخاب بنا دیا۔ اردو کے اس دورِ آخر میں حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے ہاں بھی محبت کا عرفان اور میخانۂ عشق کا فیضان ملتا ہے، لیکن وہ بھی غزل کے پردے میں چھپا ہوا اور عشقیہ مضامین کے نیچے دبا ہوا ہے۔

اصل صوفیانہ کلام جس میں شاعرانہ محاسن، استادانہ مہارت، مضامین کی آمد، قوافی پر مالکانہ قدرت اور تغزل کی چاشنی پورے طور پر پائی جاتی ہے وہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا کلام ہے، جو ازل سے عاشقانہ طبیعت لے کر آئے تھے، اور ایک شیخ کامل کی صحبت نے جو صاحبِ حال و قال تھا اس کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔

حضرت مجذوب (جن کی زیارت کا شرف تو خال خال لیکن ان کے کلام کے دیکھنے اور اس سے لطف اٹھانے کی سعادت بار بار حاصل ہوئی) کے بعد دوسرے بزرگ جو ''سندانِ عشق'' اور ''جامِ شریعت'' دونوں کے جامع نظر آئے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری ہیں (اطال اللّٰہ حیاتہٗ ومد فیوضہٗ) ان کی تعلیم و تربیت ان کا ماحول، ان کے معاملاتِ زندگی، کسی چیز سے بھی کسی اجنبی کو اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اللّٰہ نے کو عشق و مستی کی یہ کیفیت اور اسی کے ساتھ طبیعت کی یہ موزونیت عطا فرمائی ہے کہ ان کا کلام عشق و مستی سے بھرپور اور معرفت و محبت کا ''شراب طہور'' نظر آتا ہے، ان کے کلام میں عشق و محبت کا مضمون اور گرمی و سرمستی اتنی نظر آتی ہے کہ ان کے دیوان کا نام صحیح معنیٰ میں ''عرفان محبت'' ہی ہوسکتا ہے، اور جس نے یہ نام تجویز کیا اس نے اپنے حسنِ مذاق کا ثبوت دیا۔

مجھے ان کے کلام کے سننے کا شرف ان کی زبان مبارک سے بار ہا ہوا اور کبھی ان کے خادمِ خاص اور حافظِ کلام، کامل صاحب سے سنا، اور ہر مرتبہ دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ یہ کلام مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ ان لوگوں کو بھی اس سے فیض اٹھانے اور اپنے دل کی انگیٹھی گرمانے کا موقع ملے جن کو کسی وجہ سے ان کی مبارک مجالس میں شرکت کا اتفاق نہیں ہوا، اس تحریک میں برادر زادۂ عزیز محمد میاں مرحوم کا بڑا حصہ تھا وہ عرصے سے

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سے تقاضا کر رہے تھے کہ مولانا اپنا منتشر کلام جمع کر کے ان کو عنایت فرما دیں، تا کہ وہ اس کو مرتب کر لیں، خدا کا شکر ہے کہ اس کا موقع ان کی زندگی میں آ گیا، انھوں نے اس کو پڑھا اور عنوانات تجویز کیے، اب یہ مجموعہ میرے سامنے ہے، اس کو اس مجموعی شکل میں جب دیکھتا ہوں تو کلام کی بلندی، جامعیت اور اشعار کی گرمی و مستی اور زیادہ بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے، اس کو جہاں سے دیکھئے اور جدھر سے کھولئے یہ ''عرفانِ محبت'' ہی نظر آتا ہے، یہاں پر اس کے کچھ نمونے ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پیش کیے جاتے ہیں، کلام کا اصل جوہر اس کی گرمی و مستی ہے، اور مولانا نے صحیح کہا ہے ؂

خدا کا فضل ہے ورنہ میں اس قابل نہ تھا احمؔد
کہ میں نے آگ جو بھر دی ہے اشعارِ محبت میں

اس مستی اور محبت و عشق کی قدر و احترام کا نمونہ دیکھئے ؂

لطف جنت کا تڑپنے میں جسے ملتا نہ ہو
وہ کسی کا ہو تو ہو، لیکن ترا بسمل نہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں ؂

نثار جاں حزیں کر دے شوق سے احمؔد
کھڑا ہے کون؟ ذرا دیکھ ترے سرہانے

خواجہ میر دردؔ نے اپنے ایک شعر میں (جس کا لطف وہی لے سکتے ہیں جو اسیریِ محبت کی لذت و عزت کو سمجھتے ہیں) اس کی تمنا کی تھی کہ ان کو اس ''بندِ محبت'' سے کبھی آزاد نہ کیا جائے ؂

اپنے بندہ پہ جو تم چاہو سو بیداد کرو
پر کہیں جی میں نہ آجائے کہ آزاد کرو

مولانا نے اس کو (تحدیث بالنعمۃ کے طور پر) ایک واقعہ کی طرح بیان کیا ہے ؂

نعمت یہ مبارک ہو کہ احمؔد کبھی تجھ کو
وہ دامِ محبت سے نہ آزاد کریں گے

وہ لذتِ عشق سے پوری طرح آشنا اور اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں، اس لیے ان کی زبان سے وہ اشعار نکلے ہیں، جس سے فیضانِ محبت نہیں (جو جگر کے نزدیک عطائے عام ہے)(۱) "عرفانِ محبت" کا اظہار ہوتا ہے، جو عطائے خاص ہے، کہتے ہیں ؎

کوئی اہلِ محبت سے تو پوچھے　　عجب شے ہے صدائے لن ترانی
کسی نہ اپنے بے پایاں کرم سے　　مجھے خود کر دیا روح المعانی

عشق نے احمدؔ مجلّٰی کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے نام کے

میں تو اس قابل نہ تھا لیکن جنوں کے فیض سے
کھول دی ہے میں نے بھی احمدؔ دکانِ زندگی

وہ اسی کیف و مستی میں کبھی کبھی اسرار عشق و مستی واشگاف کہہ جاتے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

پوچھیے مت یہ اسرار ہیں عشق کے　　روتے روتے مجھے آگئی کیوں ہنسی

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

نہیں ہیں جو ترے دیوانے آج تک وہ کبھی
خوشی میں رو نہ سکے غم میں مسکرا نہ سکے

ان کے نزدیک پروانہ کی طرح یک دم سے جل کر مر جانا کمال نہیں، عشق کی آگ میں جلتے رہنا اور ہزار بار جینا ہزار بار مرنا کمال ہے، فرماتے ہیں ؎

کمالِ عشق تو مر مر کے جینا ہے نہ مر جانا
ابھی اس راز سے واقف نہیں ہیں ہائے پروانے

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

رونا کبھی، ہنسنا کبھی، جلنا کبھی، بجھنا　　الوانِ محبت ہیں یہ الوانِ محبت

---

(۱) جگر کہتے ہیں ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں　　فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

www.abulhasanalinadwi.org

خدا نے ان کو اس عشق و مستی میں تمکین وہوش کا مرتبہ سمجھنے کی قوت وتوفیق عطا فرمائی ہے، فرماتے ہیں ؎

بھٹک کے منزلِ جاناں سے دور جا پہنچے ۔۔۔ جو جوشِ عشق میں جذبات کو دبا نہ سکے

وہ سمجھتے ہیں کہ ساقی کی نگاہِ عنایت کا مستحق عالی ظرف مے نوش ہے نہ کہ تنک ظرف عقل ودین فروش، فرماتے ہیں ؎

کریں گے خاک وہ رندی سمجھ چکا ہوں میں ۔۔۔ جو ایک گھونٹ ہی پی کر لگے ہیں اترانے

ان کو ساقی سے ربطِ اندرونی کا ایسا اطمینان ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جسمانی دوری سے بھی محرومی ومجبوری نہیں، فرماتے ہیں ؎

کہیں بھی ہم ہوں مگر فیض ہے یہ ساقی کا ۔۔۔ ہمارے پاس پہنچتے ہیں اُڑ کے پیمانے

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

میری دوری پسند ان کو ہے دوستو ۔۔۔ اب تو دوری سے بڑھ کر حضوری نہیں

نیز ؎

عشق کا معجزہ اسے کہئے ۔۔۔ دور ہو کر بھی میں نہیں ہوں دور

پھر وہ فرماتے ہیں ؎

بجز اس کے کہوں کیا تیری نظروں کی کرامت ہے
کسی کا مے نہ پینا اور پھر مخمور ہو جانا

ایک متبع شریعت شیخ (۱) اور ایک صحیح النسبۃ سلسلے (۲) سے وابستگی نے آپ کے اندر طریقت پر شریعت کی ترجیح اور اتباعِ سنت کی ضرورت واہمیت کو منکشف کر دیا ہے، اور مختلف اشعار میں آپ نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے ؎

---

(۱) حضرت مولانا شاہ بدر علی صاحب رائے بریلوی مسترشد اویسِ زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ۔ (۲) سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

اگر آزاد ہم ہوتے خدا جانے کہاں ہوتے
مبارک عاشقوں کے واسطے دستور ہوجانا

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اب نہ افراط باقی نہ تفریط ہے عشق کامل ہوا، معتدل ہوگیا

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

لذت بندگی کے سامنے ہے ہیچ سب حال وقال کی لذت

اس تحقیق واستقامت نے مولانا کو نفس وشیطان کے مکائد اور امراض نفس سے آگاہ کردیا، اور آپ نے ان امراض ونقائص کی پردہ کشائی فرمائی، ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کوئی بھی منزلِ عرفان تک پہنچ نہ سکا کسی کو نفس، کسی کو کمال نے مارا

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کھل گئی جب سے چشمِ بصیرت اپنی نظروں سے خود گر گئے ہم

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

تیرے کرمِ خاص پہ سو جان سے قربان
میں اس سے ہوں ممتاز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جو ہے اہلِ عشق کی ابتدا جو ہے اہلِ عشق کی انتہا
میں بتاؤں احمدِ بے نوا میرا اعترافِ قصور ہے

اس حقیقت شناسی نے مولانا میں تفویض وتسلیم کی شان پیدا کردی، اور ''حبیبِ تمنا تہی'' کا عالم نظر آیا، فرماتے ہیں ؎

ہوتی نہ یوں تکمیلِ محبت اپنی تمنا ہوتی جو پوری

www.abulhasanalinadwi.org

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ان کی طلب ہے مقصدِ اعظم   اور ہر اک شے غیر ضروری

بہت سے اشعار سادگی و پرکاری کا نمونہ ہیں۔ حمد میں فرماتے ہیں۔

آتشِ عشق نے جلا ڈالا   زندگی ہم نے مر کے پائی ہے

عمر غفلت میں ہوگئی برباد   میرے مالک تری دہائی ہے

میں وہ عاصی ہوں دیکھ کر جس کو   رحمتِ حق بھی مسکرائی ہے

یا مثلاً۔

مر کے ہوتی ہے زندگی حاصل   ایسے مرنے کی تم دعا کرنا

خلوصِ دل سے پکارے اگر کوئی ان کو   ہر ایک نام ہی ان کا پھر اسم اعظم ہے

تسلیم کہ حاصل تجھے ہر علم و ہنر ہے   لیکن یہ بتا کچھ تجھے اپنی بھی خبر ہے

ایک جگہ مسلمانوں کو عام خطاب کیا ہے، اور ان کو تبلیغ و ہدایت کا فریضہ یاد دلایا ہے، یہ اسّی سے زائد اشعار کی ایک نظم ہے جس کا مطلع ہے۔

رحمت کا ابر بن کے جہاں بھر میں چھائیے   عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے

اس میں تبلیغ بھی ہے تصوف بھی۔

مجاہد کی فضیلت و مرتبہ پر بھی ایک نظم ہے جس مولانا کے اندرونی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تصوف تعطّل و فرار نہیں سکھاتا وہ دین کی حمیت اور اسلام کی حمایت کا جذبہ بھی ابھارتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اردو کے بعض مشہور اساتذہ وشعراء کے اشعار نیز ہندی دوہوں پر مولانا کے بعض ترمیمی و اصلاحی شعر بھی ہیں جو لطف سے خالی نہیں۔

غرض اس مجموعۂ کلام کو پڑھ کر اچھے اچھے حاضر باشوں کو بھی مولانا ہی کی زبان میں کہنا پڑتا ہے۔

احمدؔ تجھے نہ جانا نہ سمجھا تمام عمر
گو ساتھ جارہے ہیں ترے، آرہے ہیں ہم

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا عبدالغفور نقشبندی مہاجر مدنیؒ

(۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء)

یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ حجاز مقدس اور حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً اسلام کا مبدء ومعاد، ہر مسلمان کا ملجا اور ماویٰ اور ہر دینی و دنیاوی نعمت کا مخزن ہے۔ یـجـبـیٰ اِلَیـهِ ثَـمَرَاتُ کُلِّ شَیئٍ، اس لیے کسی دور میں وہ باکمال شخصیتوں، اہل قلوب اور اصحاب دعوت وارشاد سے خالی نہیں رہے۔

ایسا بھی بہت ہوا ہے کہ اہل قلوب اور مشائخ کبار نے زندگی کا بیشتر حصہ دیار عجم میں صرف کیا، پھر اسی بلد امین یا جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر پناہ لی اور اپنی زندگی کے آخری دن یہیں بسر کیے۔ دور قدیم میں شیخ تاج الدین سنبھلیؒ، شاہ صبغت اللہ بھڑوچیؒ، سید آدم بنوریؒ اور اس صدی کی ابتدا میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مولانا عبدالحق الہ آبادی شیخ الدلائل کا نام لیا جاسکتا ہے، اقبال مرحوم نے اپنے ان دو مشہور شعروں میں ان سب حضرات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔

دریں پیری رہِ یثرب گرفتم\
غزل خواں از سرورِ عاشقانہ\
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام\
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ایسی متعدد شخصیتوں کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے کسی اشارۂ غیبی یا تقاضائے قلبی سے حرمین شریفین ہی کو اپنی خدمت ودعوت کا مرکز بنایا اور انھوں نے وہاں

www.abulhasanalinadwi.org

بیٹھ کر عالم اسلام کے دور دراز گوشوں سے آنے والوں کی روحانی و باطنی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیا۔ اور اس طرح ان کا فیض دور دور پہنچا۔ انھی خوش قسمت اور عالی ہمت افراد میں حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مجددی مدنی بھی تھے جنھوں نے گزشتہ ربیع الاول کے اوائل میں اس جہان فانی سے کوچ فرمایا اور بقیع کی خاک پاک کو اپنا آخری مسکن بنایا۔

مولاناؒ علاقہ سوات کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم صوبہ سرحد سے حاصل کر کے دہلی آئے، مدرسہ امینیہ میں تکمیل کی، پھر وہاں سالہا سال تدریس کے فرائض انجام دیے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے ممتاز شاگردوں میں تھے، ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کرتے تھے، ان کے تلمذ پر مولانا کو فخر تھا، مولانا کو زمانۂ طالب علمی ہی میں کمالات باطنی اور تزکیہ و تربیت کا ذوق تھا، اس سلسلے میں آپ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت فضل علی شاہ صاحبؒ قریشی سے بیعت ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا، اپنی فطری استعداد اور مناسبتِ خداداد سے بہت جلد ایسا امتیاز پیدا کر لیا کہ ان کی اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے، پھر بعض اشارات و مبشرات کی بنا پر مدینہ طیبہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں آستانۂ رسالت پناہی پر پڑ کر خلق اللہ کی خدمت اور نفوس و قلوب کی اصلاح و تربیت میں مصروف ہو گئے، اس عالم گیر انقلاب کی بنا پر جو سارے عالم اسلام پر محیط ہے ــــــ اور حجاز مقدس کے مخصوص حالات کی بنا پر خاص طور پر اصلاحِ باطن اور تعلق مع اللہ کی دعوت دینے والوں سے یہاں کی فضا روز بروز نامانوس ہوتی جا رہی تھی، خصوصیت کے ساتھ سلاسل و طرق کے ساتھ نسبت رکھنے والوں کو بہت سی مشکلات اور بدگمانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی، مولانا عبدالغفور صاحبؒ نے اس شک و شبہ کی فضا میں اپنا کام شروع کیا اور بہت جلد ان کی ذات اور ان کی قیام گاہ طالبینِ اصلاح کا مرکز بن گئی، اور رفتہ رفتہ یہ فیض ہندوستان و پاکستان کے حجاج و زائرین سے تجاوز کر کے مصر و شام و ترکی و ترکستان تک عام ہو گیا، لوگ حج کے زمانے میں اور اس کے بعد آپ کے حلقے میں شریک ہوتے

www.abulhasanalinadwi.org

تھے اور اجازت سے مشرف ہوکر ان ملکوں میں خلقِ خدا کی خدمت اور طریقے کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ آخری دور میں آپ اکثر پاکستان تشریف لے جاتے، آپ کی مقبولیت اور مدینہ طیبہ کی نسبت کی وجہ سے آپ کی ذات کی طرف رجوع عام شروع ہوا اور کثرت سے لوگ آپ کی ذات سے مستفید ہوئے۔

آخری اسفار میں تو یہ حال تھا کہ آپ کی مجلس میں شریک ہونے والوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی، لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز نہیں سنی جاسکتی تھی، معتقدین اور ارادت مندوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ تھا، آپ اصلاح باطن کے ساتھ اصلاح ظاہر کی طرف شدت سے متوجہ تھے، غیر شرعی وضع کی اصلاح اور نصاریٰ و فرنگیوں کے شعائر کے ازالے پر بہت زور دیتے تھے۔

راقم السطور سے خود فرماتے تھے کہ نکٹائیاں اس کثرت سے اتاری جاتیں کہ ٹوکرے بھر بھر کے پھینکنے کی نوبت آتی، صدہا نوجوان اور تعلیم یافتہ حضرات نے اس غیر شرعی وضع اور فرنگیوں کی تقلید سے توبہ کی، داڑھیاں رکھیں اور نماز روزے کے پابند ہوئے۔

راقمِ سطور اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر الفرقان) پر شروع سے مولانا کی عنایت اور نظرِ شفقت رہی، راقم سطور کو ۱۹۴۷ء میں پہلی حاضری کے موقع پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا وہ دن اور آخری دن مولانا کی شفقت میں کبھی فرق نہیں آیا، جب کبھی مدینہ طیبہ کی حاضری کے موقع پر حاضری میں کچھ تاخیر ہوجاتی تو شکایت فرماتے، اشتیاق ملاقات کا اظہار کرتے، غائبانہ بھی شفقت فرماتے رہتے تھے۔

مولانا نعمانی کی تصنیف معارف الحدیث کے سلسلے سے مولانا کو بڑی مسرت تھی، کئی بار اس سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کرتا ہوں، تبلیغی جماعت کے افراد کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اس کام کو بہت سراہتے، تبلیغی جماعت کے اکابر بھی مولانا سے رابطہ رکھتے تھے اور اہتمام سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

اس مرتبہ اپریل کی آخری تاریخوں میں مدینہ طیبہ حاضری ہوئی تو حسب عادت

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا کی خدمت میں حاضری دی، معلوم ہوا کہ دو ہی چار روز پہلے پاکستان سے سخت علیل ہو کر تشریف لائے ہیں، حاضر ہوا تو خود ہی فرمایا کہ سخت علیل ہوں کوئی غذا یا دوا اندر نہیں جا رہی ہے، صرف گلوکوز کے انجکشن سے طاقت قائم ہے، پاکستان کے ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تھا لیکن عمر و نقاہت کے پیش نظر ان کو کامیابی میں تردد تھا، اس لیے مدینہ طیبہ حاضر ہو گیا کہ اگر موت مقدر ہے تو پھر یہیں کہیں نصیب ہو، اس کے بعد حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کی معیت میں حاضری ہوئی، حضرت شیخ سے بہت تعلق کا اظہار کرتے رہے اور بہت بلند کلمات فرمائے، حضرت شیخ پر بھی بڑا تاثر تھا، چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دن اچانک فجر کی نماز کے لیے مسجد نبوی جاتے ہوئے راستے میں ایک دوست نے اطلاع دی کہ رات نصف شب کے قریب مولانا نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

بعد نمازِ فجر متصلاً نماز جنازہ ہوئی، ارادت مندوں اور اہل تعلق کو اطلاع دینے کا نہ وقت تھا اور نہ وہ ذرائع جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن مولانا کی مقبولیت تھی کہ جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کا غیر معمولی مجمع تھا، حضرت شیخ اپنی معذوری کے باوجود اخیر تک شریک رہے، سیدنا عثمان غنیؓ کی قبر مبارک سے کچھ فاصلے پر تدفین عمل میں آئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں، خاص طور پر جو سلسلہ ان کی ذات سے قائم تھا اس کا باقی رہنا موجودہ حالات کے پیش نظر بہت مشکوک نظر آ رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مرحوم کے درجات زیادہ سے زیادہ بلند ہوں اور جو سلسلۂ رشد و ہدایت ان کی ذات سے قائم تھا وہ باقی رہے۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلویؒ

بمبئی میں سکون وراحت کے ساتھ قیام تھا کہ محرم (۱۴۱۶ھ) کی دسویں تاریخ کو (۱۰؍جون کی شب) میں ساڑھے تین بجے یہ عاجز غسل خانے سے وضو کر کے نکلا تھا کہ اس نے دیکھا کہ بھائی اسماعیل منصوری (جو بمبئی کے قیام میں خاص رفیق اور معاون کار رہتے ہیں) ٹیلیفون کا رسیور ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں، ایسے ناوقت ٹیلیفون لیے کھڑے ہونے پر دل ودماغ پر ایک دھکا سا لگا اور پوچھا کہ خیریت ہے؟ انھوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا ''حضرت جی (مولانا انعام الحسن صاحب) کا انتقال ہوگیا'' ایسا معلوم ہوا کہ دل ودماغ پر بجلی گری، راقم اور اس کے رفقاء اور خاص طور پر رفیق عزیز ومکرم مولوی معین اللہ صاحب لرزہ براندام اور ششدر رہ گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ اس خبر کے آنے سے (جو غالباً جوگیشوری کے راستے سے پہنچی جہاں شہر کا بڑا تبلیغی مرکز ہے) دو ہی ایک گھنٹہ پہلے یہ حادثہ پیش آیا۔

۱۸؍جون کو دہلی پہنچے اور تعزیت کے لیے حاضری پر معلوم ہوا کہ رات میں تقریباً ڈیڑھ بجے قلب پر درد کا حملہ ہوا اور راستے میں موٹر پر یا اسپتال پہنچ کر حادثہ پیش آیا، جہاں امراض قلب کے ماہر خصوصی ڈاکٹر خلیل اللہ صاحب نے اس کی اطلاع دی، صبر ورضا بالقضا کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مگر اعصاب پر سخت اثر پڑا، دن میں اگرچہ بمبئی سے جماعت تبلیغ اور اہل تعلق کی اچھی تعداد تدفین میں شریک ہونے اور تعزیت کے لیے ہوائی جہازوں سے روانہ ہوگئی، لیکن یہ خاکسار اپنی صحت کی کمزوری اور معذوریوں کی بنا پر سفر نہیں کرسکا، اس نے اسی روز صبح کو ایک اطلاعی اور تعزیتی پیغام لکھ کر بمبئی کے اردو اخبارات کو اور فیکس کے ذریعے دہلی لکھنؤ کے اخبارات کو بھیج دیا اور عزیز گرامی قدر مولوی زبیر الحسن فرزند حضرت

مولانا انعام الحسن صاحب کے نام لکھ کر حاجی عبدالکریم صاحب کے حوالے کیا۔

یہ پیغام تعزیت واظہار تأثر جو اخبارات میں چھپا یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"خاکسار تقریباً دو ہفتے سے بمبئی میں آرام اور بعض تحریری وتالیفی کاموں کی تکمیل کے لیے مقیم تھا کہ آج شب میں ۳۰:۳/ بجے کے قریب ٹیلیفون کے ذریعہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی امیر جماعت تبلیغ دہلی کی وفات کا اچانک علم ہوا، جو کچھ وقت پہلے عارضۂ قلب میں وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا جن کو اب رحمۃ اللہ علیہ سے یاد کیا اور لکھا جائے گا، اس وقت عالم اسلام کی سب سے وسیع، مقبول، مؤثر اور محیر العقول تحریک ودعوت کے امیر وقائد اور داعی ومبلغ تھے، جس تحریک نے لاکھوں آدمیوں اور ہزاروں گھرانوں اور کنبوں میں دینی واصلاحی اثرات پیدا کر دیے، ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو وقت اور اپنے مشاغل اور مرغوبات کی قربانی دینے پر آمادہ کیا اور ان کو دین کی دعوت پہنچانے، دین سے ضروری واقفیت حاصل کرنے اور اس کے لیے قربانی دینے پر آمادہ کر دیا، ممالک اسلامیہ وعربیہ، ہندوستان، پاکستان، ترکی اور عرب ممالک سعودیہ عربیہ، خلیج مصر وشام، مراکش کے علاوہ یورپ وامریکہ، شمالی جنوبی افریقہ، روس ہر جگہ ان کی جماعتیں اور قافلے نقل وحرکت میں رہتے ہیں اور اس کے اثرات وہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا ایک ممتاز عالم دین بھی تھے، جن کی تفسیر وحدیث وفقہ، نصابی کتابوں اور دینی مآخذ پر گہری نظر تھی، اور عرصے تک انھوں نے درس بھی دیا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت اور رفع درجات فرمائے اور اس مبارک تحریک ودعوت کو ان کا اچھا جانشین اور ذمہ دار عطا فرمائے جو اس کو سرگرم عمل رکھے۔

ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

www.abulhasanalinadwi.org

تبلیغ کی عالمگیر اور انقلاب انگیز تحریک اس کی عظمت و وسعت اور اس کے محیر العقول نتائج بانی تحریک اور داعی اوّل حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے (جن کے حالات و سوانح پر خود راقم کی ایک مفصل و مستند سوانح مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے نام سے موجود ہے) کے نائب و جانشین ان کے فرزند عالی مرتبت مولانا محمد یوسف صاحبؒ (م ۲/اپریل ۱۹۶۵ء) ہوئے، جو اپنے جوش و اثر آفرینی اور مقبولیت میں ان کے صحیح جانشین اور آیۃ من آیات اللہ تھے، اور جو اگر اللہ کو منظور ہوتا اور ان کو طویل حیات ملتی تو اس دعوت و تحریک میں مزید ترقیاں اور زمانے کے جائز اور قدرتی تقاضوں کی تکمیل کا سامان ہوتا اور خطرات اور چیلنجوں کے جواب و مقابلے کا سامان بھی کیا جاتا، وہ آخری دور میں غیر مسلموں کو بھی خطاب فرمانے لگے تھے اور عام انسانیت اور ملک کے مفاد میں بھی ان کی زبان سے مؤثر اور مفید مضامین نکلنے لگے تھے۔

۲/اپریل ۱۹۶۵ء ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ کے بعد جب ان کی لاہور میں وفات ہوئی اور بہ اتفاق آرا حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی جو ان کے رفیق کار اور داعی اوّل حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے خاص معتمد علیہ اور تربیت یافتہ تھے امیر منتخب ہوئے، ان کے زمانۂ امارت اور قیادت میں تحریک نے بڑی وسعت و کامیابی حاصل کی اور وہ دور دراز ملکوں میں پھیلی اور اس نے اپنے اثرات دکھائے، اس میں مولانا انعام الحسن صاحب کی استقامت، روحِ محافظت اور اس جذبے کو بہت دخل تھا کہ یہ دعوت اپنے اصل راستے اور ابتدائے کار کے معمول بہ نظام اور حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے، اس لیے انھوں نے اس کو انھیں حدود اور دائرۂ کار میں رکھا جو ابتدا میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے مقرر کر رکھے تھے اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ بھی اپنے جوش خطابت اور ورودِ مضامین کے ساتھ بالعموم اسی دائرے میں رہتے تھے۔

مولانا کی سوانح حیات اور خدمات پر مستقل تصانیف اور مضامین لکھے جائیں گے، اور اس تیز رفتار و طویل السفر کارواں کو اس منزل پر زیادہ ٹھہرنے اور اس کا حق ادا

www.abulhasanalinadwi.org

کرنے کی استطاعت و مہلت نہیں اور نہ اس سے اس کا حق ادا ہوسکتا ہے، اس لیے یہاں پر اپنی رفاقت اور تعلق کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں ۱۹۳۹ء کے آخر سے جب سے حاضری کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے فرزند گرامی اور بعد میں جانشین اوّل مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور ان کے تربیت یافتہ مجاز و معتمد اور فرد خاندان مولانا انعام الحسن صاحب سے تعارف حاصل ہوا، کچھ علمی و کتابی ذوق، کچھ عمروں کے تقارب، اور کچھ ان دونوں حضرات کی کریم النفسی سے ایک ہی (بالائی) کمرہ میں قیام رہتا تھا، اور علمی ذوق کے اشتراک اور درس و تدریس کی مناسبت کی وجہ سے تبادلۂ خیال، بے تکلف گفتگو اور علمی مذاکرات رہتے تھے، یہ سلسلہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی وفات کے بعد تک جاری رہا، اس قیام اور تبادلۂ خیال اور مذاکرات کی بنا پر اس کا اندازہ ہوا کہ مولانا انعام الحسن صاحب مرحوم کی اچھی علمی نظر اور فنون و درسیات میں ان کو ملکۂ راسخ حاصل ہے، ان سے بعض علمی مآخذ و شروح حدیث کی بعض تحقیقات و معلومات کی نشاندہی بھی ہوئی، جن سے فائدہ بھی اٹھایا گیا، اس کے ساتھ ان کی اخلاقی و خاندانی خصوصیات و مکارم اخلاق کا بھی تجربہ ہوا، الحمدللہ ان سے نیاز مندانہ اور مخلصانہ تعلقات اخیر تک قائم رہے، اور حاضری اور ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، وہ اپنی صحت کی کمزوری، مختلف امراض و عوارض کے باوجود دور دراز کے بیرونی ممالک کے تبلیغی اجتماعات میں شرکت فرمایا کرتے، حجاز مقدس کے سفروں میں بھی جایا کرتے تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کئی بار تشریف لائے اور تبلیغی اجتماعات میں شرکت کی، عام طور پر انھیں کی دعا پر اجتماع کا اختتام ہوتا تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ ورفع درجاتہ۔

مولانا کے جنازہ پر معتقدین اور محبین، کارکنان تبلیغ، اہل شہر، قرب و جوار بلکہ دور دراز کے شہروں (بمبئی، کلکتہ وغیرہ بھی شامل ہیں) کے مخلصین، معتقدین اور کارکنانِ تبلیغ کا ایسا ازدہام ہوا جو برسوں سے نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کی سرزمین پر بھی نہیں دیکھا گیا، راقم نے بمبئی میں پھر لکھنؤ میں اس ازدہام کے بارے میں تفصیلات سنیں، یہ بھی

www.abulhasanalinadwi.org

معلوم ہوا کہ ممالک غیر سے بھی لوگ جہازوں پر بلکہ چارٹر پلین کر کے آئے، لوگ ان کی لاکھوں کی تعداد بتاتے ہیں، یہاں پر مولانا مرحوم کے عزیز قریب اور فرد خاندان مولانا نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی کے مضمون کا وہ حصہ نقل کیا جاتا ہے جو ان کے رسالہ "احوال وآثار" کے اس نمبر میں آیا ہے جو حادثہ کے فوراً بعد نکلا، وہ ایک طرح سے شہادت عینی ہے:۔

"تدفین اور نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ہر طرف سے ہجوم امنڈ پڑے، ہماریوں کے مقبرہ کے قریب نرسری پارک کے وسیع میدان میں نماز جنازہ ہوئی مگر یہ نہایت وسیع میدان بھی آنے والوں کے لیے قطعاً ناکافی ثابت ہوا، چاروں طرف دور دور تک صفیں پھیلی ہوئی تھیں، محتاط اندازوں کے مطابق ڈھائی پونے تین لاکھ افراد جنازہ میں شریک ہوئے، فرط غم سے بے قابو غیر معمولی ہجوم کی وجہ سے تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے تھے، جس کی بنا پر کچھ غلط فہمی ہوئی اور جنازہ کی نماز بہت دیر سے مغرب کے بعد ادا کی گئی اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کے برابر میں تدفین عمل میں آئی"۔ (رسالہ "احوال وآثار" شمارہ محرم ۱۴۱۶ھ، جون ۱۹۹۵ء)

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا عبید اللہ صاحب بلیاویؒ

راقم سطور ۱۹۸۹ء کے دوسرے ہفتے میں جنوبی ہند کے ایک طویل دورے پر تھا، اس کی آخری منزل بنگلور میں ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء (۸ رجب ۱۴۰۹ھ) براہِ دہلی لکھنؤ واپسی کا پروگرام تھا، اور ۱۲ بجے دوپہر کو بنگلور سے ہوائی اڈے کے لیے روانگی ہونے ہی والی تھی کہ ہمارے مخلص وکرم فرما میزبان الحاج موسیٰ سیٹھ صاحب نے اطلاع دی کہ "ابھی دہلی سے ٹیلی فون آیا ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کا اچانک آج صبح انتقال ہوگیا اور بعد نماز ظہر تدفین ہے" قدیمی وقریبی رفاقت، مولانا مرحوم کے کمالات وخدمات اور تبلیغی جماعت ودعوت میں ان کے مقام ومرتبے سے واقف ہونے کی بنا پر دل ودماغ کو اس اطلاع سے صدمہ پہنچا اور تقریباً نصف صدی کا تعلق اور سفروں کی ایسی رفاقت جو بہت کم لوگوں کو بہت کم لوگوں کے ساتھ نصیب ہوتی ہے، حافظے میں تازہ ہوگئی، یہ معلوم کر کے کہ نماز ظہر کے بعد ہی تدفین ہوجائے گی، نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی (جو ایک صاحب تعلق کی آخری آرزو اور سعادت ہوتی ہے) بھی امید نہیں رہی، ہمارا جہاز تقریباً ۳ بجے دہلی پہنچا، اس کے بعد ہی کے جہاز میں ہماری لکھنؤ کے لیے سیٹ تھی، اس لیے اس کا بھی موقع (وقت کی تنگی اور اپنی صحت اور نقل وحرکت کی دقت کی وجہ سے) نہ تھا کہ میں تبلیغی مرکز جا کر امیر جماعت حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اور مرحوم کے ان فرزندوں اور عزیزوں سے (جو اس وقت موجود ہوں) تعزیت کر لیتا، ایک ذہنی کشمکش اور قلبی تاثر کی حالت میں لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگیا، شدید مصروفیتوں اور متعدد

www.abulhasanalinadwi.org

قریب وبعید کے سفروں کی وجہ سے تاخیر سے یہ چند تعزیتی سطریں لکھائی جارہی ہیں کہ دل کا کچھ بار ہلکا ہو اور اس عزیز وقریب رفاقت کی جو ارضِ پاک (حجاز مقدس) اور بلاد عربیہ میں میسر آئی اور جس کی نوبت بہت کم عزیزوں اور رفیقوں کے ساتھ پیش آئی ہوگی، کسی قدر یاد تازہ اور محفوظ ہوجائے، اور ضمناً مولانا کی بعض یگانہ خصوصیتوں اور اوصاف وکمالات کی جھلکیاں بھی قارئین کے سامنے آجائے کہ ان میں دینی دعوت کا کام کرنے والوں اور اہلِ علم وفضل کے لیے مفید سبق اور راہِ دین کے چلنے والوں اور سالکین کے لیے نشانِ راہ اور قابلِ تقلید بلکہ قابلِ رشک عملی کردار کے نمونے ہیں۔

۱۹۴۰ء کے اوائل سے میرا اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت سے ربط وتعلق پیدا ہوا (۱)۔

مرکز نظام الدین میں حضرت مولانا کی خدمت وتربیت اور دعوت کے کام میں رفاقت واعانت میں جو اشخاص نمایاں نظر آئے ان میں ایک نوجوان مولانا عبیداللہ صاحب بلیاویؒ بھی تھے، جو قریب زمانے میں مدرسہ مظاہر العلوم سے فارغ ہوکر مولانا کی خدمت میں سب طرف سے یکسو ہوکر پڑ گئے تھے، مجھے معلوم ہوا کہ طالب علمی ہی کے آخری دور میں مولانا کی ان پر اور ہمارے محترم مولانا سعید احمد خاں صاحب پر خصوصی نظر انتخاب پڑی تھی، اور دونوں نے اسی زمانے سے حضرتؒ سے اور ان کے اس کام سے تعلق پیدا کرلیا تھا، یہاں تک کہ فراغت کے بعد سب طرف سے آنکھیں بند کرکے ان کے قدموں میں آکر پڑ گئے تھے، مولانا کی ان پر شفقت واختصاص کی نظر تھی، خط وکتابت کا زیادہ تر کام مولانا عبیداللہ ہی کے سپرد تھا، اور اہم موقعوں پر وہی بھیجے جاتے تھے، مولانا کی علمی استعداد بہت اچھی تھی، اگر وہ درس وتدریس کا کام شروع کرتے تو ممتاز اور نامور علماء میں ان کا شمار ہوتا، خود میرے ذریعے سے مولانا نے ان کو ایک پیغام پہنچایا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ

---

(۱) جس کی تفصیل کتاب ''حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت'' کے مقدمہ میں اور ''کاروانِ زندگی'' کے حصہ اول باب نہم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ان کو اس تحریک و دعوت کا ایسا سرمایہ سمجھتے ہیں، جو اسی کام کے لیے وقف ہے اور رہے گا۔

مولانا کو اس کی بڑی آرزو تھی کہ اگر ہندوستان کا کام کچھ جم جائے تو اپنے چند مخصوص رفقاء کے ساتھ اسلام کے اصل مرکز (حجاز مقدس) جا کر اس کام کی دعوت دیں اور وہاں اس کو شروع کریں کہ یہ وہیں کی سوغات ہے، اور انہیں کے ذریعہ یہ دولت عالم اسلام میں گھر گھر بٹ سکتی ہے، اس سلسلے میں خود حضرت نے ایک مرتبہ تنہائی میں مجھ سے اس کام میں رفاقت و اعانت کے لیے جن کے نام لیے ان میں مولانا عبید اللہ صاحب، مولانا سعید احمد خاں صاحب اور مولوی نور محمد صاحب میواتی کا نام تھا، اور یہ ان کی فراستِ ایمانی اور روشن ضمیری تھی کہ انہیں اول الذکر دونوں رفقاء نے حجاز میں سالہا سال قیام کیا، اور انھیں کے ذریعہ وہاں کام کا تعارف ہوا اور اس کی بنیاد پڑی۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات کے بعد حضرت کا یہ جذبہ اور تمنا دوسرے خصائص کی طرح ان کے فرزند و جانشین مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف منتقل ہوا، ۱۹۴۵ء میں انھوں نے جماعت کے بعض خواص کو حجاز روانہ کیا، ۱۹۴۶ء میں مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کو حجاز کے قیام اور وہاں کے کام پر متعین فرمادیا، انھوں نے وہاں بڑے سلیقے، صبر و تحمل اور مجاہدے کے ساتھ کام کیا، اور وہاں اس ایثار و قربانی اور زہد و توکل، حرمین کے قیام سے روحانی استفادہ، اور ساکنین حرم کے احترام اور مرتبہ شناسی کا وہ ثبوت دیا جو وہی لوگ دے سکتے ہیں، جنھوں نے کسی شیخِ کامل کے دامنِ عاطفت میں تربیت حاصل کی ہو اور جس کے اخلاق، اور رفتار و گفتار کی ایک بلند دینی اور روحانی ماحول میں تشکیل ہوئی ہو، اور وہ اس سرزمینِ مقدس پر قیام کو اپنے لیے مبارک اور مسعود بھی سمجھتا ہو اور اس کی عظمت و نزاکت کی وجہ سے ایک نازک امتحان بھی باور کرتا ہو۔

لیکن کام شروع ہونے کے ایک سال بعد تک وہ مہاجر اور ہندوستانی حجاج

میں محدود رہا، مولانا عبید اللہ صاحبؒ نے اپنے اخلاق وتواضع اور اہلِ دین واہل علم کے اکرام، حرم اور اہل حرم کے شایانِ شان احترام کی بنا پر عرب عوام کو کام سے روشناس اور ایک حد تک مانوس کر دیا تھا، اور بہت سے اہل علم اور واقف حضرات ان کی بے نفسی، تواضع اور اخلاص واخلاق کے نہ صرف معترف بلکہ گرویدہ بن گئے تھے، مولانا عبید اللہ صاحب اپنے دعوتی جذبے اور اپنی قوت مطالعہ اور حقیقت پسندی کی بنا پر کچھ عرصے میں یہ محسوس کرنے لگے کہ اس دعوت کو حجاز کے تعلیم یافتہ طبقے اور علمی حلقوں میں بھی پہنچنا چاہیے اور وہاں کے نوجوانوں، اہلِ علم اور اہلِ ذوق کو بھی اس سے مانوس اور اس کا گرویدہ بنانے کی ضرورت ہے، مولانا عبید اللہ صاحب نے اسی دعوتی فکرمندی اور خلوص کی بنا پر مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی خدمت میں پے در پے خطوط لکھے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں ان کی مدد کے لیے کچھ عرصے کے لیے مجھے حجاز کے قیام کرنے پر آمادہ فرمائیں، وہ میرے ادبی اشغال کو جانتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ہونے والی ایشیائی کانفرنس دہلی میں پیش کیے جانے والے میرے مقالہ "إلی ممثلی البلاد الإسلامية" کا بھی ان کو علم تھا، مولانا محمد یوسفؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے مجھے سفرِ حجاز کے لیے آمادہ کر لیا اور میری رفاقت کے لیے عزیز گرامی مولوی سید محمد ثانی مرحوم (مصنف سوانح یوسفی) کا انتخاب کیا، تاکہ میں (جو مستورات کے ساتھ سفر پر جا رہا تھا) دعوت کے کام کے لیے وقت نکال سکوں اور خانہ داری اور انتظامات کی مصروفیت سے آزاد ہوں، حجاز پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنی سرگرمی، بے نفسی اور خلوص اور دینی سیرت واخلاق کی بنا پر دعوت کے کام کے لیے بہت کچھ زمین تیار کر لی ہے، اور ان لوگوں کے دلوں میں جن کو ذرا بھی اس کام سے سابقہ اور ان کی ذات سے رابطہ رہا ہے، ان کے لیے عزت وعقیدت کے جذبات ہیں، ۲/رمضان المبارک سے لے کر ۲۰/ذی القعدہ تک قیام مدینہ طیبہ رہا، وہاں مدرسہ

علوم شرعیہ کے ایک مکان میں عربوں کا اجتماع ہوتا تھا، راقم اور مولانا عبید اللہ صاحب اس میں دعوت کے تعارف وترجمانی کا فرض انجام دیتے تھے، حوالیِ مدینہ میں بھی گشت ہوتے تھے، اور اطراف ونواح میں بھی جماعتیں جاتی تھیں، اس پورے نظام میں مولانا عبید اللہ صاحب ہی امیر جماعت اور ایک تجربہ کار قائد کی طرح رفاقت ورہنمائی فرماتے تھے، اس سلسلے میں کہیں اپنی ذات کو نمایاں کرنے اور خود نمائی اور احساس برتری کا شائبہ بھی دیکھنے میں نہیں آتا تھا، جو اچھے اچھے دینی کارکنوں اور روحانی مرکزوں میں رہنے والے تربیت یافتہ حضرات میں بھی ایک نادر ونایاب صفت ہے۔

ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) میں حضرت مرشدنا مولانا عبد القادر صاحبؒ رائے پوری کی ہمرکابی میں راقم سطور اپنے چار عزیز رفیقوں اور ندوی فضلاء کے ساتھ حج ودعوت دونوں مقاصد کے لیے عازمِ حجاز ہوا، اس دو سال کی مدت میں وہاں کا تبلیغی کام کچھ اور وسیع اور متعارف ہوگیا تھا، لیکن حجاز کا علمی وادبی حلقہ اب بھی اس سے یا تو بے تعلق تھا یا اجمالی واقفیت اور تحسین واعتراف سے آگے نہیں بڑھا تھا، لیکن مولانا عبید اللہ صاحب کی گہری اور راسخ دینداری، اخلاص وانہماک اور زاہدانہ زندگی پر سب کا اتفاق تھا، مجھے زمانۂ قیام میں معلوم ہوا کہ عسر وابتلا کے اوقات بھی ان پر گزرے ہیں اور ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اسی زمانۂ قیام میں حافظ سید محمود صاحب نائب مدیر مطبعۃ الحکومۃ اور حجاز کے معروف ادیب ومحقق شیخ احمد عبد الغفور عطار کے ذریعے (جنھوں نے بستان بخاری میں مکہ معظمہ کے ادیب، اہل قلم، صحافی اور محکمۂ تعلیم کے متعدد نوجوان عہدہ داروں کے مجمع کرنے کا سامان کیا اور ان کو کھانے پر بلا کر باہمی تعارف وتبادلۂ خیال کا موقع بہم پہنچایا تھا) پہلی بار یہ دعوت، علمی وادبی حلقے میں اونچی سطح سے پہنچی اور اسلامی ودعوتی جذبہ رکھنے والے عرب ادباء اور اہل قلم نے اس کو وقعت وقدر کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا، اس پیش رفت میں مولانا عبید اللہ صاحب کا وسیع ذہن حقیقت پسندی اور دعا وتوجہات کا بڑا حصہ تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

حجاز کے قیام ہی میں اس کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں کے علمی وادبی حلقے میں اس وقت تک کسی دعوت وفکر کی صحیح وقعت نہیں پیدا ہو سکتی اور وہ اس کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھ سکتے، جب تک کہ وہ مصر کے راستے سے نہ آئے (جس کی حیثیت اس جدید طبقے کی نگاہ میں وہی تھی جو-بلاشبہ اور معذرت کے ساتھ- انگریزی دورِ اقتدار میں جدید طبقہ میں ولایت (انگلستان) کو حاصل تھی کہ وہاں کی آئی ہوئی ہر چیز کو سند اور سکۂ رائج الوقت سمجھا جاتا تھا) اس بنا پر جو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر سامنے آئی، میں نے اپنے دو عزیز رفیقوں مولوی قاضی معین اللہ ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی کے ساتھ جو سال ڈیڑھ سال سے دعوت کا کام کر رہے تھے، مصر کا سفر طے کر لیا، جس کی تائید اور اس سلسلے میں اعانت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے خطوط اور نقود کے ساتھ کی، ۱۲؍ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ، ۲۰؍جنوری ۱۹۵۱ء کو ہم تینوں بحری جہاز سے قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے، قاہرہ میں ہمارا قیام ساڑھے چار مہینے رہا، اس سفر کا پورا ''روزنامچہ'' ملاقاتوں کی کیفیت، تقریروں کے خلاصے مختلف حلقوں سے تعلق وارتباط، دینی دعوت وہندوستان کے تعارف کی پوری کہانی راقم کی کتاب ''مذکرات سائح في الشرق العربي'' اور اس کے اردو ترجمہ ''شرق اوسط کی ڈائری'' میں آگئی ہے۔

مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی جو اسی زمانے میں ایک دعوتی دورے پر سوڈان گئے ہوئے تھے، ہمارے پہنچنے کے دو ہی تین دن بعد قاہرہ پہنچے اور ہم لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے، چند دن ہمارا قیام ''العتبة الخضراء'' کے ہوٹل ''فندق البرلمان'' میں رہا، اس کے بعد ہم لوگ ایک دینی انجمن کے دفتر میں جو ''السكة الجديدة'' (سوق الصبارفة) کی ایک بالائی منزل پر تھا، قیام پذیر ہو گئے، فرشِ زمین پر ہم چاروں ساتھیوں کی رہائش تھی، بستر سے بستر ملے ہوئے تھے، ایک چھوٹے سے کمرے میں قیام، بازو کے چھوٹے سے کمرے میں جس سے زینہ ملا ہوا تھا، ہمارے ساتھی کھانا تیار کرتے تھے، یہ ہماری قیام گاہ

www.abulhasanalinadwi.org

تھی، جس کا وہ معزز زائرین، اہل علم جنھوں نے میری کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پڑھی تھی، اور جن کے سامنے ہندوستان کے ایک بین الاقوامی شہرت والے ادارۂ ندوۃ العلماء کا نمائندہ اور معتمد تھا، تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ ان ترقی یافتہ ملکوں میں باہر سے آنے والے مہمانوں اور نمائندوں کی حیثیتِ عرفی کا تعین اس ہوٹل کے درجے اور مرتبے سے کیا جاتا ہے، جہاں وہ قیام کرتے ہیں، مولانا عبید اللہ صاحب اپنے ان تینوں ساتھیوں کے ساتھ ایسے گھلے ملے رہے کہ ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے علمی و دینی ماحول، بلند مرتبہ دانش گاہ (مدرسہ مظاہر علوم) کے ممتاز فاضل اور اپنے وقت کے سب سے بڑے داعی (حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) کے معتمد خاص ہیں، وہ ہر گفتگو میں مساویانہ، بے تکلفانہ حصہ لیتے، ممتاز شخصیتوں سے ملاقات کے لیے نہ صرف ساتھ جاتے بلکہ گفتگو کے دوران اہم باتیں نوٹ بھی کرتے جاتے تھے، جن کی مدد سے میں نے اس سفر کا عربی روزنامچہ "مذکرات سائح" تیار کیا، اہم جلسوں اور مجالسِ مذاکرہ میں راقم ہی اظہارِ خیال کرتا، ان کو کسی وقت اس کا خیال نہیں آتا تھا کہ مجھے بھی اس کا موقع دیا جائے، اور میری بھی صلاحیتوں کا اظہار ہو، یہ اخلاص و بے نفسی کا ایک ایسا مظاہرہ تھا، جس میں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، عارفین کا قول ہے کہ امراضِ نفسانیہ میں جو چیز سب سے آخر میں نکلتی ہے وہ "حب جاہ" ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ چیز ان کے دل سے یک دم نکل گئی ہے۔

اس سفر میں مصر میں ہم لوگوں نے دو ایک خالص تبلیغی سفر بھی کیے اور بعض اہم مقامات مثلاً "المحلة الکبریٰ، طنطا، عزیزیہ" وغیرہ جانا ہوا، وہاں کہیں کہیں ہم لوگوں کے اصرار سے انھوں نے بھی اظہار خیال فرمایا، میرے ذہن کی رعایت کے ساتھ (جو علماء، ادباء کے حلقے میں تبلیغ کے حدود اور نمبروں سے آزاد ہو کر مخاطبین کے ذہن و ذوق، زبان، واسلوب اور وقت کے تقاضوں کے مطابق خطاب کرتا) مولانا عبید اللہ صاحب اپنے کو اسی

www.abulhasanalinadwi.org

تبلیغی نظام اور دائرہ میں محدود رکھتے جس کو انھوں نے مرکز نظام الدین میں اخذ کیا تھا، اور جس کی افادیت کا انھیں یقین تھا، اس اختلاف ذوق کے باوجود ہم دونوں میں کبھی ناگواری یا بحث کی نوبت نہ آتی، بلکہ ان کی طرف سے احترام واعتراف ہی کا اظہار ہوتا وہ ہر جگہ اور ہر حال میں اپنے معمولات ذکر وتہجد کے پابند رہتے اور ہماری چھوٹی سی قیام گاہ ان کی موجودگی اور ہم خیالی کی وجہ سے ایک چھوٹی سی خانقاہ معلوم ہوتی۔

۲۸؍شعبان ۱۳۷۰ھ (۳؍جون ۱۹۵۱ء) کو راقم سطور اور مولانا عبید اللہ صاحب سوڈان کے لیے روانہ ہوئے، رمضان کا چاند دریائے نیل کے سفر جہاز پر دیکھا اور تراویح اور جماعت کی توفیق ملتی رہی، سوڈان پہنچ کر الخرطوم البحری میں دس روز قیام رہا، سفر کی بڑی غرض سوڈان کے مشہور دینی وروحانی قائد سید میرغنی پاشا کی ملاقات اور ان کے ذریعے سے سوڈان میں تبلیغی دعوت کا آغاز وسلسلہ شروع کرنا تھا، سوڈان میں سخت گرمی کے ایام تھے، پھر بھی ہم نے مختصر قیام سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، جس میں مولانا عبید اللہ صاحب کی رفاقت اور ان کے خلوص وصلاح کو بھی دخل تھا، ۱۲؍رمضان ۱۳۷۰ھ (۱۷؍جون ۱۹۵۱ء) کو ہم قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں سے بذریعۂ طیارہ دمشق پہنچے، شام کی کل مدتِ قیام ۲۸ روز اور دمشق کی مدت قیام ۲۴ دن تھی، شہر کا ہوٹل یا کسی کرم فرما کا مکان، ہم دونوں پہلو بہ پہلو رہے، دمشق سے بیت المقدس اور الخلیل جانا ہوا، بیت المقدس میں قیام سفیر افغانستان شیخ محمد صادق مجددی مرحوم کی مہربانی سے (جو مسجد اقصیٰ میں معتکف تھے) انھی کی قیام گاہ میں ہوا، واپسی پر حمص، حماۃ، معرۃ النعمان، حلب اور ترکی کے حدود "حارم" تک جانا ہوا، ترکی کا بھی ارادہ تھا، مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر ملتوی کرنا پڑا، مولانا عبید اللہ صاحب اس پورے سفر میں ایک دن کے لیے بھی ہم سے جدا نہیں ہوئے، اور کہیں انھوں نے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور اپنی موجودگی کا ثبوت دینے کی کوشش نہیں کی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک رفیق اور معاون کی حیثیت سے شریکِ سفر ہیں، یہ تواضع اور ایثار اس

طرح اور اہم ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک ممتاز عالمِ دین تھے، بلکہ ایک مستقل الفکر داعی دین اور اپنے وقت کی عظیم ترین دعوت (تبلیغ) کے مستند ترجمان اور اس کے داعی اول کی زبان بھی تھے۔

مشرق وسطیٰ کے اس طویل سفر کی واپسی پر مولانا عبیداللہ صاحب کا کئی سال حجاز میں قیام رہا، اور وہی دعوت و جماعت کے امیر و ذمہ دار تھے، پھر مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے مشورے سے وہ مرکز تبلیغ نظام الدین بلا لیے گئے، اور ان کے رفیق کار اور "ثانی اثنین" مولانا سعید احمد صاحب (ساکن کھیڑا افغان ضلع سہارن پور و حال مقیم رائیونڈ پاکستان) حجاز میں جماعت کے امیر و ذمہ دار قرار پائے اور انھوں نے اسی طرح اصول اور معیار کے ساتھ جس کی بنیاد مولانا عبیداللہ صاحبؒ نے ڈالی تھی، دعوت و جماعت کی قیادت کی، یہاں تک کہ چند حالات و اسباب کی بنا پر ان کو بھی برِ صغیر ہند و پاک آنا اور اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانا پڑا۔ وللہ الأمر من قبل و من بعد.

مولانا عبیداللہ صاحب سالہا سال سے بعض عوارض اور جسمانی فربہی کی وجہ سے نقل و حرکت سے تقریباً معذور ہو گئے تھے، لیکن ایسی حالت میں جب وہ دوسروں ہی کی مدد سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے تھے، ملک و بیرون ملک کے درجنوں سفر کیے، مرکز میں بھی وہ اپنے ارشادات و ہدایات سے واردین و صادرین کو مستفید فرماتے رہتے تھے، آخر میں باندہ کے ایک تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لیے باندہ تشریف لے گئے، واپسی میں اپنے قدیم تعلق و روابط کی بنا پر (۱) مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اترے، اساتذہ اور عملۂ دارالعلوم کے ایک خصوصی اجتماع میں خطاب خاص اور دارالعلوم کی مسجد میں خطاب عام فرمایا۔

افسوس ہے کہ راقم اس زمانے میں جنوبی ہند کے سفر میں تھا، اس آخری ملاقات اور خطاب سے محروم رہا، یہاں سے واپس جانے کے ایک ہفتے کے بعد ہی انھوں نے داعیِ

---

(۱) مولانا نے اپنے دو فرزندوں مولوی عبدالرشید اور مولوی عبدالرحیم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم بھی پائی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اجل کو لبیک کہا کہ اور جس آستانے پر وہ کشتیاں جلا کر بیٹھے تھے، جان جان آفریں کے سپرد کی اور ان کو یہ شعر پڑھنے کا حق ہوا ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

رحمہ اللّٰہ رحمۃ الأبرار ورفع درجاتہ فی الصالحین والأخیار۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ

۲۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ (۲۸؍اگست ۱۹۹۷ء) کو عالم ربانی، داعی الی اللہ مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی کی وفات کا حادثہ پیش آیا، راقم کو مولانا سے جو عقیدت ومناسبت اور مولانا کو راقم سے جو تعلق ومحبت تھی وہ معاصرین میں دو الگ الگ شخصیتوں کے درمیان مشکل سے ہوگی، اس کے بارے میں مولانا اپنے آخری عنایت نامہ میں لکھتے ہیں (جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا محمد منظور نعمانی کی نماز جنازہ پڑھانے کی معذرت میں لکھا) کہ "اس وقت حضرت مولانا کی عقیدت وعظمت جو اس ناکارہ کے دل میں ہے اس کو سب پر فوقیت اور اولیت حاصل ہے، اور یہی زندگی کا سرمایہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کو آخر وقت تک باقی رکھے۔ (مکتوب ۴؍محرم ۱۴۱۸ھ)

وہ کچھ عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے اور لکھنؤ کے سحر نرسنگ ہوم میں داخل تھے، راقم سطور ان کی عیادت اور زیارت کے لیے ۲۸؍اگست ہی کو وہاں حاضر ہوا، اسی دن تھوڑی دیر کے بعد مدرسہ سید احمد شہیدؒ واقع کٹولی میں "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ" کے موضوع پر تقریر کرنی تھی، اس لیے کچھ دیر ٹھہر کر وہ وہاں چلا گیا، وہیں ایک دو گھنٹے بعد اچانک ان کی وفات کی اطلاع ملی، راقم وہاں سے لکھنؤ واپس ہوا، اس کو خیال تھا کہ وہیں دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کی نماز جنازہ ہوگی جس میں وہ شرکت کرے گا، لیکن لکھنؤ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کو اپنے وطن ہتھورا لے جایا گیا، جہاں ان کا قائم کیا ہوا مدرسہ اور خاندان، تلامذہ اور اہلِ تعلق تھے، راقم اپنی وجعِ مفاصل کی تکلیف اور کمزوری کی وجہ سے وہاں نہیں جاسکا، لیکن عزیز القدر مولوی سید محمد رابع ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اور ان کے رفقاء سے جو تدفین

www.abulhasanalinadwi.org

میں شریک ہوئے معلوم ہوا کہ وہاں ہزاروں ہزار کا مجمع تھا اور سواریوں، موٹر لاریوں اور ٹرکوں کا اتنی دور تک اجتماع تھا کہ ایک طویل مسافت پیدل طے کرنی پڑی، بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا، بعد کی اطلاعات اور خبروں سے اندازہ ہوا کہ عرصۂ دراز سے کسی عالم یا بزرگ کی نماز جنازہ اور تدفین میں اتنی جمعیت اکٹھا نہیں ہوئی، یہ قاری صاحب کی مقبولیتِ عام اور خدمت خلق کا نتیجہ تھا جس سے غیر مسلم بھی متاثر اور معتقد تھے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ۲۵ ربیع الثانی ۳۰ اگست ۱۹۹۷ء کو تعزیتی جلسہ ہوا، راقم نے وہاں ایک پر تاثر اور پر تاثیر تقریر کی جو یہاں نقل کی جاتی ہے کہ اس سے قاری صاحبؒ کے کمالات اور ان پر انعامات خداوندی اور توفیق الٰہی کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ". (آل عمران:۷۹)

رفقائے کرام اور طلبائے عزیز! میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی، یہاں مسجد کی طرف آتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا القا ہوا، اور اس سے زیادہ موزوں، دور رس اور اس سے زیادہ مفید اور قابل غور تمہید نہیں ہوسکتی، اور کوئی ایسا جامع جملہ نہیں کہا جاسکتا، قرآن مجید کی یہ آیت بھی ایک مستقل معجزہ ہے، بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ولکن کونوا ربانیین" لیکن تم اللہ والے بنو، پھر اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے "ربانیین" کا لفظ استعمال کیا، اس میں تربیت بھی داخل ہے، یعنی وہ عالم جو ایک طرف رب سے تعلق رکھتا ہو اور دوسری طرف اس کو ایمان واحتساب کا درجہ حاصل ہو، یعنی وہ دعوت وتربیت اور اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

میں عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں جانتا کہ کوئی لفظ اتنا جامع ومعنی خیز اور ایسا توجہ طلب اور نظر افروز ہوسکتا ہے، علمائے امت اور علمائے اسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ "ربانیین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے "اللہ والے بنو" لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات میں "رب" کا لفظ انتخاب فرمایا گیا کہ ایسے علماء بنو جن کے اندر تربیت کا مادہ ہو اور تربیت کی

www.abulhasanalinadwi.org

صلاحیت بھی ہو، انھیں کو علمائے ربانیین کہتے ہیں، پھر اس کے بعد فرمایا کہ "بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ" کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دو، اس کے ساتھ "تدرسون" کا لفظ بھی لگایا گیا جو ہمارے اور آپ سب کے لیے قابل غور ہے کہ عالم ربانی، عالم کامل اور باکمال بن جانے کے بعد بھی ضرورت ہے کہ مطالعہ جاری ہے، استفادہ اور علمی سفر جاری رہے، علمی ترقی جاری رہے، یہ آیت تو قیامت تک پڑھی جانے والی آیت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت تک اس امت میں علماء کو پیدا کرتا رہے گا اور پھر روحانی تربیت کرنے والے اور پھر دینی تعلیم دینے والے اور پھر دین کے لیے کوشش ومجاہدہ کرنے والے بھی پیدا فرماتا رہے گا، اس لیے ایک ایک لفظ معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قرآنی بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔

آج ہم جس ہستی کو یاد کرنے کے لیے اور اپنی عقیدت ومحبت کا خراج پیش کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت اور رفع درجات کی دعا کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، اس کے لیے یہ آیت القا ہوئی، یہ تعریف ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لیے ہدایت کی بات بھی ہے، ہمارے لیے یہ آیت ایک پوری پوری دعوت اور ایک پوری کتاب ہے۔

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ جس زمانے میں مظاہر علوم میں پڑھتے تھے، پچاس ساٹھ برس پہلے یا اس سے زائد مدت ہوگی، میں جب حضرت رائے پوریؒ کی زیارت کے لیے جایا کرتا تھا تو سہارن پور ٹھہرتا ہوا جاتا تھا، واپسی میں ٹھہرتا تو مظاہر علوم بھی جاتا تھا، اس وقت ہمارے تعلق والے تین عزیز تھے، ایک ہمارے عزیز بھانجے مولوی سید محمد ثانی حسنی مرحوم اور ایک ہمارے یہاں دارالعلوم کے بڑے کارکن بننے والے مولوی سید محمد مرتضیٰ مرحوم بستوی اور ایک مولانا قاری صدیق احمد صاحب، یہ تینوں اکثر ساتھ ہی ملتے تھے، وضو کر رہے ہیں تو دیکھا تینوں ساتھ ہی وضو کر رہے ہیں، نماز میں کھڑے ہوتے تو تینوں ساتھ ہی کھڑے ہوتے ہیں، مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کے یہاں التزاماً جایا کرتا تھا، ان سے مولانا صدیق صاحب کا روحانی تعلق تھا، انھیں سے وہ مجاز تھے، تو مظاہر علوم میں ان تینوں سے ساتھ ساتھ ملاقات ہوتی تھی، ان سے اس وقت سے تعارف رہے، اس کے بعد فارغ ہو کر نکلے تو پھر انھوں نے پہلے تو فتح

پور کے مدرسے میں جو مولانا سید ظہور الاسلام صاحب ؒ کا قائم کیا ہوا تھا، مولوی عبد الوحید صاحب فتح پوری (۱) اس کے اس وقت مہتمم تھے، وہاں کچھ عرصے تک پڑھاتے رہے، فتح پور سے ہمارا قریبی تعلق بھی ہے، جوار کا بھی تعلق ہے، وہاں جاتے تھے تو اس مدرسے میں حاضر ہوتے تھے، وہاں مولانا قاری سید صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوتی تھی، وہ بہت خصوصیت کے ساتھ ملتے تھے، پھر اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے اپنے وطن ہی کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا اور مدرسہ قائم کیا، صرف قائم ہی نہیں کیا بلکہ مدرسے کے ساتھ انھوں نے عام مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت اور اس کی دعوت کو اپنا فرض سمجھا، اور یہی مدارس کی حقیقت اور ان کا اصل فریضہ ہے، مدارس کے نظام جزیرہ نہیں بن سکتے، جو مدارس جزیرہ بن جاتے ہیں وہ ڈوب جاتے ہیں، مدارس کے لیے ضروری ہے کہ وہ باہر سے اپنا تعلق رکھیں اور یہ سمجھیں کہ باہر کی فضا اور باہر کا ماحول اگر ٹھیک نہ ہو تو ان مدارس کا بھی قائم رہنا مشکل ہوگا، وہ جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتے، کوئی بھی چیز دنیا میں جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتی، جب تک کہ وہ اپنے اثرات کو پھیلائے نہیں اور ایسا ماحول نہ پیدا کرلے جو اس کے لیے مناسب ہو، اس کے لیے مفید ہو۔

حضرت قاری صاحب کی بصیرت و شرح صدر اور توفیق الٰہی کی بات تھی کہ انھوں نے دونوں کام ایک ساتھ شروع کیے، ایک طرف مدرسہ اور دوسری طرف آس پاس کی بستیوں سے، اس کے شہروں سے رابطہ قائم کرنا اور بار بار جانا اور دعوت کا کام کرنا اور دینی جلسوں میں شریک ہونا اور ان کو صحیح عقیدہ اور اصلاح نفس کا پیغام دینا، اس سے ان کی مصروفیت اتنی بڑھی، ان کے مجاہدے اتنے بڑھے کہ بعض مرتبہ مجھے بھی اس تعلق کی بنا پر جو ان کی ذات سے تھا اور ان کا ہمارے خاندان والوں سے تھا (اور حضرت سید احمد شہیدؒ سے تو ان کو بڑا تعلق تھا) تو اس بنا پر بھی اور پھر ان کی افادیت اور ان کی زندگی کی قیمت کی بنا پر بھی میں نے بعض مرتبہ پیغام بھیجا کہ آپ اتنا دور دراز کا سفر کرتے ہیں اور جفاکشی کرتے ہیں اور احتیاط نہیں کرتے، یہ مناسب نہیں، ان کا یہ حال تھا کہ بالکل اس بارے میں وہ مجذوب الفکر تھے، مجذوب الحال

---

(۱) افسوس کہ ۹/رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ (۹/جنوری ۱۹۹۸ء) انھوں نے وفات پائی۔ غفر اللہ لہ ورفع درجاتہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، وہ اس کی پروانہیں کرتے تھے کہ ان کو کیسا تعب ہوگا اور ان کی صحت پر کیا اثر پڑے گا، ان کی صحت پر اثر پڑا، حقیقت میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ علمائے ربانیین میں تھے "ولٰکن کونوا ربانیین" کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کی تعلیم کا بھی کام لیا اور دین کی اشاعت کا بھی اور اصلاح کا بھی اور شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے کا، رسوم و بدعات جو مسلمانوں کی زندگیوں میں شامل ہوگئی ہیں، اس کے خلاف تقریر کرنا، لوگوں کو متوجہ کرنا، بڑے انہماک اور تندہی بلکہ ایک طرح سے جو مدہوشی ہوتی ہے اپنی صحت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے، ان سب سے بے پروا ہوکر، عبادت سمجھ کر یہ کام کرتے تھے اور جو چیز ان کی امتیازی ہے وہ ایمان اور احتساب ہے اور یہی ربانیین کے لیے ضروری ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اللہ کی رضا ہی کے لیے کیا جائے، اللہ کی قدرت اور اعانت پر یقین کرتے ہوئے اور اجر وثواب کے لالچ سے کیا جائے، یہ بات اس وقت ادنیٰ تنقیص کے بغیر اپنے مطالعہ وواقفیت حدود میں کہتا ہوں کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جس درجے کا مخلص، جس درجے کا فکرمند، جس درجے کا سرفروش اور اپنی زندگی وصحت کو خطرے میں ڈالنے والا دیکھا ایسا بہت کم دیکھا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کی وفات پر اس مقبولیت عامہ کا اظہار ہوا، جو عرصے سے کسی ہستی کے بارے میں ہمارے علم میں نہیں آیا، اللہ کے یہاں کس کا کیا درجہ ہے اللہ جانتا ہے اور اسی کا اعتبار ہے۔

میرے عزیزو! ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ان کی زندگی پر غور کریں کہ ان کو مقبولیت کیوں حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کو یہ مقام کیوں ملا، اور ایک عالم کو، ایک دینی مدرسے کے فارغ کو، کس کو اپنا مقتدیٰ بنانا چاہیے اور کیا اس کو طرز اختیار کرنا چاہیے اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور اس جامعیت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے کہ ایک طرف تو علم راسخ ہو، علوم نبویہ پر پورے طور پر قدرت ہو، استحکام ہو، اتقان ہو، اتقان علمی ہو، پھر اس کے ساتھ ساتھ عمل ہو، عالم کے شایان شان جو عمل ہے، جو ذوق عبادت ہے، جو ذوق طاعت ہے اور جو ایمان واحتساب کا مادّہ ہے وہ پیدا ہونا چاہیے کہ آج ہم اللہ کی رضا کے لیے پڑھ رہے ہیں اور ہم یہاں سے فارغ ہونے کے بعد دین کا کام کریں گے، یہ نہیں کہ پڑھ کر نکلے، خلیج چلو، دبئی چلو، شارقہ چلو، سعودی عرب چلو، نام تو حج وعمرے کا، لیکن مقصود یہ ہو کہ کہیں جگہ

مل جائے اورمل جاتی ہے، کوئی صاحب کسی سفری ایجنٹ کے یہاں کام کررہے ہیں، کوئی صاحب دواؤں والی دوکان میں کام کررہے ہیں اور کچھ نہیں تو مسجد کے موذن بن گئے، خطیب بن گئے، یہ اس علم کی قیمت نہیں، یہ "کونوا ربانیین" کے انداز کی بات نہیں، یہ اس کے خلاف ہے "کونوا ربانیین" یہ ہے کہ آپ نیت کریں کہ آپ یہاں سے نکلنے کے بعد قاری صدیق صاحبؒ کے نقش قدم پر چلیں گے، اور علمائے ربانیین کے جوان سے پہلے کے ہیں یا ان کے زمانے کے تھے یا اب بھی ہیں، خدا کے فضل سے دنیا خالی نہیں ہے، ہندوستان بھی خالی نہیں ہے۔

یاد رکھیے انحراف اور تحریف دو چیزیں ہیں، ایک انحراف ہے اس کا تعلق عوام سے ہے، اور تحریف کا تعلق ذی علم سے ہے اور انحراف و تحریف دونوں سے حفاظت کا کام ہر ملک میں تقریباً انجام پایا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو اس کی توفیق دی، یہ کام مغرب اقصیٰ میں بھی ہوا، مراکش، الجزائر میں بھی ہوا، یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو توفیق دی، انھوں نے دینِ صحیح کی دعوت دی، اور قرآن مجید کی آیات اور معجزات قرآنی اور محکمات کی وضاحت کی اور جو حدیث کے تربیتی پہلو ہیں، ان سب کو ثابت کیا۔

بس میرے عزیزو! آپ کو علمائے ربانیین کا نمونہ بننا چاہیے، دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کتنا کام لیا اور اب کس طرح مقبولیت ظاہر ہوئی، اور خدا جانے کتنے بڑے بڑے مفکر ادیب و شاعر گزر گئے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ انتقال کہاں ہوا، کہاں مرے، ایک تو اللہ کے بندے وہ ہیں جو اگر غار کے اندر ہوں یا پہاڑ کی چوٹی پر، اللہ تعالیٰ ہزاروں لاکھوں کو ان کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، اور پھر جو ان کے لیے دعائے مغفرت ہوتی ہے، جو ایصال ثواب ہوتا ہے جو محبت کی جاتی ہے جو عقیدت ہوتی ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں، بس آپ اس سے فائدہ اٹھایئے اور عبرت حاصل کیجیے اور یہ اعجاز قرآن مجید کا، قیامت تک رہنے والی کتاب کا ہے کہ تعلیم کے ساتھ درس بھی ہو، پڑھنا بھی چاہیے، پڑھتے بھی رہو، سکھاتے بھی رہو تو فائدہ پہنچے گا، بس اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ قاری صاحب کے لیے دعا بھی کرتے ہیں۔ اپنے طور پر بھی ایصال ثواب کریں۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

چند نامور معاصرین
و
قائدینِ ملت

- مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ
- مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ
- مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ
- مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ
- شاہ فیصل شہیدؒ
- جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ
- نواب صاحب چھتاریؒ

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاریؒ

(متوفی ۱۹۴۰ء)

عربی میں علمی تبحر وامتیاز اور دینی علوم وفنون میں توسع واتقان رکھنے والے کے لیے (عربی زبان کی وسعت اور تنوع کی بنا پر کثیر تعداد الفاظ ہیں جن کو عربی میں سوانح وتذکروں کی کتابوں میں یا معاجم ولغت کے دفتروں میں دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ان مدحی ووصفی الفاظ میں "رسوخ فی العلم" اور "حاملین علم" کے تذکرے میں "راسخین فی العلم" کے وصف ولقب میں جو معنویت ووسعت اور اعزاز وامتیاز پایا جاتا ہے وہ کسی دوسرے مدحیہ لفظ میں نہیں پایا جاتا، اسی لیے قرآن مجید میں بھی اس کو دوجگہ مقامِ مدح میں ارشاد فرمایا گیا:

"لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَاأُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ". (سورۃ النساء: ۱۶۲)

ترجمہ: البتہ ان میں جولوگ علم میں پختہ اور ایمان والے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر جو اتری ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتر چکی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

"وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّابِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَايَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ". (سورۃ آل عمران: ۷)

ترجمہ: اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لے آئے، وہ سب ہی ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس مدحی و وصفی لفظ میں کمیت و کیفیت دونوں کا اظہار ہے، توسع کے ساتھ تعمق بھی ہے، معرفت کے ساتھ اتقان بھی، حقیقت کے علم و اظہار کے ساتھ احتیاط و حکمت بھی۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے لیے یہی لقب (عالم راسخ) زیب دیتا ہے، اور ان کی وسیع اور متنوع زندگی اور دینی خدمات کے میدان میں وہ امتیازی شان رکھتا ہے، انھوں نے اول علوم دینیہ کی تعلیم اور ان میں پختگی و اتقان پورے طور پر حاصل کیا ہے، پھر متعدد علوم دینیہ کے مرکزوں میں وہ طویل عرصے تک تدریس کا فرض انجام دیتے رہے جس کے بغیر علوم میں اتقان و رسوخ عام طور پر پیدا نہیں ہوتا۔

اس محکم علمی بنیاد کے بعد مولاناؒ کی توجہ افادہ دین کی ضرورت اور اس رابطہ و ضابطہ کو پیش آنے والے خطرات کی طرف ہوئی، جو ان کی امتیازی دینی بصیرت، ہوش مندی اور حقیقت پسندی اور سب سے بڑھ کر توفیق الٰہی کا نتیجہ تھا، اس کی بنا پر انھوں نے جمعیت علماء ہند کے ساتھ تعاون کیا اور آخر تک قائم رہا۔

پھر ان کا سب سے روشن کارنامہ اور ایک مجتہدانہ اور مجاہدانہ اقدام بہار میں امارت شرعیہ کا قیام تھا جو اس پچھلے دور میں جس میں انگریزی حکومت اور انگریزی قانون کا بول بالا قائم ہو چکا تھا، مجتہدانہ بصیرت اور ضرورت شناسی کا ایک کارنامہ تھا، اس کے ساتھ بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ''مولاناؒ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں، مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہو جائے، جس کے تحت میں ان کے تمام تبلیغی و مذہبی و تعلیمی و تمدنی کام انجام پائیں، دارالقضاء قائم ہو کر مسلمانوں کے ہر قسم کے مقدمات اور معاملات تصفیہ پائیں، مسلمانوں کا بیت المال قائم ہو جائے، جہاں مسلمانوں کے صدقات و مبرات و زکاۃ کی ساری رقمیں اکٹھی ہو کر ضروریات میں خرچ ہوں، اور مستحقین میں تقسیم ہوں، مولانا نے عمر کے آخری بیس برس انھی کاموں میں صرف کیے، اور حق یہ ہے کہ انھوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی، مددگاروں کی کمی، رفقاء کی نامساعدت، اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی

حیرت انگیز قوتِ عمل کا ثبوت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی توفیقِ خاص ہے۔‘‘(۱)

جہاں تک اس تحتی براعظم کا تعلق ہے جس کو پہلے ہندوستان ہی کے لفظ سے یاد کرتے تھے، اس میں نظام شرعی کے قیام، امیر کے انتخاب، اور اس سنت جلیل کے احیاء کی پورے عزم و نظم کے ساتھ پہلی مخلصانہ کوشش حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقائے عالی مقام کی نظر آتی ہے، یوں تو اس جماعت نے حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر ہندوستان ہی میں ہجرت سے بہت پہلے ہی بیعت کر لی تھی، اور وہ عملاً پورے نظامِ شرعی پر کاربند اور اپنے امام وقائد کے فیصلوں کی پابند تھی، لیکن جب ۱۲۴۲ھ میں یہ حضرات ہندوستان سے ہجرت کر کے صوبۂ سرحد پہنچے اور انھوں نے جہاد کا آغاز کیا اور حضرو کے چھاپے میں ان کو پہلی بار اس کا تجربہ ہوا کہ ان کے مہاجر ساتھیوں کے علاوہ جنھوں نے سید صاحبؒ کے دامنِ عاطفت میں پوری اسلامی تربیت پائی تھی، اور آپ کے ہاتھ پر بیعتِ سلوک و امامت کی تھی، مقامی باشندے کسی نظام کے پابند نہیں ہیں، حملہ اور مالِ غنیمت کے معاملے میں ان سے بہت سی بے عنوانیوں کا ظہور ہوا، تو جماعت کے اہل شوریٰ اور اہل الرائے کا (جن میں یقینی طور پر ’’منصب امامت‘‘ کے منصف، اور عمیق النظر عالم مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ پیش پیش رہے ہوں گے) اس پر اتفاق ہوا کہ امیر کا انتخاب اور اس کی اطاعت، اور نظام شریعت کے قائم کیے بغیر نہ صرف یہ کہ یہ سرگرمیاں اور احکام وحدودِ شرعیہ کا اجرا شرعی طریقہ پر ممکن نہ ہو سکے گا، بلکہ دینی و شرعی طریقے پر جماعتی زندگی گزارنی بھی مشکل ہوگی، اس وقت ہندوستان عملاً خلافت و امارت کی برکات سے محروم تھا، مسلمان سلاطین کے مختلف خاندانوں نے بالخصوص آخری مغل فرمانرواؤں نے اس کا رشتہ نہ صرف خلافت اسلامی سے، بلکہ نظام شرعی سے بھی تقریباً منقطع کر دیا تھا، اور بظاہر اس وقت اس کو زندہ اور فعال بنانے کا کوئی امکان نہ تھا، خود یہ ملک ایک مستقل دنیا، اور بہت سی خصوصیتوں کی بناء پر عالم اسلام کی قیادت کی اہلیت رکھتا تھا۔

(۱) یادِ رفتگاں از مولانا سید سلیمان ندویؒ، ص: ۲۱٦

www.abulhasanalinadwi.org

غرض یہ کہ پورے غور وفکر کے بعد ۱۲؍ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۱؍ جنوری ۱۸۲۷ء کو ایک ایسی جماعت نے جو ہندوستان کے علم ودین کی بہترین نمائندہ، کتاب وسنت کے اسرار پر گہری نظر رکھنے والی، اور زہد وتقویٰ کا عطر تھی، آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کی اور آپ کو اپنا امیرِ شریعت منتخب کیا، یہ امارت شرعیہ کے قیام کی وہ پہلی کوشش تھی جو اپنے اندر خلافت کی جھلک رکھتی تھی، اور اس کے حدود، امارت سے آگے بڑھ کر امامت سے ہم آغوش ہو گئے تھے، اسی بنا پر اس اہم واقعے کی اطلاع مسلمان والیانِ سلطنت، ہندوستان کے والیان ریاست، اور علماء ومشائخ وعمائد ہندوستان وافغانستان وترکستان کو دی گئی، اور ان حضرات کے خطوط مسرت ومبارکباد کے آئے، اور بہت جگہ سے اس کی منظوری، اور اس نظام کو قبول کرنے کی اطلاع بھی ملی۔

سید صاحبؒ کی شہادت بالاکوٹ ۲۴؍ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶؍ مئی ۱۸۳۱ء کے بعد سے امامت تو امامت، امارت شرعی کا قیام بھی ایک داستان پارینہ بن کر رہ گیا۔

انگریزوں کے عہد حکومت کے آخری دور میں جب تحریک خلافت نے مسلمانوں کے دینی وملی شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، انتشار وپراگندگی کی زندگی، اور اس کے بدترین نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے آئے، مختلف بیرونی واندرونی اسباب کی بناء پر اجتماعی زندگی کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہوا، الغاءِ خلافت نے ان کے دلوں کو زخمی کر کے رکھ دیا، انگریزی عدالتوں کے فیصلوں، غیر مسلموں کی تقلید، موروثی وعرفی قوانینِ وراثت، اور روایات وعادات، شریعت اسلامی سے انحراف، اور اس نعمت عظمیٰ کی ناقدری کی نحوستیں، مسلمان عورت کی مظلومی، اور نظام امارت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کو اس کا صحیح حق دلانے، اور اس کو مصائب ومشکلات سے بچانے کی دقتوں نے (جنھوں نے کبھی اس کو ارتداد، اور کبھی اس کو حرام کے سایہ میں پناہ لینے پر آمادہ کر دیا) ان کی آنکھیں کھول دیں، اور ان میں سے حساس اور دردمند اصحاب کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔

یہ بے چینی ہندوستان میں اپنے اپنے مبلغِ علم، اور اپنی اپنی دردمندی اور احساس

www.abulhasanalinadwi.org

کے درجے کے مطابق عام تھی، لیکن اس سلسلے میں قیادت ورہنمائی، اور سبقت واولیت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاری کی قسمت میں رکھی تھی، ہندوستان میں شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں، کہ مولانا کو اگرچہ علمی حلقوں میں وہ ناموری اور شہرت حاصل نہیں ہوئی، جس کے وہ مستحق تھے، لیکن میرے محدود علم میں ان کا جیسا دقیق النظر اور عمیق العلم عالم دور دور نہ تھا، فقہ بالخصوص اصول فقہ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، سیاست وتمدن اور تاریخ کا بھی انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر قانونی ودستوری باریکیوں، اور ہندوستان کے دستور اور سیاسی نظاموں سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے، اور ان کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا تھا، ان کے تکلم وخطابت، اور تحریر وانشاء کے حصے کی قوت وصلاحیت بھی (جس سے ان کے بہت سے معاصرین نے عام طور پر بڑی فیاضی سے کام لیا) مسلمانوں کے موجودہ حالات، مستقبل کے خطروں اور ہندوستان میں ان کے مقام کے تعین کے مسئلے پر صرف ہوئی تھی، وہ بدلتے ہوئے ہندوستان کو اپنی چشم بصیرت سے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس وقت چشم بصارت سے بھی نہیں دیکھ پا رہے ہیں، وہ اقبال کی زبان میں ہر وقت زبان حال سے گویا تھے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

اس غالب علمی رجحان اور فطری فقہی ذوق کے ساتھ وہ عملی اور میدانی زندگی میں بھی سرگرم اور کوشاں تھے، جو علمی اشتغال اور فقہی وعلمی مصروفیت کے ساتھ ایک نادر اور قلیل الوقوع چیز ہے، انھوں نے بہار کے زلزلے کے زمانے میں ایک ایک گاؤں جا کر بے گھروں اور بے خانماں انسانوں کی مدد کی۔ ان نادر ونایاب اوصاف وکمالات، حفاظت واشاعت دین کے اقدامات اور آخر میں سب سے بڑھ کر امارت شرعیہ کے قیام کے کارنامہ (جس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام اور جگہ جگہ امارت شرعیہ کا نظام اور سب سے بڑھ کر

www.abulhasanalinadwi.org

مسلمانوں کے اپنے ذاتی، خاندانی، مالی، قانونی معاملات اور اختلافات میں شریعت اسلامیہ کی طرف سے توجہ کا پیدا ہونا ہے) مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کا وہ کارنامہ اور احسان ہے جس کی نظیر عہد حاضر میں ملنی مشکل ہے، اور جس کا حق یہ ہے کہ اس کی یاد تازہ کی جاتی رہے، اور ان کے لیے دعائے خیر و رفع درجات کا فرض انجام دیا جائے۔ وذلك جزاء المحسنين۔

مجھے دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے دولت کدے پر ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں پہلی بار ان کی زیارت اور بار بار ان کی مجلسوں اور صحبتوں میں شرکت اور یکجائی کی سعادت حاصل ہوئی، میں نے مولانا مدنیؒ کو کسی کا ان سے زیادہ احترام کرتے ہوئے نہیں دیکھا، یہ میری نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا، اس لیے میں ان کے علمی و ذہنی مقام کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تھا، پھر جب خوش قسمتی سے ان کا مولانا مدنیؒ کی رفاقت میں دو تین ہفتے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے مکان پر لکھنؤ میں مدح صحابہؓ کی تحریک کے سلسلے میں ۱۹۳۸ء میں قیام رہا، تو میں نے ان کو اور زیادہ قریب سے، اور علم و شعور کی اس منزل میں دیکھا، جب مطالعہ و تجربہ کچھ آگے بڑھ چکا تھا پھر اپنے محبوب و مخلص دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی جوان کے نہایت گرویدہ اور معتقد تھے، اور جنھوں نے ان کے حالات و کمالات کے تعارف میں "محاسن سجادؒ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جوان کی سب سے بہتر سوانح کہی جاسکتی ہے، ان کے متعلق بہت کچھ سنا، ان کے علاوہ فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ان کے متعلق بلند کلمات سنے، رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" بھی مولانا کے متعلق میری معلومات کا ذریعہ ہیں، اور وہ دین و علم کے بعض شعبوں میں ان کی انفرادیت کے قائل ہیں۔

غرض امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک، اور اس کا علمی و فقہی و دستوری خاکہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دلِ دردمند، و فکرِ ارجمند کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے اس عہد اخیر میں وہ عظیم ملی خدمات لی جس کی نظیر (مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت تبلیغ کو چھوڑ کر) اس نصف صدی میں نہیں ملتی، ان کے ذریعے سے

ہندوستان کی ایک اہم اور مردم خیز ریاست (صوبہ بہار واڑیسہ) امارت شرعیہ کے برکات سے متعارف ومستفید ہوئی، اس تحریک کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس کو اپنے پہلے ہی مرحلے میں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی وناظم اول ندوۃ العلماء کی تائید وحمایت، اور بقیۃ السلف حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب کی سرپرستی حاصل ہوئی، آخرالذکر اس کے امیر اول منتخب ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو مقبولیتِ عامہ، وجاہتِ دینی، اور ہر طبقے کا اعتماد عطا فرمایا تھا، اس کی وجہ سے یہ کوشش جلد بارآور، قابلِ اعتماد، اور سارے ہندوستان کی مرکزِ توجہ بن گئی، بہار واڑیسہ کا صوبہ بھی بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کا پہلا تجربہ، اور اس شجر طوبیٰ کا پہلا ثمر شیریں اس کے حصے میں آیا، میں نے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ اگر مجھے ہندوستان کے کسی صوبہ پر رشک آتا ہے، تو بہار پر، اور اگر بہار پر رشک آتا ہے، تو امارت شرعیہ کی وجہ سے، کہ وہاں کے مسلمان اس کی بدولت ایک ایسی زندگی گزار رہے ہیں جو معتبر اسلامی زندگی سے قریب تر، اور جاہلی وغیر اسلامی زندگی سے بعید تر ہے۔

مولانا شاہ بدرالدین صاحبؒ امیر شریعت اول بہار کے بعد ان کے خلیفہ وفرزندارجمند مولانا شاہ محی الدین صاحب امیر شریعت مقرر ہوئے، ان دونوں بزرگوں کی موجودگی میں مولانا محمد سجاد صاحبؒ بدستور نائب امیر شریعت رہے، اور وہی درحقیقت اس پورے نظام کا دماغ، اور مرکز اعصاب تھے، امیر شریعت کی شکل میں قلب دردمند، اور نائب امیر شریعت کی شکل میں ذہن بیدار اس نظام کو حاصل تھا، دل ودماغ کے اس تعاون نے اس نظام میں وہ اعتدال وتوازن، اور عوام وخواص کا وہ اعتماد پیدا کر دیا جو ایسی عظیم تنظیم اور تحریک کے لیے ضروری ہے، افسوس ہے کہ ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں مولانا سجاد صاحبؒ نے وفات پائی، یہ خلا پُر ہونا بظاہرِ حالات آسان نہ تھا، لیکن رضا بالقضاء کے سوا کیا چارہ تھا۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ

ہمارے ملک میں قومی وملی تحریکات کے شروع ہونے، سیاسی وملی شعور کے بیدار ہونے، جماعت سازی اور خطابت وصحافت کے اس دور میں (جو تحریکِ خلافت اور جنگِ آزادی کے بعد بڑے پیمانے پر شروع ہوا) اعزاز واکرام اور تعریف وتوصیف کے خطابات والقاب دینے کا عام رواج ہوگیا، اور بعض مرتبہ اس میں ایسی فیاضی، غلو اور مبالغہ اور عجلت وجذباتیت سے کام لیا گیا کہ بعض حقیقت پسندوں کی زبان پر بے اختیار یہ مصرعہ آگیا۔ ع

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لیکن ہر کلیہ میں استثنا ہوتا ہے، اس کلیہ میں بھی کئی استثناءات ہیں، جن میں اس وقت دو توصیفی القاب کا استثنا کروں گا، ایک مولانا محمد علی جوہر کے لیے ''رئیس الاحرار'' کے خطاب کا، دوسرے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کے لیے ''مجاہد ملت'' کے لقب کا، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم صرف ہندوستان کی ملت اسلامی ہی کے تعلق سے ''مجاہد ملت'' کہلانے کے مستحق نہ تھے، وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد، انگریزی حکومت واقتدار کے مقابلے میں صف آرائی، ہندو مسلم اتحاد اور ایک آزاد ومنصفانہ جمہوری ودستوری حکومت کے قیام کے لیے ایثار وقربانی اور قید وبند کی آزمائشیں برداشت کرنے والے قائد کی حیثیت سے بھی ایک صاحب عزیمت وصاحب شجاعت مجاہد کے لقب کے مستحق ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنوں کی اس مخالفت، سماجی ومعاشرتی مقاطعہ، دل آزاری، دشنام طرازی اور تذلیل واہانت کے ان مظاہروں کی بنا پر جو (راقم کو معاف کیا جائے) مسلم لیگ کی تحریک کے اعصابی وجذباتی جوش، پاکستان کے سحر انگیز اور دل فریب نعرہ، اور کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے قائدین پر طنز واستہزا کے اس دور میں جو ملک کی تقسیم سے کئی سال پہلے شروع ہو گیا تھا، اور جس میں اس نظریے سے ادنی اختلاف رکھنے والوں کو معاف نہیں کیا جاتا تھا، شجاعت واستقامت، اصول وعقیدے پر ثبات ودوام اور ایثار وقربانی میں ان کا حصہ، اکثریت کے ان سیاسی قائدین اور رہنماؤں سے کہیں زیادہ ہے، جن کو اپنے فرقے کے افراد اور اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے ایسی آزمائشوں کا سامنا کرنے کا موقع پیش نہیں آیا، سب جانتے ہیں کہ اپنے خاندان کے افراد کی مخالفت، اپنے گھر میں ایذا واہانت کا معاملہ، سماجی مقاطعہ، باہر کی مخالفتوں اور قید وبند کی صعوبتوں سے کہیں زیادہ صبر آزما اور اذیت رساں ہوتا ہے، اس موقع پر بے اختیار راقم کو یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ غالباً پنت جی نے (جو اس وقت ریاست اترپردیش کے وزیر داخلہ یا وزیر اعلیٰ تھے) کسی موقع پر مولانا مرحوم کے بارہ میں کوئی طنزیہ جملہ کہا یا ان کی حب الوطنی اور ملک کی آزادی کے سلسلے میں کوئی تعریض کی، تو مولانا نے اس کے جواب میں بڑی صاف گوئی اور جرأت سے کام لیا اور کہا کہ "ہم ہی (مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے معتوب ہونے اور پاکستان کے مطالبہ کے ہم نوا نہ ہونے کی وجہ سے) اپنے ہم مذہبوں کے قہر وغضب اور تمسخر واستہزا کا نشانہ بنے اور ہمیں کو اپنے پرجوں (دھوبی، نائی اور کام کرنے والوں) کے مقاطعہ کا نشانہ بننا پڑا، غیر مسلم سیاسی رہنماؤں اور اکثریت کے فرقہ کے "سورماؤں" کو اس مرحلہ سے گزرنا نہیں پڑا اور نہ ان کو اس کی نوبت آئی" جن حالات میں اور جس شخصیت کے اعتراض یا جملہ کے جواب میں یہ جرأت مندانہ اور دلیرانہ جواب دیا گیا تھا، اس کی قدر وقیمت کا اندازہ اس وقت کرنا مشکل ہے۔

مولانا مرحوم کی متعدد ونمایاں اخلاقی، ذہنی، علمی ودینی، تحقیقی وتصنیفی خصوصیات

www.abulhasanalinadwi.org

وکمالات کے اعتراف واحترام کے ساتھ ان کے جس امتیاز کا اس مختصر مقالہ میں (جو علالت ومصروفیت کی حالت میں ان کا حق سمجھتے ہوئے اور فرض کو ادا نہ کرنے کو ناسپاسی اور حقیقت پوشی جانتے ہوئے سپردِ قلم کیا جارہا ہے) خاص طور پر ذکر کرنا ہے، وہ ان کی حق گوئی اور بے باکی اور ملک کے آزاد ہونے کے بعد اپنے ایثار اور قربانی کی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہ کرنا ہے، جہاں تک پہلے وصف کا تعلق ہے جس کا کچھ نمونہ اوپر پیش کیا گیا، وہ اقبالؔ کے اس شعر کے مستحق معلوم ہوتے ہیں۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس حق گوئی و بے باکی کا اظہار مجالس قانون ساز کی تقریروں، حکومت کے ذمہ داروں سے مخاطبت ومکاتبت، مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں جرأت وصاف گوئی اور دوروں اور جلسوں میں تقریروں، شرعی مسائل سے تعلق رکھنے والے قوانین، نئی نسل کی دینی تعلیم اور اردو کے تحفظ کے لیے ان کی جدو جہد، جلسوں کے انعقاد اور کمیٹیوں کی تشکیل اور ان میں اپنی صحت وراحت سے بے پروا ہوکر شرکت میں ہوا، جس کے شاہد اخبارات کے قدیم فائل اور مجالس قانون ساز کے ریکارڈ ہیں، اس راقم کو بھی بمبئی کی تعلیمی کانفرنس میں جو (تقسیم کے بعد) مولانا ہی کی تحریک ودعوت پر منعقد ہوئی تھی، اور لکھنؤ میں بعض شرعی مسائلِ وقف وغیرہ سے تعلق رکھنے والی کمیٹیوں میں شرکت ورکنیت کا اتفاق ہوا، جن میں مرحوم سید محمد احمد صاحب کاظمی بھی ایک اہم رکن اور مشیر کار تھے، ان مواقع پر مولانا کی سیاسی ودینی بصیرت اور قائدانہ مخلصانہ جرأت کے نمونے دیکھنے میں آئے۔

جہاں تک دوسرے وصف جنگ آزادی کے سلسلے کی قربانیوں اور قید وبند کی صعوبتوں کی قیمت وصول نہ کرنے اور اپنے اثرات وتعلقات سے (جن میں کم ہی لوگ ان کے ہمسر ومساوی ہوں گے) فائدہ نہ اٹھانے کا تعلق ہے اس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ایک دو حضرات کو مستثنیٰ کر کے مشکل سے ان کا کوئی سہیم

www.abulhasanalinadwi.org

وشریک ہوگا، راقم کو ایک دو بار جمیعۃ العلماء کے دفتر واقع گلی قاسم جان دہلی میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے ساتھ قیام کرنے اور مولانا مرحوم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس وقت ان کی سادہ بلکہ زاہدانہ زندگی اور بے غرضی و بے لوثی کا کچھ اندازہ ہوا، وہ اہلِ تعلق اور ضرورت مندوں کے لیے تعارفی و سفارشی خطوط بھی لکھ دیتے تھے، اور ان کا احترام بھی کیا جاتا تھا، لیکن اپنے لیے انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور دہلی میں نہ ایک مکان بنایا، نہ حاصل کر سکے، ان کے متعلق فارسی کا یہ قدیم شعر لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

عدیل ہمت ساقیست فطرتِ عرفی   کہ حاتم و گران و گدائے خویشتنست

مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاد تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ سے ان کی زندگی میں قریبی ربط و تعلق رکھتے تھے، ان کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"سب واقف جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم آزادی کے بعد بننے والی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر بنے، پھر تادم آخر ممبر رہے، مولانا کی زندگی کا آخری الکشن ۱۹۶۲ء میں ہوا، مولانا اپنی شدید علالت (جو بالآخر مرض وفات ثابت ہوئی) میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ایک دن بھی ورک نہیں کر سکے، لیکن اس کے باوجود الکشن میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، یہ کامیابی ایک طرف تو مولانا کی غیر معمولی مقبولیت اور اخلاص کے ساتھ ان کی قومی خدمات کا ثبوت ہے، تو دوسری طرف قوم کی بیدار مغزی اور محسن شناسی کی بھی علامت ہے (مولانا کا حلقۂ انتخاب امروہہ، سنبھل تھا) اتنی طویل مدت تک پارلیمنٹ کے ممبر رہنے اور بلاشرکتِ غیرے مدتوں تک مسلمانوں کے عظیم رہنما ہونے کے باوجود مولانا اپنا ذاتی مکان دہلی میں نہیں بنا سکے اور پرانی دہلی کے محلہ بلیماران میں۔۔ جہاں اس وقت جمیعۃ علمائے ہند کا صدر دفتر تھا، اسی کے قریب۔ ایک متوسط درجہ کے کرایے

www.abulhasanalinadwi.org

کے مکان میں رہتے رہے، جو کسٹوڈین کی تحویل یا ملکیت میں تھا (آزادی کے بعد ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو جانے والے مسلمانوں کی جائداد پر قبضہ اور اس کی نگرانی کرنے کے لیے ایک مستقل محکمہ "کسٹوڈین" کے نام سے مدتوں قائم رہا جس کی چیرہ دستیوں نے مسلمانوں کو عاجز و درماندہ کر رکھا تھا، پھر ان مکانات کو نیلام کیا گیا اور خریداری کا اولین حق داران کے ساکنوں کو قرار دیا گیا تھا) مولانا کے مرض وفات میں اس مکان کی نیلامی کا نوٹس آیا، اتفاق سے جس وقت مولانا کو اس نوٹس کی اطلاع، ان کے معتمد حاجی حسام الدین صاحب نے دی راقم الحروف (محمد برہان الدین) مولانا کے پاس حاضر تھا، (مولانا مرحوم، راقم کے والد ماجدؒ مولانا قاری حمید الدین سنبھلی کے دوستوں بلکہ قدر شناسوں میں تھے، اسی رشتہ سے راقم پر بھی خاصی نظر عنایت تھی، اسی لیے اکثر حاضری کی سعادت حاصل کرلیا کرتا تھا) مولانا نے یہ اطلاع پا کر جس تاثر بھرے بلکہ درد بھرے لہجے میں اظہار خیال کیا اسے راقم بھولتا نہیں، مولانا نے فرمایا کہ ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں کہ یہ مکان خرید سکیں اور ہمارے تو آبائی مکانات جو سیوہارہ میں تھے ڈھے کر ختم ہو گئے، اور یہ فرماتے ہوئے ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، یہ تھا مولانا کا زاہدانہ کردار کہ ان کی وجہ سے سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں لاکھوں مسلمان مالا مال اور صاحب جائداد بن گئے، مگر وہ خود اس لائق بھی نہ ہو سکے کہ سر چھپانے کے لیے معمولی سا مکان ذاتی بنا سکتے، بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے بعض صاحب ثروت دوستوں بلکہ ممنون احسان افراد نے اس مکان کو نیلام میں کسٹوڈین سے خرید کر مولانا مرحوم کے اکلوتے صاحبزادہ محمد اسلم کو دے دیا"۔

راقم کو ان کے اس بیرونی سفر پر جانے کے وقت جو اپنے شدید صبر آزما مرض کے علاج کے لیے اختیار کرنے والے تھے، اور پھر وہاں سے واپسی پر زیارت و ملاقات کا موقع

www.abulhasanalinadwi.org

ملا، ان دونوں موقعوں پر وہ اپنے کسی اہلِ تعلق کے یہاں مقیم تھے، اور نہایت سادگی کے ساتھ انھوں نے یہ پر صعوبت اور طویل سفر گوارا کیے اور واپسی پر صبر و رضا اور قناعت کے ساتھ سفر آخرت اختیار کیا، جہاں ان کو ان کے اخلاص، خدمتِ دین اور ایثار و جدوجہد کا حقیقی صلہ ملنا تھا۔

اس طویل سیاسی جدوجہد کے ساتھ جس کا مزاج علمی کاموں اور تحقیق وتصنیف سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، انھوں نے اپنے علمی ذوق، تصنیف وتحقیق کی صلاحیت اور لکھنے پڑھنے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی، وہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانیوں اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کے نہ صرف شریک کار اور ندوۃ المصنفین کے ایک معمار تھے، بلکہ ان دونوں حضرات کو ان سے تقویت اور ندوۃ المصنفین کو ان سے اعتبار و عزت حاصل تھی، اس سلسلے میں ان کی دو تصنیفات ایک تو ''قصص القرآن'' دوسرے ''اسلام کا اقتصادی نظام'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اردو میں ہمارے علم میں قصص قرآن، انبیاء علیہم السلام کی سوانح حیات اور ان کی دعوتِ حق کی مستند تاریخ وتفسیر (جو قرآن مجید کے گہرے مطالعہ اور صحف قدیم اور جدید تحقیقات کی مدد سے مرتب کی گئی ہو) اس سے پہلے نہیں تھی، عربی میں البتہ مصر کے نامور عالم شیخ عبدالوہاب نجار کی قصص القرآن موجود ہے، مولانا نے اردو میں یہ کتاب تصنیف فرما کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی اور اسلامیات وعلوم قرآن کے طالب علموں کے لیے ایک قیمتی ذخیرہ مہیا کر دیا، یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے، جلد چہارم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعات وحالات پر مشتمل ہے۔

ان کی دوسری کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' بھی گراں قدر تصنیف ہے، جس میں قدیم کے ساتھ جدید اقتصادی نظاموں سے واقفیت اور اسلامی اقتصادی نظام کی برتری کا علمی انداز میں اظہار واثبات ہے، اس کتاب میں انھوں نے ایک بڑے نکتہ کی بات لکھی ہے، جس کی طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اشارہ کیا ہے ''اقتصادیات کا

اخلاقیات سے آزاد و بے تعلق ہو جانا معاشرے کے لیے سخت مضر اور خطرناک ہے"۔

علمی ذوق واشتغال کا سیاسی مصروفیات اور ان کے تقاضوں کے ساتھ جمع کرنا بڑا دشوار اور ہمت آزما کام ہے، اور تھوڑے ہی لوگ اس پر قادر ہوتے ہیں، اور اس پر کسی درجے میں حسرت کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

مولانا کی وفات پر ہندوستان میں ملی قیادت کے میدان میں ایک عظیم خلا واقع ہو گیا ہے جو ابھی تک پر نہیں ہوا، ان کے بعد ایسی شخصیت نظر نہیں آئی جس پر صحیح معنی میں ''مجاہد ملت'' کا لقب وخطاب صادق آسکے، اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے درجے بلند تر کرے۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

میں نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے جن حضرات کا نام عقیدت وعظمت کے ساتھ سنا، ان میں مفتی صاحب مرحوم کے والد بزرگوار حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا نام نامی بھی تھا، جو سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے، آپ کو مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی، خلیفۂ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی سے خلافت حاصل تھی، میرے مربی وولیِ نعمت اور برادر بزرگ مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) جب ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں حدیث کی تکمیل اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے استفادے کے لیے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کے حکم وایما سے دیوبند گئے، تو والد صاحب نے ان کو متعدد خطوط میں حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی ہدایت فرمائی، اس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی جلالتِ شان کے ماسوا سلسلۂ طریقت کا اشتراک اور مناسبت بھی تھی، والد ماجد نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی (جو آٹھ جلدوں میں عربی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہزار بارہ سوسال کے اسلامی دور کے مشاہیرِ ہند اور ممتاز شخصیتوں کے تعارف وتذکرہ پر مشتمل ہے) آٹھویں جلد میں حضرت مفتی صاحب کا بلند الفاظ میں قدرے شرح وبسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، مجھے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا کہ ۱۳۴۷ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، اور میں دیوبند ۱۹۳۱ء (۱۳۵۰ھ) میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے درسِ حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیوبند کے ایک سفر کے موقع پر مفتی صاحب کے عم محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دیوبند

www.abulhasanalinadwi.org

ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنیؒ کے دولت کدہ پر ان سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا، مولانا کے ان حواشی کے بارے میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن پر ان کے قلم سے ہیں، میں نے اپنے تاثرات اور بحیثیت مدرس تفسیر کے اپنے تجربے کا اظہار کیا، اور ان کی افادیت اور علمی و تحقیقی امتیاز کے بارے میں اظہار خیال کیا، تو مولانا کی خصوصی توجہ ہوئی اور خصوصی شفقت فرمانے لگے، اس وقت تک جہاں تک یاد ہے، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات اور تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے نیاز اور براہ راست ملاقات کا سلسلہ (جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے) ۱۹۴۰ء کے بعد سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری ہوئی اور پھر مستقل ربط قائم ہو جانے کی بنا پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دہلی کا سفر پیش آتا رہا، اس وقت تک دہلی کے نامور اور ممتاز علماء اور علمی اشتغال اور سیاسی ذوق رکھنے والے فضلاء (حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو مستثنیٰ کر کے) مولانا سے زیادہ متعارف و مانوس نہیں تھے، اور ان کی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی، میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے درس و تدریس کا انتساب رکھنے اور کچھ لکھنے پڑھنے کی مناسبت سے دہلی کے ان علماء اور مولانا کے درمیان رابطہ بننے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ صاحب مرحوم کا مکتبہ عزیزیہ باذوق و سنجیدہ علماء اور علمی و سیاسی ذوق رکھنے والے احباب کی (جن کا زیادہ ترجمعیۃ العلماء سے تعلق تھا) نشست گاہ اور بزم احباب تھی، مولوی سمیع اللہ صاحب کے اخلاق، خوش گفتاری اور زندہ دلی کی وجہ سے میری بھی آمد و رفت شروع ہوئی، وہاں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی بھی تشریف لایا کرتے تھے، میں نے دونوں کو نظام الدین آنے کی دعوت دی، اور دونوں حضرات میری دعوت پر وہاں تشریف لائے، میں نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مفتی صاحب کے بارے میں بلند الفاظ سنے تھے، فرماتے تھے کہ "حضرت مفتی

عزیز الرحمٰن صاحب کو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فقہی صلاحیت اور نظر پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان کے فقہی جوابات سے مطمئن ہوتے تھے، مجھے ان کا فقہ وافتاء کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو اس فن سے خصوصی مناسبت اور امتیاز حاصل ہے''۔

مفتی صاحب سے اصل ربط و تعلق ۱۹۴۳ء سے شروع ہوا، اس وقت ''ندوۃ المصنفین'' قرول باغ دہلی میں تھا، حسنِ اتفاق کہ اس زمانے میں اس کے مرکز کے قریب ہی میرے والد مرحوم کے ایک مخلص دوست عمِ مخدوم ومحترم الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر برادر محترم سید محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے اکاؤنٹینٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے اور ایک زمانے میں دہلی میں ان کی پوسٹنگ تھی، اس تعلق ومناسبت سے میرا بار بار وہاں آنا جانا ہوتا تھا، سید محمد خلیل صاحب اور سید محمد جمیل صاحب دونوں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اور ندوۃ المصنفین سے ربط وتعلق رکھتے تھے، اسی زمانے میں مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ ومصنف ''اظہار الحق'' کے خاندان کے چشم وچراغ اور ''آثار رحمۃ اللہ'' میں سے تھے، بعض سیاسی حالات ومصالح کی بنا پر مکہ مکرمہ سے آکر قرول باغ دہلی میں اسی ماحول وجوار میں جس کا تذکرہ کیا گیا مقیم تھے، یہیں سے وہ رسالہ ''ندائے حرم'' کی ادارت واشاعت بھی فرماتے تھے، اور مدرسۂ صولتیہ کی رہنمائی ونگرانی بھی، اتفاق سے انھیں دنوں ہمارے مخدوم مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی ایم۔ اے علیگ بھی دہلی میں مقیم تھے، اور ان کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی موانست ومناسبت تھی، میں قرول باغ جاتا تو آدھے آدھے دن رہ جاتا، علم وادب، زندہ دلی اور مجلس آرائی، چشم وگوش اور کام ودہن سب کی لذت سب کا سامان ایک جگہ بہم ہوتا، مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب بھی شریکِ بزم ہوتے، انھوں نے کبھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر کھانے کی ضیافت بھی فرمائی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے بعد مفتی صاحب سے صرف اہم اجتماعات میں ملاقات ہوتی، مثلاً بمبئی کا تعلیمی کنونشن جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۵ء میں بلایا تھا، تقسیمِ ہند کے بعد جمعیۃ العلماء کا پہلا جلسہ جو ۱۳۶۷ھ (اپریل ۱۹۴۸ء) میں مولانا مدنیؒ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، اور اس کے اکثر مہمان دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھے، نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پاکستان میں حادثۂ ارتحال پیش آیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہم نیاز مندوں نے مولانا کی یاد میں ۱۹۵۴ء میں ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع منعقد کیا، جس کی شرکت کے لیے ضعف وعلالت کے باوجود مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم اپنے وطن سے لکھنؤ تشریف لائے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی شرافتِ نفس، سید صاحب کے ساتھ تعلقات، اور دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین کے علمی واسمی رشتہ واشتراک کی بنا پر کیسے شرکت نہ فرماتے؟ تشریف لائے اور بڑے ذوق ودلچسپی کے ساتھ پورے اجتماع میں شریک رہے، سید صاحب کا ہندوستان کو خیرباد کہہ کر پاکستان تشریف لے جانا اور وہیں قیام اختیار کر لینا ایک علمی، ادبی اور ملی سانحہ تھا، لیکن حالات اور مجبوریوں اور خانگی نزاکتوں کی "سنگین منطق" میں دخل در معقولات کی کیا گنجائش؟ مفتی صاحب نے اپنے ہی تاثر نہیں، بلکہ ہندوستان کی، ملت اسلامیہ اور علمی وتصنیفی اداروں کی اس ملی جلی حیرت وحسرت کو جس خوبی، ذہانت ولطافت کے ساتھ اپنی تعزیتی تقریر میں ادا کیا وہ مفتی صاحب ہی کا حق تھا، اور ذوق وگوش ابھی تک اس کی لذّت لے رہے ہیں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ "ہم عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی تمنا تو یہ تھی کہ سید صاحبؒ کی آخری آرام گاہ یا اپنے محبوب ومحسن استاد ومربی علامہ شبلیؒ کے پہلو میں ہوتی، یا اپنے مرکزِ عقیدت شیخ ومرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پہلو میں، مگر تقدیر الٰہی کچھ اور تھی۔ ع

من چناں خواہم، خدا خواہند چنیں

آج بھی اہلِ ذوق اور محرمانِ حقیقت اس بلیغ جملہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں، جس میں مرثیہ کا سوز بھی ہے، اور غزل کی لطافت بھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

ویسے تو مفتی صاحب کی رفاقت دارالعلوم دیوبند کے جلسہ شوریٰ میں اور ندوۃ العلماء کی مجلسِ انتظامی میں حاصل ہوتی رہتی تھی، لیکن اصلاً مفتی صاحب کی رفاقت اور وسیع و جامع معنیٰ میں خدمتِ دین وملت کے میدان میں ہم سفری کی سعادت ۱۹۶۴ء سے حاصل ہوئی۔

جب راوڑکیلا، رانچی، جمشید پور کے فسادات نے ملت کا درد رکھنے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر بروقت اس کا مداوانہ کیا گیا اور مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں، تنظیموں، اوران کے قائدین اور رہنماؤں نے ملت ہی کو نہیں، بلکہ ملک کو بچانے کے لیے منظم ومتحد جدوجہد کا آغاز اور مشترک پلیٹ فارم کو وجود میں لانے کا کام نہ کیا تو اس ملت پر جو کچھ گزرے گی سو گزرے گی ملک کی بھی خیریت نہیں، اس تاثر کا سب سے زیادہ غلبہ اور اس صدمے کی چوٹ سب سے زیادہ (خدا مغفرت کرے اور ان کے درجے بلند کرے) ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم کے دل پر تھی، انھوں نے ان سب فکر مند اور درمند حضرات سے رابطہ قائم کیا جو اس سلسلے میں ان کے ہم سفر ہو سکتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے دہلی میں ہونے کی وجہ سے ان کا سب سے زیادہ اور پہلا ربط مفتی صاحب اور مولوی محمد مسلم صاحبؒ ایڈیٹر ''دعوت'' سے رہا، باہر کے لوگوں میں راقم سطور اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سے۔

اس سلسلے کا پہلا قدم مشاورت کا وہ تاسیسی جلسہ تھا، جو ۸/۹ راگست ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور جس کے نتیجے میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، اس جلسے میں طے پایا کہ ملک کی فضا کو درست کرنے اور احترامِ انسانیت اور امن وآشتی کا پیغام پہنچانے اور بجائے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے (جن کے ذہن بہت کچھ مسموم ہو چکے ہیں) ملک کی عام آبادی اور ہندو مسلم عوام سے براہِ راست رابطہ پیدا کیا جائے، اس کے ساتھ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے، اور ان کو محسوس کرایا جائے، کہ وہ دینِ حق اور خدا کے آخری پیغام کے حامل، انسانیت کے بے لوث خادم ومعمار ہونے اور اپنی ان خصوصیات اور دینی ذمہ داریوں کی بنیاد پر اس ملک

www.abulhasanalinadwi.org

کے محافظ و پاسبان بھی ہیں۔

اس سلسلے میں پہلا سفر بہار واڑیسہ کا ہوا، اور ایک مؤثر اور متنوع الافراد وفد نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں رانچی، چکردھر پور، چائباسہ، جمشید پور، اور راوڑکیلا کا دورہ کیا، ہر جگہ وفد کا شاندار اور پرجوش استقبال ہوا، مقرروں میں ڈاکٹر صاحب کے بعد مفتی صاحب پیش پیش اور نمایاں ہوتے تھے، نومبر ۱۹۶۴ء میں مجلس نے مہاراشٹر کا دورہ کیا، دسمبر ۶۴ء میں گجرات کا دورہ ہوا، جس میں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے، اس سفر میں پالن پور، احمد آباد، نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھروچ پر یہ پروگرام اختتام کو پہنچا، گجرات کے دورہ کا ذکر آگیا ہے تو دو واقعات کے تذکرہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ احمد آباد کے قریب ایک مرکزی اور اہم قصبے میں جس کا نام (اگر حافظہ کوتاہی نہیں کرتا) بیس نگر تھا، میں نے منتظمین جلسہ اور رفقائے سفر سے درخواست کی کہ چونکہ میں کئی راتوں سے دیر میں سو رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں مجھے تقریر کا پہلے موقع دے دیا جائے، ذمہ داروں نے منظور کر لیا، اور پہلی تقریر میری ہوئی، میں نے اس تقریر میں ہندوستان کی جغرافیائی وسعت، تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت وغیرہ بیان کرنے کے بعد ایک محبِّ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر حسرت وقلق کا اظہار کیا کہ اتنے عظیم ملک کی قیادت اور انتظام کے لیے ملک کے آزاد ہونے کے بعد جس بالغ سیاسی شعور، وسیع النظری، سیرت واخلاق کی بلندی اور اصول پسندی کی ضرورت تھی، اس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، شاید جنگِ آزادی کی مصروفیت میں قومی سیرت واخلاق کی تعمیر کا وہ کام نہیں ہو سکا، جس کی اتنے بڑے ملک کے سنبھالنے کے لیے ضرورت تھی، ملک میں ذہنی واخلاقی انتشار، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور رشوت اور کرپشن پھیلا ہوا ہے، ملک کے بے لوث کارکنوں، سیاسی رہنماؤں، اور قائدین کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ اس آزادی کا برقرار رہنا مشکل ہو جائے گا، میں یہ تقریر کر کے اپنی قیام گاہ پر آ گیا، واپسی پر ملا جان صاحب نے بتایا (جو تحریک خلافت کے ایک پرانے کارکن اور

www.abulhasanalinadwi.org

مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے، اور کلکتہ میں ان کا قیام تھا، کہ تمھاری تقریر پر پنڈت سندر لال جی نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، اور کہا کہ مولانا کو اتنے تند اور تیز لہجے میں ہندوستان پر تنقید کرنے کا کیا حق تھا؟ انھوں نے ملک کی توہین کی، خیریت ہوئی کہ مجمع نے اس پر اپنے غم وغصہ کا اظہار نہیں کیا، مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ یہ باتیں ایک محبّ وطن ہندوستانی کے ناتے اور ملک کی خیر خواہی میں خلوص سے کہی گئی تھیں، اس پر اتنا برا ماننے کی کیا بات تھی؟ فجر کی نماز کی تیاری کے لیے ہم سب لوگ اٹھے تو دیکھا کہ پنڈت جی اب بھی اس تقریر پر تنقید وتبصرہ کر رہے ہیں، اور مسلمانوں کے بارے میں طنزیہ الفاظ بھی استعمال کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسلمان زم زم کو مقدس پانی مانتے ہیں، لیکن گنگا جل کی ان کے یہاں کوئی عزت نہیں، وغیرہ وغیرہ میں نے طے کر لیا کہ میں اخیر تک خاموش رہوں گا، تاکہ سفر کے مقصد کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور اس وفد میں جو مختلف الخیال لوگوں پر مشتمل ہے کوئی انتشار نہ پیدا ہو، لیکن حیرت ہوئی کہ رفقائے سفر میں سے جن میں بعض خالص مسلم جماعتوں کے رہنما تھے، کوئی ایک لفظ نہیں بولا، (۱) اور پنڈت جی کا سلسلۂ کلام جاری رہا، اتنے میں مفتی صاحب کی آواز آئی جو ابھی بیدار ہی ہو رہے تھے کہ پنڈت جی آخر مولانا نے کیا بے جا بات کہی، آپ اتنے گرم کیوں ہیں الخ، اس وقت مجھے مفتی صاحب کی قدر ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف دینی حمیت بلکہ اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور میری تائید کی، پنڈت جی اس پر خاموش ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

سفر گجرات کا دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ بڑودہ میں نماز فجر وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ چند اہلِ محلّہ گھبرائے ہوئے آئے، اور انھوں نے کہا کہ قریب ہی ایک مکان ہے جو زمین میں دھنس رہا ہے، اس کے آثار نظر آتے ہیں، کئی روز سے اس مکان کے مکین خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مکان میں نامناسب کام ہوئے ہیں اور ان کی

---

(۱) اس موقع پر ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس اور مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند موجود نہ تھے، وہ دونوں احمد آباد رہ گئے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

نحوست سے یہ مکان زمین میں دھنس جائے گا، آپ حضرات چلیں اور وہاں دعا کریں، ہم سب لوگ اپنی حقیقت سے واقف تھے، ''ایاز قدر خود را بشناس'' لیکن یہ خیال ہوا کہ ملت کے خادموں اور مختلف مسلم جماعتوں کے نمائندوں کی جماعت ہے، اور یہ ایک نیک مقصد سے سفر کر رہے ہیں، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور بلا ٹل جائے، کچھ نظر پڑتی تھی تو حضرت مفتی صاحب پر کہ عالم، حافظ، فقیہ اور اللہ کے ایک مقبول بندہ اور صاحب نسبت شیخ کے فرزند ہیں، ہم لوگ ہمت کر کے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر دعا کی، اور چلے آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ کیفیت ختم ہو گئی، مکان اب بھی اسی حالت میں اس جگہ موجود ہے، محبی غلام محمد میمن صاحب سے (جن کا بڑودہ میں قیام ہے، اور مفتی صاحب سے خاص تعلق رکھتے ہیں) جب کبھی پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ الحمدللہ مکان اپنی جگہ پر قائم اور محفوظ ہے۔

مشاورت کا سب سے بڑا دورہ ریاست میسور میں ہوا، جو ۱۱ر نومبر سے شروع ہو کر ۲۲ر نومبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا، اس کی مجموعی مسافت کا اندازہ ساڑھے چار ہزار میل ہے، جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی، مدراس سے شروع ہو کر یہ دورہ گلبرگہ پر ختم ہوا، جھانسی ہی سے راقم السطور کی مفتی صاحب سے رفاقت ہو گئی، یہ تحریکِ خلافت کے بعد شوکتِ اسلامی کا پہلا نظارہ تھا، اس کے اہم مقامات میں بنگلور، سرنگاپٹن (مدفن سلطان ٹیپو) میسور، مرکارہ، منگلور، ہاسن، بیجاپور، شیموگا وغیرہ تھے۔

اس تاریخی دورے میں اختتامی تقریر مفتی صاحب کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ صحیح آزادی اور جمہوریت وہ ہوتی ہے، جس کا فیض یکساں طور پر آبادی کے تمام عناصر اور ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں کو پہنچے، اس کی انھوں نے مثالیں دیں، اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کا ذکر کیا، پھر اپنے پسندیدہ (جگر مرحوم کے) اشعار پڑھے، جو اس دورہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے ۔۔۔ کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے
چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں ۔۔۔ کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

www.abulhasanalinadwi.org

مفتی صاحب کی تقریروں میں رجائیت اور تعمیری وایجابی نقطۂ نظر غالب ہوتا تھا، ان کی تقریریں جذبات میں اشتعال، اور غم وغصہ پیدا کرنے کے بجائے مسائل سلجھانے اور حالات کی طرف سے پرامید رہنے پر آمادہ کرتی تھیں، اکثر دوسرے مقررین کے مقابلے میں ان کی تقریریں زیادہ تعمیری اور غیر مسلم سامعین کے لیے (جو اکثر مقامات پر بڑی تعداد میں ہوتے تھے) مفید اور قابلِ فہم اور قابلِ قدر ہوتی تھیں، اور ان کو قریب کرنے کا کام کرتی تھیں، جوان دوروں کا بڑا مقصد تھا۔

افسوس ہے مجلس کی ان تعمیری سرگرمیوں اور اس کے دوروں کا مفید سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا، میسور کا دورہ مجلس مشاورت کی شہرت ومقبولیت کا نقطۂ عروج تھا، ۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات بلاواسطہ مجلس کے لیے اور بالواسطہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک نازک ابتلا ثابت ہوئے، جماعتوں کے ذمہ داران اور ارکانِ مجلس نے اپنے اپنے طور پر کہیں کہیں کام کیا اور اس سے مجلس کا شیرازہ جو ابھی تک مرتب ومنظم تھا، کسی قدر انتشار وتضاد کا شکار ہوا، ۲۳/۲ راپریل ۱۹۶۷ء کو مجلس کا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا، ڈاکٹر سید محمود صاحب استعفا پر مصر تھے، لیکن ان کو بڑی مشکل سے اس سے باز رکھا گیا، لیکن ان میں اب پہلی سی امنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا، اس میں ان کی صحت کے روز افزوں انحطاط اور اضمحلالِ طبع کو بھی دخل تھا، بالآخر انھوں نے ایک جلسہ میں ہم لوگوں کے عرض ومعروض کے باوجود صدارت سے استعفا دے دیا، اور باتفاقِ آراء مفتی صاحب صدر منتخب ہوئے، جن سے زیادہ اس پرآشوب دور اور اختلافِ خیال کی فضا میں کوئی اور شخصیت موزوں نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو خاص امتیازی جوہر عطا فرمائے تھے، ایک ذہانت، دوسرے مختلف الخیال افراد اور جماعتوں، اور بعض اوقات متضاد ومتناقض رجحانات میں مصالحت ومفاہمت کی کامیاب کوشش، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مولانا رومؒ کی اس حکیمانہ وصیت پر پورا عمل تھا ۔

تو برائے وصل کردن آمدی ۔۔۔ نے برائے فصل کردن آمدی

نیز خواجہ حافظؒ کے اس شعر پر بھی وہ پورے طور پر کاربند تھے ۔

www.abulhasanalinadwi.org

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

بار ہا اس کا تجربہ ہوا کہ مختلف نقطۂ نظر پوری خطابت اور زور استدلال کے ساتھ سامنے آئے، اور نظر آنے لگا کہ شاید آستینیں چڑھ جائیں، کہ مفتی صاحب کے چند فقروں نے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا، مختلف جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی جیسی صلاحیت ان میں دیکھی گئی، کم قائدین میں دیکھنے میں آئی، ممکن ہے بعض ''ماہرین نفسیات'' اور ناقدین اس کو ان کی کمزوری اور ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی خوش خلقی و مروت پر محمول کریں، لیکن جب ملت میں انتشار ہو مختلف جماعتیں اور مکاتبِ خیال کسی نہ کسی درجے میں عصبیت سے متاثر ہوں تو ایسی، ''مرنجاں مرنج''، حلیم و بردبار اور باہمہ و بے ہمہ شخصیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے، اور آج یہ خلا مفتی صاحب کے انتقال کے بعد نہ صرف مجلس مشاورت کے دائرے میں بلکہ ملت کے دائرے میں بھی محسوس ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اتنا عرض کرتا چلوں کہ مجلس کے طویل و وسیع دوروں میں میں دو باتوں کی خاص کوشش کرتا تھا، ایک یہ کہ قیام (علمی، دینی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے) ہمیشہ مفتی صاحب کے ساتھ رہے، دوسرے نمازیں (خصوصاً جہری) انھیں کی امامت اور اقتدا میں پڑھی جائیں، اس لیے کہ مفتی صاحب کی تلاوت میں بڑی حلاوت تھی، وہ بھی رفقاءِ سفر میں مجھ پر خاص طور پر شفقت فرماتے تھے، اور مانوس و بے تکلف تھے، اسی تعلق و محبت کی بنا پر میری درخواست پر ۱۹۷۱ء میں رائے بریلی تشریف لائے اور واپس جا کر بڑی محبت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے خلوص و مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی محبت اور تعلق کی بات تھی کہ انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ تم اپنی کوئی تصنیف ندوۃ المصنفین کو دو، اور اس کی طرف سے اس کی اشاعت ہو، ۱۹۷۰ء کی ابتداء کا کوئی مہینہ تھا کہ ترکیسر گجرات میں محترمی مولانا غلام محمد صاحب نورگت (۱) کے

---

(۱) افسوس ہے کہ ۲۱ رمضان ۱۴۱۳ھ-۲۰ مارچ ۱۹۹۳ء کو مولانا نے ترکیسر میں سفر آخرت اختیار کیا۔ رحمہ اللہ و رفع درجاتہ

www.abulhasanalinadwi.org

دولت خانہ پر جن کا مفتی صاحب سے خاص تعلق تھا، اور میرے بھی بزرگ اور کرم فرما ہیں، اس کا ذکر آیا، اور میں نے اپنی کتاب ''حیات عبدالحیؒ'' جو انھیں دنوں میں مرتب و مکمل ہوئی تھی، ندوۃ المصنفین کو پیش کرنے کا وعدہ کیا، مفتی صاحب نے اس پر اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ وہ نومبر ۱۹۷۰ء میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہوگئی، مجھے بھی مفتی صاحب کی ایک خواہش وفرمائش کی تعمیل کی مسرت وسعادت اور کتاب کو ندوۃ المصنفین جیسے مؤقر تصنیفی ادارہ کی مطبوعات میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور وہ الحمد للہ علمی ادبی حلقوں میں پسند کی گئی، مفتی صاحب کی اجازت سے ادارۂ نشریاتِ اسلام ناظم آباد نے اس کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کیا۔

مفتی صاحب اخیر میں چند شدید بیماریوں کا شکار رہے، لیکن مزاج میں جو مروت اور لینت، پرانے تعلقات کا پاس ولحاظ اور اخلاق وایثار کا جو جوہر تھا، وہ ضروری آرام واحتیاط میں بھی مخل ہوجاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بہت سے قدیم عوارض اور جدید تکلیفوں کے باوجود دارالمصنفین کے اس سیمنار میں شرکت ضروری سمجھی ''جو اسلام اور مستشرقین کے عنوان پر ۲۶-۲۸ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ/۲۱-۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین کی طرف سے اس کے زیر اہتمام شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں منعقد ہوا، اسی سفر سے واپسی پر دریاباد کے اسٹیشن پر اچانک فالج کا حملہ ہوا، یہ انتظام غیبی تھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور چند مخلص احباب ورفقاء خاص ہم سفر تھے، لکھنؤ طبی امداد کے اسٹیشن پر پہنچ جانے کی اطلاع کردی گئی، وہاں مفتی صاحب کو اتار لیا گیا، مفتی صاحب کے نیازمندوں اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے احباب وخدام نے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس کیا، اور حصولِ سعادت اور خدمت کو غنیمت سمجھا، راقم سطور بھی لکھنؤ میں موجود تھا، وہ بھی اس سعادت میں شریک رہا، مفتی صاحب کو بلرام پور ہسپتال میں داخل کردیا گیا، دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ نے دین وملت کے اس ''ہما'' کی پذیرائی میں کوتاہی نہیں کی، جو قسمت سے اڑکر ان کے پاس پہنچ گیا تھا، خیال تھا کہ جب تک آرام نہ

ہو جائے مفتی صاحب یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، لیکن گھر والوں کا تقاضا غالب آیا اور یہ خیال ہوا کہ ان کا حق زیادہ ہے، اور شاید وہاں مفتی صاحب کو قلبی و روحانی سکون اور طمانیت ملے، اس لیے بادلِ ناخواستہ یہ جدائی گوارا کی گئی، لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی وہ ساعت مقرر آ گئی جس کے متعلق فرمادیا گیا ہے کہ:۔

"لَا یَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ".

اور نہ صرف ندوۃ المصنفین بلکہ وہ سب دینی ادارے جس کے وہ رکن ومشیر اور معاون و رفیق تھے، نہ صرف دہلی جو ان کا مسکن، اور دیوبند جو ان کا وطن تھا، بلکہ برصغیر (ہندوستان و پاکستان) ان کی رہنمائی، اصابتِ رائے، سلامت فہم اور مختلف الخیال لوگوں میں وصل و جمع کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ رحمہ اللّٰہ رحمۃ واسعۃ۔

مفتی صاحب کے لیے تقدیر الٰہی اور میرے لیے توفیق و سعادت کی بات تھی کہ مفتی صاحب کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو میں حجاز مقدس میں تھا، مجھے دہلی کے ٹیلیفون سے اس کی بروقت اطلاع ملی، میں نے اسی وقت سعودی ریڈیو اسٹیشن سے رابطہ پیدا کیا اور عزیزی مولوی نصار رفیع ندوی انچارج شعبۂ اردو جدہ ریڈیو اسٹیشن کو اپنی قیام گاہ پر بلا کر مفتی صاحب کے حادثۂ ارتحال اور ان کی شخصیت، خدمات و کمالات پر ٹاک ریکارڈ کرائی، جو اسی دن نشر ہوئی اور اسی کے ذریعے حجاز مقدس اور سعودی عرب کے دوستوں اور اہل تعلق کو حادثے کا علم ہوا، مجھ سے جو کچھ بن آیا، مفتی صاحب کے رفعِ درجات کے لیے دعا اور طواف کی سعادت حاصل کی اور اپنے مخلص احباب کو بھی اس کی ترغیب دی، اندازہ ہے کہ بہت سے مخلصین نے یہ سعادت حاصل کی، اور مفتی صاحب کے لیے دعا و طواف کے ذریعے ایک جلیل القدر عالم اور خادمِ ملت کے لیے دعا اور ایصالِ ثواب کر کے اپنے لیے بھی قبولیت اور ترقیِ دینی کا سامان کیا، شاید کم مشاہیر و زعماء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو کہ اس قدر جلد ان کے لیے دیارِ مقدسہ میں دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا اہتمام ہوا ہو۔

وذلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ

ناچیز راقم الحروف کے ذہنی شعور و تعقل کا زمانہ تقریباً ۱۹۲۴ء سے شروع ہوتا ہے، اس کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم کا انتقال ۱۵؍جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ (۲؍فروری ۱۹۲۳ء) کو ہوا، اس وقت اس ناچیز کی عمر نو، ساڑھے نو سال سے زیادہ نہ تھی، وہ فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہا تھا، والد ماجد کے انتقال کے بعد جب اضطراری طور پر چند مہینے اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ (جو زمانۂ عدت میں تھیں) اپنے وطن رائے بریلی میں رہنا ہوا تو وہاں کا ایک مفید مشغلہ اور خوشگوار فرض دینی کتابوں اور سکونِ قلب اور ''رضا بالقضاء'' پیدا کرنے والے بزرگانِ دین کے تذکرے اور مواعظ کی کتابوں کا پڑھنا اور سنانا تھا، جو والدہ صاحبہ کو سنائی جاتیں، اور قدرتاً خود بھی ان کے مطالعے اور ان سے اثر لینے کا شرف حاصل ہوتا۔

ان کتابوں میں جو گھر کے اندر موجود تھیں اور اس مقصد کے لیے مفید، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی وناظم ندوۃ العلماء کی کتاب ''ارشاد رحمانیؒ'' بھی تھی، جس میں حضرت موصوف نے اولیں زمانہ شیخ وقت حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں اپنی پہلی حاضری، پھر اس کے بعد کی زیارتوں، ملاقاتوں اور حضرت کے ارشادات وملفوظات اور خصوصی عنایات کا بڑا موثر اور دل آویز مجموعہ پیش کر دیا ہے، چونکہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب) کا بھی حضرت گنج مرادآبادیؒ سے بیعت اور عقیدت کا تعلق تھا جس کا تذکرہ مرحوم نے اپنے رسالہ ''استفادہ'' میں کیا ہے،(۱) اس لیے یہ

(۱) راقم کی کتاب ''تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ'' میں بھی وہ ''جذبِ دل'' کے عنوان سے شامل ہے، تذکرہ صفحہ ۲۰۱۔

www.abulhasanalinadwi.org

رسالہ ''ارشاد رحمانی'' شوق و رغبت بلکہ احترام و عقیدت کے ساتھ پڑھا گیا، اور اس سے غالبًا (پہلی مرتبہ) حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری کے نام اور ذات سے نہ صرف تعارف، بلکہ عقیدت و تعلق پیدا ہوا جس میں ان کے اور والد ماجد کے اس روحانی رشتہ اور مرکز عقیدت کے اشتراک کا بھی قدرتی طور پر دخل تھا۔

اس کے بعد جب عمر کے ساتھ شعور و تعقل اور مطالعہ و معلومات میں پیش رفت اور ترقی ہوئی اور ندوۃ العلماء کی تحریک سے بزرگان خاندان کے ذریعے اور بعض مضامین ورسائل کے مطالعے اور اس ماحول کے ذریعے جس میں ندوہ کی تحریک و تاریخ، اس کے فضلاء و منتسبین کا تذکرہ ہوتا رہا تھا، اور خاندان کے متعدد فرزند و نوجوان دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور خود بھی اس کی بعض تقریبات اور جلسوں میں اپنے مربی و سرپرست برادر اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے ساتھ جانا ہوتا تھا، واقفیت ہوئی اور اس سے انس و عقیدت پیدا ہوئی تو قدرتاً اس کے نامور اور بزرگ بانی اور روحِ رواں حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیریؒ کا نام اور کام بار بار کان میں پڑا اور اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن نشین ہوئی (جو اپنی جگہ پر صحیح اور قرین قیاس بھی تھی) کہ حضرت مونگیری اور والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ ارکان اور کارکنانِ ندوۃ العلماء میں سب سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب و ہم مذاق تھے، اور دونوں کا مرکز عقیدت ایک ہی تھا، پھر اس کی تصدیق (ندوۃ العلماء کے کاغذات اور رودادوں کے تفصیلی مطالعے کا موقع ملنے کے بعد) خود حضرت مولانا سید محمد علی صاحبؒ کی اس تحریر سے ہوئی، جو شوال ۱۳۱۲ھ (اپریل ۱۸۹۵ء) کی لکھی ہوئی اور ندوۃ العلماء کے اجلاسِ سوم کی روداد میں درج ہے، حضرت مولانا، مولانا سید عبدالحی صاحب کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

''یہ ہمارے نوجوان فاضل نہایت لائق اور صالح، سلیم الطبع اور زمانے کی ضرورتوں کو جاننے والے اور پر جوش ہواہ خواہِ اسلام ہیں، چار ماہ برابر دفتر میں قیام کر کے بہت لیاقت کے ساتھ کیا اور حالتِ قیام میں

بھی مصارف قیام خزانہ ندوہ سے نہیں لیے "جزاه الله خيرا الجزاء"۔

پھر جب مولانا نے ضعف وعلالت اور بعض خاص حالات کی بناپر ندوۃ العلماء کی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہی اور کم سے کم کچھ عرصہ اپنے ذوق طبع اور منصب عالی کے مطابق ارشاد وتربیت روحانی میں وقت گزارنے کے لیے اپنے کو فارغ کرنا چاہا تو اپنی نیابت کے لیے مولانا سید عبدالحی صاحب ہی پر ان کی نظر پڑی اور حسب ذیل تحریر ان کو بھیجی:۔

''میں مختصراً کہتا ہوں کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا، میں مکرر آپ کو لکھ چکا ہوں ''سپردم بہ تو مایۂ خویش را'' اگر آپ کمر ہمت باندھ کر اس طرح سے اس کے پیچھے پڑجائیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے صاف رہ کر خلقت کا کچھ خیال نہ کریں گے اور اپنے تئیں وقف کردیں گے جب تو کچھ ہوگا، ورنہ اس دفتر کو طاق میں اٹھا کر رکھ دیجیے، اور کوئی نہیں ہے جو اس بار کو اٹھائے، اور اتنا بھی چلائے جتنا آپ اٹھا رہے ہیں(۱)''۔

پھر جب ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ (۳را پریل ۱۹۱۵ء) کے جلسۂ انتظامی میں کثرتِ رائے سے مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے، اور جلسۂ سالانہ منعقدہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور ان کی نظامت کا اعلان ہوگیا تو آپ نے اپنے دور نظامت میں جو اولین اقدامات کیے ان میں حضرت مولانا سید محمد علی صاحب سے تعلق کی تجدید بھی تھی، غالباً آپ کو عرصے سے اس کا احساس تھا کہ ندوۃ العلماء اپنے بانی اور داعیِ اول سے کٹ کر رہ گیا ہے، جس نے سب سے پہلے اس کی آواز بلند کی، اور سب سے زیادہ اس کے لیے قربانی دی، فرع کا اپنی اصل سے اور وارث کا اپنے مورث سے منقطع ہوجانا بعض اوقات بے برکتی کا موجب ہوتا ہے، پچھلا دور ایک انتشار اور اختلاف کا دور تھا، اور وہ محض مددگارِ ناظم کی حیثیت سے کام کررہے تھے، لیکن اب جبکہ وہ ناظم تھے، انھوں نے اس تعلق کو تازہ کرنا چاہا، جو مولانا کی

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء۔

www.abulhasanalinadwi.org

کنارہ کشی کے بعد مضمحل بلکہ تقریباً شکستہ ہو گیا تھا، انھوں نے مولانا سید محمد علی صاحب کو بانی ندوۃ العلماءؒ کی حیثیت سے مستقل سرپرست بنانے کی تجویز پیش کی، تاکہ ان کی دعائیں اور سرپرستانہ توجہات ندوہ کے کام میں ممد و معاون بنیں اور اس تحریک کا دینی رجحان زیادہ واضح اور مستحکم ہو جائے، اور یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔

ندوۃ العلماء کے تعلق اور رشتہ ہی سے نہیں مولانا سید عبدالحی صاحب کو حضرت مونگیریؒ سے وہ تعلق اور مناسبت خصوصی بھی تھی، جو ایک شیخ و مرشد کے دو منتسبین (ایک کہن سال اور ایک نسبتاً خردسال) کے درمیان ہوتی ہے، انھوں نے بعض اوقات اپنے بعض عزیزوں کو جنھوں نے باطنی اصلاح و تربیت کی ضرورت ظاہر کی، حضرت مولانا کے پاس مونگیر بھیجا اور انھوں نے استفادہ کیا، اسی طرح ندوۃ العلماء کی نظامت اور سرپرستی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی مولانا مونگیری ندوۃ العلماء ہی کے تخیل، نصاب اور طرز تعلیم کو پسند کرتے تھے، اور اس کو ترجیح دیتے تھے، مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی مرحوم نے خود مجھ سے بیان کیا کہ مونگیر میں رہ کر جب ان کی اور ان کے برادر محترم مولانا سید نور اللہ صاحب رحمانی کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا تو مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری نے (جن کی خانقاہ میں آمد و رفت تھی) کئی بار ان دونوں بھائیوں کو ہندوستان کے ایک بڑے دارالعلوم میں بھیجنے کا مشورہ دیا لیکن مولانا نے اس پر عمل نہیں کیا، ایک مرتبہ غالباً برادر اکبر مولانا لطف اللہ صاحب نے یا کسی اور بڑے فرد خاندان نے کہا کہ "اگر آپ ان دونوں بھائیوں کو فلاں جگہ نہیں بھیجتے تو لکھنؤ ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھیج دیجیے" مولانا نے اس مشورہ کو قبول کر لیا، اور دونوں بھائیوں کو ندوہ بھیج دیا، یہ غالباً ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے، دونوں بھائیوں نے چار سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور وہاں مشکوٰۃ شریف، ہدایہ اولین وغیرہ تک پہنچے تھے کہ والد ماجد علیہ الرحمۃ نے ۹ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ (۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء) کو وفات پائی، مولانا کے قیام دارالعلوم کا یہ زمانہ مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی وفات کے بعد گزرا، جنھوں نے ۲ فروری ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ) میں وفات پائی

www.abulhasanalinadwi.org

تھی، مولانا اس کے بعد دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں تعلیم کی تکمیل کی۔

افسوس ہے کہ ان دونوں برادرانِ محترم کے زمانۂ قیام و تعلیم ندوۃ العلماء میں راقم الحروف کا ان دونوں سے کوئی ربط و تعلق پیدا نہیں ہوسکا، میں مولانا شیخ خلیل بن محمد عرب یمانی کے دولت کدہ واقع بازار جھاؤلال میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھا، کبھی کبھی اپنے بعض عزیزوں کی رفاقت میں جو ندوہ میں پڑھتے تھے، تفریحاً ندوہ چلا جاتا تھا، لیکن اس وقت ان دونوں بھائیوں سے (جن سے گہرا دینی رشتہ اور خاندانی تعلقات تھے) واقف نہیں ہوسکا، تعلیم سے فراغت اور دینی و ملی سفروں اور دوروں کے درمیان عرصۂ دراز کے بعد ایک بار اپنے ارادہ اور شوق سے بہار کے ایک سفر میں اچانک خانقاہ رحمانیہ حاضری دی اور ملاقات اور حضرت مونگیریؒ کی قبر مبارک کی زیارت اور فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، دو تین بار مولانا کی دعوت پر کبھی تنہا اور کبھی کچھ رفقائے عزیز کے ساتھ مونگیر حاضری ہوئی، اور کبھی ایک دن اور کبھی دو دن خانقاہ میں قیام اور جامعۂ رحمانیہ میں خطاب کی نوبت آئی، پھر لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر دینی اجتماعات اور مجالس میں ملاقات و نیاز حاصل ہوتا رہا، مولانا ایک دو بار رائے بریلی بھی تشریف لائے، بعد میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے جلسوں میں اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی نشستوں میں ملاقات و یکجائی رہی اور اکثر مسائل میں اتفاق رائے بھی رہا۔

غالباً فروری ۱۹۵۷ء میں بہار سے ایک صاحب (جن کا نام یاد نہیں رہا) آئے، یہ وہ وقت تھا کہ امیر شریعت ثالث بہار واڑیسہ (مولانا شاہ قمر الدین صاحب پھلواروی) کی وفات ہو چکی تھی، اور امیر شریعت رابع کا انتخاب کرنا تھا، انھوں نے جب راقم سے اس کا تذکرہ کیا اور اس کی رائے دریافت کی تو اس نے برجستہ اور بے ساختہ مولانا کا نام لیا اور کہا کہ وہ اس منصب کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں، اس کو اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ باتفاق آراء مولانا کا انتخاب ہوگیا اور وہ امیر شریعت بہار واڑیسہ رابع مقرر ہوئے، عام طور پر اس انتخاب پر مسرت و اطمینان کا اظہار کیا گیا اور بعد کے تجربات نے ثابت

کر دیا کہ (خاص طور پر اس پر آشوب دور میں جس میں ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے بڑے نازک موڑ، اور اس کے لیے خطرناک مرحلے اور اہم چیلنج سامنے آنے والے ہیں) ان کا انتخاب ہر طرح سے موزوں اور برمحل تھا، اور اس میں توفیق الٰہی اور حکمتِ خداوندی کا خاص دخل تھا، خاص طور پر ہندوستان کی آزادی، قانون سازی کے آزادانہ مواقع وامکانات کی فراہمی اور اکثریتی فرقے کے اس واضح رجحان اور طریق فکر کی موجودگی میں (جو ملک کی تقسیم، فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کے بارے میں نصاب تعلیم، انگریزوں اور متعصب ہندو مصنفین کی تصنیف کی ہوئی تاریخی کتابوں، پریس اور ذرائع ابلاغ کے پروپگنڈے کا نتیجہ تھا) واضح طور پر سامنے آگیا تھا کہ کم سے کم ایک ہزار سال کے بعد اب وقت آیا ہے کہ ہندوستان کو اس کی آبادی کے اکثریتی اور قدیم باشندوں کے اگر عقائد نہیں تو تہذیب، طرزِ معاشرت اور اس عائلی قانون پر واپس لایا جائے جو مسلمان مبلغین وفاتحین کی آمد اور مسلمان حکومتوں اور انتظامیہ کے نفوذ وتسلط سے پہلے قائم اور رائج تھا، اس کا واضح خطرہ پیدا ہوگیا تھا (جس کا احساس کرنے کے لیے کسی بڑی ذہانت اور دور بینی کی ضرورت نہ تھی) کہ اب مسلمانوں کی مذہبی آزادی، ان کے ملی تشخص، مذہبی تحفظات، قانونی استثناءات اور عائلی قانون (PARSONAL LAW) کے بقا کی کوئی ضمانت نہیں، جس میں برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی دانشمندی اور حقیقت پسندی کی بنا پر مداخلت کرنے سے بڑی حد تک احتیاط کی تھی، اب اس میں قانون سازی کے ذریعے مداخلت کی جائے گی، اور قانون ساز مجلس میں جس میں اکثریتی فرقے کے نمائندوں کی اکثریت ہوگی ایسے قانون بنائے جائیں گے جن سے شریعت اسلامی اور خاص طور پر مسلمانوں کے عائلی قانون ونظام میں (جو بہت سے مذاہب کے برخلاف) مسلمانوں کے دین ومذہب کا ایک ناقابل فصل وتنسیخ جز ہے، اور وہ ان کے عقیدے میں منزل من اللہ، اور شریعت کے منصوص وقطعی احکام ہیں، مداخلت کی جائے گی، چنانچہ متبنیٰ بل، مطلقہ کو دائمی وحینِ حیات نفقہ وگزارہ (MAINTENANCE) دلانا اس کی ایک مثال ہے۔

اس خطرے کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہانت، وسیع مطالعہ، حقائق کے ادراک، امیرِ شریعت کے فرائض کی وسعت ونزاکت کو سمجھنے، اکثریتی فرقے کے رجحانات اور مجالس قانون ساز کے اختیارات کی وسعت کا ادراک کرنے اور اخبارات ومضامین، تقاریر و بیانات اور مجلسی گفتگوؤں کے ذریعے اس قریبی خطرے کو محسوس کرنے کی صلاحیت کی ضرورت تھی، جو ہر قائد اور عالم کو آسانی سے میسر نہیں ہوتی، اس کے لیے ذہانت، مطالعے کی وسعت، خطرے کے ادراک کے ساتھ توفیق الٰہی کی بھی ضرورت ہے، اور بعد کے واقعات اور تجربے نے ثابت کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کو اس دولت سے نوازا تھا، وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

امارتِ شریعت کے ابتدائی وبنیادی فرائض اور دائرہ عمل کے ساتھ جس میں مختلف مقامات پر قضاء شرعی کے مراکز (دارالقضاء) کا قیام، قضاۃ کا تقرر اور مسلمانوں کو سرکاری عدالتوں (COURTS) کے بجائے شرعی عدالتوں کی طرف رجوع کی ترغیب اور ایسے فیصلوں کا صدور شامل ہے جن کو سرکاری عدالتوں میں بھی چیلنج نہ کیا جاسکے اور جن کے بارے میں مولانا کے دور امارت میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ سرکاری عدالتوں نے بھی عام طور پر ان فیصلوں کا احترام کیا اور بہت سے مواقع پر ان کو قائم رکھا، اسی طرح اصلاح معاشرہ کی تحریک جس کا مولانا کے دور امارت میں خاص طور پر کام ہوا۔

مولانا کے دور امارت کا اصل کارنامہ اور تاریخی کردار ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام ہے جس کی ۲۷، ۲۸؍دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں تشکیل ہوئی اور جس کے صدر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند منتخب ہوئے، جو اس اہم ملی منصب وقیادت کے لیے موزوں ترین شخصیت تھے، اور جن کو زیادہ سے زیادہ اعتماد واحترام عام حاصل تھا، اور مسلمان فرقوں، جماعتوں اور تنظیموں کی اس میں ایسی نمائندگی ہوئی جو کم کسی نمائندہ ادارہ اور جماعت میں ہوتی ہے، پھر اس کے بعد سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی تنسیخ جو اس نے شاہ بانو کیس میں جو اس نے ۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کو دیا تھا، ۵؍مئی ۱۹۸۶ء کو

پارلیمنٹ سے نئے مسلم مطلقہ بل کا متفقہ طور پر پاس ہونا، اس کے ذریعے مسلم مطلقہ قانون کے بارے میں اس قانون وتعامل کا باقی رہنا جو سپریم کورٹ کے فیصلہ سے پہلے رائج اور معمول بہ تھا، اکثریت کے رہنماؤں، فرقہ پرست جماعتوں، اور انگریزی، ہندی پریس کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان سپریم کورٹ کے فیصلے کو بدلوانا چاہتے ہیں، اور اپنے قدیم شرعی قانون کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، تو انھوں نے اس کو قومی وقار کا مسئلہ بنالیا، اور مسلمانوں کے اس مطالبے کے خلاف ایسے شدید ردعمل کا اظہار کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے منسوخ ہوجانے اور مسلمانوں کے اپنی شریعت پر عمل کرنے کی آزادی سے ملک پر کوئی بجلی گر جائے گی، یا کوئی بیرونی طاقت حملہ کرنے والی ہے، اس تحریک کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوگیا، اور ایسا نظر آنے لگا کہ اس صورت حال میں تبدیلی ناممکن ہے، لیکن عاقلانہ اور متوازن قیادت اور مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ۵ / مئی ۱۹۸۶ء کو مسلم مطلقہ بل کی پارلیمنٹ میں منظوری عمل میں آئی، آنجہانی وزیر اعظم ہند راجیو جی کے مسلم خاتون کے بارے میں اسلام کے منصفانہ اور فراخ دلانہ قوانین اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں واضح بیانات، پھر خود مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ کی ہمہ گیر تحریک اور تعمیری، اصلاحی وفکری وعملی جدوجہد اور اس کے اثرات، پرسنل لا بورڈ کے وہ عظیم الشان جلسے جو بمبئی، کلکتہ، بنگلور، رانچی، حیدرآباد اور کانپور میں ہوئے، اور جن کی (حاضرین کی تعداد، ان کے تاثر اور ان کی سنجیدگی اور مقصدیت کے غلبہ میں) ہندوستان کی قریبی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے، اس پورے سلسلے کی کامیابی اور اس کے دوررس اثرات میں جو عرصے سے کسی تحریک میں دیکھنے میں نہیں آئے تھے، مولانا کے تعمیری ذہن، حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر، دماغی توازن اور مقصد سے اتفاق رکھنے والے تمام عناصر سے مخلصانہ تعاون، ان کی قدردانی، ان سے کام لینے کی صلاحیت اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کے حسب مرتبہ سلوک ومعاملہ کرنے کی فکری ومزاجی قابلیت کا بھی بڑا دخل ہے، اب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ''، جس طرح ملت اسلامیہ ہندیہ کا متفقہ پلیٹ فارم اور اجتماعی نمائندہ

www.abulhasanalinadwi.org

ہے ویسا ہندوستان میں کوئی دوسرا ملی و مذہبی بلکہ سیاسی پلیٹ فارم بھی نہیں ہے۔

راقم الحروف کو اپنے دور صدارت میں (ا) جو ۲۷/۲۸ /دسمبر ۱۹۸۳ء سے شروع ہوا) مولانا کے ساتھ دورہ کرنے، جلسوں میں خطاب کرنے، اور اس وقت کے وزیر اعظم ہند آنجہانی راجیو جی سے بار بار ملنے، ان سے اس مسئلہ پر تنہائی میں اور کبھی اس وقت کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور بعض دوسرے مشیرانِ حکومت کی موجودگی میں گفتگو کرنے پھر ان کے بعد وی پی سنگھ جی (سابق وزیر اعظم ہند) اور دوسرے ذمہ داران حکومت سے بار بار ملنے کا موقع ملا، اس میں راقم کو مولانا کی بے نفسی، تواضع، حقیقت پسندی اور مقصد سے لگن اور اس کی فکر کا اندازہ ہوا، اور اب یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس مسئلہ کی کامیابی میں (جس حد تک ہوئی) مولانا کی بے نفسی، اشتراکِ عمل کی صلاحیت اور صرف مقصد کے حصول سے دلچسپی کو بہت بڑا دخل ہے، انھوں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان گفتگوؤں میں نمایاں اور پیش پیش ہوں اور کامیابی کا سہرا ان کے سر بندھے، اور وہ پریس میں یا پبلک میں زیادہ نمایاں مقام حاصل کریں۔

اس سلسلے میں ایک لطیفے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، جس سے مولانا کی مزاجی کیفیت، بے نفسی اور تواضع کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ دہلی کے قیام میں اپنی قیام گاہ (حافظ کرامت صاحب کی کوٹھی واقع نظام الدین) سے ہم دونوں راجیو جی سے ملنے کو نکلے، راقم کے ہاتھ میں کچھ فائلوں اور کاغذات کا ایک بنڈل تھا، مولانا نے بے تکلف اس کو میرے ہاتھ سے اس طرح لے لیا گویا وہ ایک رفیق ہیں، اور میں اصل نمائندہ اور وفد کا رہنما ہوں، مولانا مجھ سے عمر اور علم و فضل میں بڑے ہی تھے، پھر ان کی نسبت پدری میرے لیے ہر طرح قابل احترام تھی، میں نے کہا کہ مولانا! یہ بتایئے کہ اگر حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیریؒ اور مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ ساتھ ہوتے تو یہ پلندہ کون

---

(۱) یہ فیصلہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی وفات کے بعد مدراس کے اجلاس عام (۲۷/۲۸ دسمبر ۱۹۸۳ء) میں ہوا، جس میں راقم اپنی علالت وجع المفاصل (GOUT) کی وجہ سے شرکت نہیں کرسکا تھا، اور اس کو اس کی اطلاع اچانک بستر علالت پر ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

لیتا؟ میرا اشارہ اس طرف تھا کہ یقیناً یہ مولانا سید عبدالحی صاحب ہی اپنے ہاتھ میں رکھتے، جو حضرت مونگیریؒ سے کم عمر تھے اور ان کو اپنا بڑا اور بزرگ سمجھتے تھے، مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ جس کو مولانا محمد علیؒ کہتے ۔

پرسنل لا بورڈ کی تحریک (جس میں ہنگامہ خیزی، اشتعال انگیزی اور اس سے قیادت و زعامت حاصل کرنے کے پورے امکانات تھے) مولانا نے اپنے ذہنی و مزاجی توازن، اخلاص، طویل و قدیم تجربات کی روشنی اور سب سے بڑھ کر توفیق الٰہی سے اس طرح چلائی کہ اس میں ہنگامہ خیزی، عامیانہ پن اور سیاسی و فرقہ وارانہ تحریکات کی طرح ابتذال، ہنگامہ آرائی اور انتشار انگیزی پیدا ہونے نہیں پائی، ملک کے بیسیوں مقامات پر ایسے بڑے جلسے ہوئے جن کی نظیر بعض جگہ سالہا سال کی تاریخ میں نہیں ملتی، کلکتہ کے اجلاس عام (۱۹۸۵ء) کے ایک جلسے میں جو شہید مینار کے میدان میں ہوا حاضرین کا محتاط اندازہ نصف ملین (پانچ لاکھ) انسانوں کا ہے، خود ہمارے شہر رائے بریلی کا (جو ہمیشہ سے سیاسی تحریکات سے دور اور عظیم پبلک جلسوں سے محروم ہے) اتنا بڑا جلسہ ہوا جس کی نظیر کم سے کم راقم کی یاد میں نہیں ملتی (۱)، پھر کشمیر سے کالی کٹ اور کنیا کماری تک بورڈ کے وفد کے دورے ہوئے، جن میں آدھی آدھی رات کو بھی مسلمانوں کے بڑے بڑے گروہ اسٹیشنوں پر وفد کے ارکان (جن میں زیادہ تر علماء ہوتے تھے) اور مخلصین قائدین کی زیارت کے لیے آتے تھے، پھر ہزاروں کی تعداد میں راجیو جی اور وزیرِ قانون مسٹر اشوک سین کے نام مسلمانوں کے تار آئے، جن میں بورڈ کے مطالبے کی مکمل تائید کی گئی تھی، اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمنٹ نے (۵/مئی ۱۹۸۶ء کو) نیا بل پاس کر دیا اور اس مہم و تحریک کا ایک مرحلہ پورا ہوا۔

لیکن جمہوری ملکوں میں جہاں مجالس قانون ساز آزاد ہوتی ہیں، اور جہاں پریس ذرائع ابلاغ، سیاسی مصالح اور انتخابی اغراض کارفرماتے ہوتے ہیں، کبھی اطمینان کی آخری

---

(۱) قومی آواز لکھنؤ کی رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ ۱۰۰۰۰۰ کا مجمع تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

سانس نہیں لی جاسکتی، اور وہاں واقعات، نفسیات اور مصالح واغراض کے مسلسل مطالعے اور بیدار مغز رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اس کارواں کے بارے میں آخری منزل پر پہنچ جانے اور کسی تحریک، جدوجہد اور ذمہ دارانہ ادارے کو اپنے کو فارغ اور سبکدوش سمجھنے کا جواز نہیں۔

مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کا احساسِ ذمہ داری، ملت کے ساتھ ربط وتعلق اور اس کے مصائب وابتلاءات پر دل گیر وفکر مند ہونا، مسلم پرسنل لا کی تحریک ہی میں محدود نہیں تھا، وہ فرقہ ورانہ فسادات، مسلمانوں کی نسل کشی، مساجد کے انہدام وغیرہ کے واقعات پر بھی ایسے ہی فکر مند ہو جاتے تھے، اور ان کے سلسلے میں بھی کوئی سعی وکوشش اٹھا نہیں رکھتے تھے، چنانچہ نومبر ۱۹۸۹ء میں بھاگل پور میں ایک سفاکانہ اور انسانیت سوز فرقہ وارانہ فساد ہوا، مولانا نے اس سلسلے میں جو کچھ ممکن تھا کیا، انھوں نے ایک بڑا مؤثر اور دردانگیز خط تحریر فرمایا، جس میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، راقم نے اس مکتوب کو سامنے رکھ کر اور اس میں سے کچھ اقتباسات اخذ کر کے اکثریتی فرقہ کے مذہبی پیشواؤں، ملک کے سیاسی رہنماؤں اور ہندوستان کے ممتاز دانشوروں کے نام ایک پُر اثر خط کا مسودہ بنایا جس کی بنیاد اور مواد مولانا ہی کا خط تھا، وہ خط ڈاک اور ملاقاتوں کے ذریعے سربرآوردہ ترین اشخاص تک پہنچایا گیا، اور جہاں تک اندازہ ہے وہ بے اثر نہیں رہا(۱)۔

مولانا کا ایک اہم ملی، علمی وشرعی کارنامہ اور مبارک اقدام اردو میں تدوینِ قانونِ اسلامی وشرعی کی ترتیب وجمع کا وہ کام ہے، جو انھوں نے ممتاز علماء، ماہرینِ قانون شرعی اور اہل اختصاص کے ذریعے خانقاہ رحمانی میں شروع کیا اور جو بہت حد تک ان کی زندگی میں مرتب ومکمل ہو گیا تھا، اب اس پر آخری نظر ڈالنے اور اس کو انگیریزی میں (ماہرینِ قانون وقابل اعتماد اشخاص کے ذریعے) منتقل کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ عدالتوں میں مستند ماخذ اور حوالے کا کام دے سکے اور قدیم (Mohammadan Law) کی جگہ لے سکے۔

ان حالات، واقعات وحقائق کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ مولانا کی وفات سے نہ

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" حصہ چہارم صفحہ ۱۸۱ تا ۱۹۴

www.abulhasanalinadwi.org

صرف امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جیسی فعال، موثر ومبارک تحریک وتنظیم (جس کی نظیر ملنی مشکل ہے) اور ریاست ہائے بہار واڑیسہ کی دینی وملی قیادت میں مولانا کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا بظاہر پر ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، اور نہ صرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا فعال اور ضروری ادارہ اپنے بانی ومحرک وروح رواں شخصیت سے محروم ہوا بلکہ ہندوستان کی دینی، ملی وفکری قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا جس کا قحط الرجال کے اس دور میں پر ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، مولانا کی شخصیت اپنی ریاست اور ملک ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ اس عہد کے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتوں میں تھی، اللہ تعالیٰ نے علم واخلاص عزم وقوت ارادی، اصابتِ رائے، توازن واجتماعیت کی ان کی ذات میں ایسی متعدد خصوصیتیں پیدا فرمادی تھیں جن کا ایک شخصیت میں بہت مشکل سے اجتماع ہوتا ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسے متعدد یگانہ دینی وملی تاریخی کام لیے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ (۲۰؍مارچ ۱۹۹۱ء) کو اپنی قیام گاہ دائرۂ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں فجر کی نماز سے ذرا پیشتر لکھنؤ کی اطلاع کے حوالے سے جو ٹیلی فون کے ذریعے وہاں پہنچی تھی یہ خبر بجلی بن کر دل ودماغ پر گری کہ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ، وجنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا انتقال ہوگیا، "اِنّا للّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون"۔

مدارس سے علماء، دانش گاہوں سے فضلاء اور سیاسی میدانوں اور جدوجہد کے مرکزوں سے قائدین اور زعماء نکلتے رہیں گے، لیکن ہاتفِ غیب کی صدا کانوں میں آتی رہے گی۔ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

شاہ فیصل شہیدؒ

حجاز کی ہر حاضری کے موقع پر اس سرزمین مقدس میں جو اسلام کا مرکز ہی نہیں، اسلام کا دھڑکتا ہوا دل ہے، دینی واخلاقی انحطاط کے آثار، اور دولت ومغربیت کے بڑھتے ہوئے اثرات دیکھے، دعوت اور دینی تعلیمات کی گرفت معاشرے پر سے برابر ڈھیلی ہوتی جارہی تھی اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر (جس کے نام سے مملکت میں ایک مستقل ادارہ قائم تھا، جس کو حکومت کی تائید وسرپرستی حاصل تھی) اپنا اثر اور رعب کھوتا جارہا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت نے جہاں عقائد کے میدان میں اور توحید خالص کی تبلیغ اور ردِّ شرک کے دائرہ میں (جو بعثت انبیاءؑ کا اہم ترین مقصد اور اسلام کی بنیادی دعوت ہے) ایک انقلابی اور تجدیدی کارنامہ انجام دیا تھا، وہاں وقت وفرصت نہ ملنے اور دعوت کے اپنی باطنی قوت میں اس درجے تیار نہ ہونے کی وجہ سے (جو ایسی اصلاحی تحریکوں کے لیے ضروری ہے) وہ اس نسل کو تیار نہیں کرسکی تھی جو مادّیت ودولت کی فراوانی اور ترقی وتمدن کی طغیانی کے موقع پر قناعت واعتدال، دنیا پر آخرت کو ترجیح اور استقامت نفس کا نمونہ پیش کرسکے، پھر علمائے کبار اور شیخ کے خاندان کے ذی علم وذی اثر افراد کے (جو آل الشیخ کہلاتے ہیں) حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز اور حکومت کے تنخواہ یاب ہونے کی وجہ سے رضا کارانہ خدمت علم ودین اور زاہدانہ متقشفانہ زندگی کا وہ نمونہ عوام کی نظر سے اوجھل ہوگیا، جس کا معاشرے پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ادیان وملل کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کی روح وجوہر، دینی واخلاقی خصوصیات، اور روحِ عصر اور زمانے کے تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام اور فساد وانحراف کے وسائل ومواقع کی موجودگی میں صراط مستقیم پر قائم رہنا مشکل ترین کام ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

جو عمیق و ہمہ گیر تربیت، اعلیٰ درجہ کی استقامت اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت کی طالب و متقاضی ہے، اور تاریخ انسانی میں یہ کارنامہ تنہا صحابہ کرامؓ کی جماعت کی خصوصیت ہے جو سلطنت و دولت کے متلاطم دریا سے گزر گئے، اور ان کا دامن بھی تر نہ ہوا، افسوس ہے کہ حکومت سعودیہ کو (جو اس عہد کی وہ واحد مسلم سلطنت ہے جس کی بنیاد، دعوت و جہاد پر پڑی تھی) وہ مخلص و ذہین، بے لوث و بے غرض مشیر سلطنت اور منصوبہ بند نہیں ملے جو حکومت کے اس آغاز و عروج کے درمیان مناسبت اور دین کی تعلیمات، اور تمدن و ترقی کے ناگزیر تقاضوں کے درمیان تعاون ومفاہمت پیدا کر سکتے، اس کو زیادہ تر مصری و شامی مشیر و کار پرداز ملے جو خود اس حکومت اور اس دولت کا استحصال کرنا چاہتے تھے اور جن کی خود مصلحت یہ نہیں تھی کہ یہ نوخیز سلطنت (جو اپنی روح توحید و جہاد سے عالم اسلام کی عظیم ترین طاقت بن سکتی تھی) دینی پابندی اور احتیاط واعتدال کے اسی دائرے میں رہے جس میں ان کے مقاصد کی تکمیل کا سامان نہیں۔

ادھر دوسری آزمائش یہ پیش آئی کہ ۱۹٦۰ء کے بعد سے صدر ناصر نے قومیت عربیہ کی آواز بلند کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ مشرق وسطیٰ میں صرف انہیں کی بالاتری اور قیادت قائم ہو، اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا نشانہ مملکت سعودیہ تھی، جہاں سے نیا نیا پٹرول نکلا تھا، اور دولت کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا، انھوں نے پیہم اس مملکت کو للکارنے، اس کے حکمرانوں کی کمزوریوں کی تشہیر کرنے اور اس مملکت میں انتشار پیدا کرنے کا ایسا کام شروع کر دیا جس سے مملکت میں ایک بے اعتمادی اور احساس کہتری کی فضا پیدا ہونے لگی، مصر کا ریڈیو اور اس کا پریس، عالم عربی کا طاقتور ترین ریڈیو اور پریس تھا، اس کا علاج بعض دانش مندوں نے یہ سمجھا کہ خود اس ملک کو ترقی اور جدید تمدن کے مظاہر سے آشنا کیا جائے، یہاں تفریح اور حظِ نفس کے مواقع مہیا کیے جائیں، حجاز مقدس کو بھی اس سطح پر لے آیا جائے کہ کسی "زندہ دل" کا دم یہاں نہ گھٹے، اور اس کو مصر جانے اور وہاں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے دل بہلانے کی مجبوری پیش نہ آئے۔

مجھے ۱۹٦۳ء کی حاضری میں مملکت کے اس رجحان کا علم و اندازہ ہو گیا تھا، اس وقت

www.abulhasanalinadwi.org

شاہ سعود سربراہِ مملکت اوران کے بھائی امیر فیصل ولی عہد اوروزیراعظم تھے، حسن اتفاق سے میرے قیام مدینہ کے دوران ایک مرتبہ وہ مدینہ آئے، میں نے اپنے کرم فرما اور بزرگ دوست شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ الباز سے جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر تھے، اور امیر فیصل خاص طور پران کا احترام کرتے تھے، درخواست کی کہ وہ تنہائی میں میری ان سے ملاقات کا انتظام کردیں، انھوں نے اس کا انتظام کردیا، اور میں مدینہ میں ان کی شاہی قیام گاہ پر ایک خصوصی مجلس میں ملا، جس میں صرف میرے عزیز رفیق محمد رابع ندوی تھے، میں نے جاتے ہی ان سے درخواست کی کہ میں جب تک اپنی معروضات پیش کروں وہ صرف سماعت پر اکتفا فرمائیں، انھوں نے اس کو قبول کیا، میں نے زبانی گفتگو کی، اور اس اندیشے کا اظہار کیا کہ مملکت بالخصوص حجاز مقدس کو ترقی یافتہ عرب ملکوں کے راستے پر لے جایا جارہا ہے، اور ایسے منصوبے زیرِ غور ہیں جن سے حرمین شریفین میں حاضری کے مقاصد، ان کے ایک مثالی اسلامی شہر ہونے کی حیثیت اور ان کے تقدس کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے، انھوں نے خاموشی کے ساتھ میری گفتگو سنی، حجاز مقدس کی تخطیط (منصوبہ بندی) کے بارے میں اپنی مملکت کی احتیاط اور نیک نیتی کا اظہار کیا، اور مجھے اطمینان دلایا کہ یہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی، جو مرکز اسلام کے مقام و پیغام کے منافی ہو۔

میں نے اس کے بعد، جب انھوں نے زمام سلطنت سنبھالی، ایک مفصل مکتوب لکھ کر پیش کیا جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ حجاز مقدس کی ایک مخصوص "شخصیت" مقام و پیغام ہے، اور ہر دور میں اس کی حفاظت ضروری ہے، تجدد و ترقی کا کوئی قدم، اور کوئی رفاہی و تفریحی اقدام جائز نہیں، جو اس کی شخصیت اور مقاصد کو ادنیٰ درجے کا نقصان پہنچاتا ہو، اس کے بعد ایک دوسرا مکتوب لکھا جس میں صاف طریقے پر عرض کیا کہ کسی ملک کی آبادی کے لیے فارغ البالی، تفریح طبع اور من مانی زندگی گزارنے کے اسباب اور مواقع مہیا کرنے اور اس کے ذریعے اس کو حکومت پر نکتہ چینی اور حالات میں تبدیلی اور اصلاح پیدا کرنے کے خیال سے غافل و مشغول رکھنے کا تجربہ بنو امیہ کے دور سے اس وقت تک ناکام رہا ہے، یہی طبقہ جس کے

اندر دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اوراس کو کچھ اور سوچنے کی بظاہر فرصت نہیں ہوتی، سب سے زیادہ غیر مطمئن، ناشکرا، اور احسان فراموش ہوتا ہے، اور سرکشی اور بغاوت کا ظہور اسی سے ہوتا ہے، اس کے بالمقابل دیندار طبقہ ہی قابلِ اعتماد اور وفادار ثابت ہوتا ہے (۱) اس کا جواب انھوں نے اپنے ۹؍صفر ۱۳۸۵ھ (۱۱؍جون ۱۹۶۵ء) کے مکتوب میں دیا، جس پر ان کے دستخط ہیں (۲) اس کے ماسوا ایک مرتبہ جدہ میں، اور ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں میری ان کی تنہائی میں گفتگو ہوئی، جس میں میں نے اپنے خدشات ظاہر کیے، اور انھوں نے نمبروار اپنی اور حکومت کے موقف کی وضاحت کی، میں ملک معظم کی غیر معمولی ذہانت، تحمل وحسن اخلاق وسادگی سے بڑا متاثر ہوا، اور یہ تاثر ہمیشہ قائم رہا، لیکن اندازہ ہوا کہ اسباب ومجبوریاں کچھ بھی ہوں، مملکت اسی رُخ پر چلتی رہی جس سمت پر اس نے ۶۳-۱۹۶۴ء میں قدم اٹھایا تھا۔

کسی بادشاہ یا والی سلطنت کی وفات کوئی نیا اور انوکھا حادثہ نہیں، اس قسم کے واقعات اور حادثات دنیا میں بہت پیش آتے رہتے ہیں، بادشاہ دنیا سے رخصت بھی ہوتے ہیں وہ تخت وتاج سے محروم بھی کیے جاتے ہیں لیکن خادم حرمین کی شہادت جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں آنکھوں کی بارش سے کام لیا جائے تو روا ہے، اگر حرم کے ایک خاکروب یا سقّہ کا بھی انتقال ہو تو ایمان کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان اسے اپنا غم سمجھے اور وہ تو خادم الحرمین تھے نہ صرف خادم الحرمین بلکہ کتنے فتنوں کے لیے سدّ سکندری، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ عمر بن عبدالعزیز تھے یا سلطان صلاح الدین ایوبی تھے، ہم نے کبھی ان کے سامنے بھی اس قسم کی بات نہیں کہی، ان میں بشری کمزوریاں بھی تھیں، بہت سی خامیاں بھی تھیں لیکن یہ نسبت عالی بہرحال ان کو حاصل تھی، یہاں بیٹھ کر صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس شخص نے پچھلے چند برسوں میں دنیا میں عربوں اور مسلمانوں کا وقار اور وزن کتنا بڑھا دیا تھا، وہ عربوں کی آبرو تھے، اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے اپنی ذکاوت وذہانت، دانشمندی اور فراست اور سوجھ بوجھ کے ذریعے

(۱) یہ اصل مکتوب "كيف ينظر المسلمون إلى الحجاز و جزيرة العرب" کے صفحات ۴۴-۵۴ پر ملاحظہ ہو۔
(۲) ان خط کا فوٹو مصنف کی اصل عربی کتاب "كيف ينظر المسلمون إلى الحجاز و جزيرة العرب" میں ص ۵۴-۵۵ کے درمیان دیکھا جاسکتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

وہ پوزیشن حاصل کر لی تھی کہ بڑی طاقتوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑا، داخلی اور خارجی ہر قسم کے فتنے ان کو اور ان کے ملک کو گھیرے ہوئے تھے ایک طرف عراق کا کمیونسٹ نواز ملک دوسری طرف جنوبی یمن میں ایسی اسلام دشمن حکومت کہ اس کی مثال نہیں ملتی، ابھی حال میں صومالیہ میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ اسلام میں کبھی نہیں ہوا تھا، دس علماء کو حکومت کے بعض مخالف اسلام وقرآن قوانین پر تنقید کرنے کے جرم میں زندہ جلادیا گیا، بورقیبہ نے اسلام کے بارے میں برسرعام جو گل فشانیاں کیں ان سے کون واقف نہیں ہے، اسلام دشمنی کے اس دور میں یہی ایک شخص تھا جو اپنے موقف پر قائم تھا، جو قرآن اور اسلام کا نام فخر سے لیتا تھا جو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ ہاں ہمارے یہاں قرآن کا قانون نافذ ہے اس دور میں کسی کا دل وجگر ہے جو اس ترقی پسند زمانے میں کھل کر کہہ سکے کہ بے شک اسلام کا نظام دائمی اور عالم گیر ہے، ہمارا دستور قرآن ہے، ہمارا قانون شریعت ہے، اس شخص کے جگر میں سارے جہاں کا درد تھا، حبشہ میں مسلمانوں پر ظلم ہو یا فلپائن میں عیسائی مسلم جنگ ہو، اریٹریا میں مسلمانوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹے، یہ پہلا شخص تھا جو اظہار ہمدردی کرتا تھا اور بغیر کسی مبالغے کے ان کے لیے اپنی دولت کے دہانے کھول دیتا تھا۔

ایک پہلو اور بھی ہے جو علوم دینیہ کے طالب علم اور نمایندہ کی حیثیت سے ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے اس امت کی تقدیر میں لکھ دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی اور بیش قیمت ہستی کا سانحہ برداشت کر سکے، غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر تو ایک مشق تھی آنے والے حادثے کے لیے جیسے حضرت عمرؓ جیسے قوی اعصاب کے مالک برداشت نہ کر پائے تھے، پھر خلفائے راشدین میں چار میں سے تین خلفاء اسی راہ سے گئے، حضرت عمرؓ کی شہادت سے بڑھ کر کوئی حادثہ نہیں، ایسے نازک دور میں جب مسلمانوں کو فاروق اعظمؓ کی شدید ضرورت تھی ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، ملت نے اس واقعے کو بھی برداشت کیا، اس امت کے ساتھ خدا کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے امت کو یہ سبق بار بار دیا جاتا رہا ہے، اس بات سے ہمیں اللہ پر یقین ہے کہ وہ ہماری

www.abulhasanalinadwi.org

دست گیری فرمائے گا، موجوں کا کیا ہے وہ آتی ہیں گزر جاتی ہیں، لیکن دریا کے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے یہ بھی ایک موج تھی بے قراری تڑپی اور گزر گئی۔

تاہم یہ واقعہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ دولت عثمانیہ کے زوال کے بعد سب سے اہم اور دوررس نتائج رکھنے والا واقعہ ہے، دو چار برس بعد یہ واقعہ ہوتا تو ممکن تھا کہ اس کا یہ اثر نہ محسوس ہوتا، لیکن اس وقت دنیا کی نگاہیں ان پر تھیں، موجودہ حالات میں ان کی شاہ کلید کی حیثیت تھی اسلام کے وہ پشت و پناہ ہو گئے تھے، حجاز کی پاسبانی اور حرمین کی حفاظت اور پھر اہم ترین اسلامی مقدمے کی وکالت ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے ان کی ذات میں ایک قسم کی دلآویزی اور محبوبیت پیدا ہو گئی تھی، یہ قائدانہ خصوصیات کسی بھی اسلامی ملک کے قائد میں جمع ہو سکتی ہیں لیکن ان کی اہمیت کو خادم الحرمین والی حیثیت نے بہت زیادہ بلند کر دیا تھا، اسلامی تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ ایک ستارہ غروب ہوتا ہے تو دوسرا طلوع ہوتا ہے، امت اس گردش لیل و نہار کی عادی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی اور موج اس دریا سے اٹھے گی اور کسی اور سمت سے کوئی ستارہ طلوع ہوگا۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

وہ ستارہ کہاں سے طلوع ہوگا کس افق پر نمودار ہوگا ہم نہیں جانتے لیکن اللہ کی ذات سے ہمیں یہی امید ہے۔

وہ ایک بادشاہ تھے لیکن کسی عام بادشاہ پر ان کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ ان کی سادگی، تواضع، نماز کی پابندی اچھے اچھے مسلمانوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی، کہیں زخم لگے، کوئی بے چین ہو سب سے پہلی آواز اس کی حمایت میں اس کی اٹھتی تھی، افریقہ جس طرح تیزی سے اسلام کی جھولی میں آ رہا تھا اور یورپ کی مشنریاں فریاد کناں تھیں وہ سب انھیں کی دلسوزی کا نتیجہ تھا، یوگنڈا میں ان کے دورے کا منظر دیکھ کر کئی سو عیسائی مسلمان ہو گئے، افریقہ میں اسلام کی اشاعت انھوں نے اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھ لی تھی، وہ اس کو اپنا فرض سمجھتے تھے،

www.abulhasanalinadwi.org

بعض اوقات لوگ ان سے غلط فائدہ اٹھالیتے تھے، ہم نے ان کی جود و سخا کو کئی بار "غلط بخشی" کا نام بھی دیا تھا، یہاں معمولی ذمہ داروں سے ملنا آسان کام نہیں، لیکن وہ شخص جس کی رائے پر امریکہ اور روس کی نگاہیں لگی رہتی تھیں اس کے پاس ایک مسلمان اپنی ضرورت کے لیے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتا تھا، آخر میں ان کی گفتگو بالکل وعظ بن گئی تھی، آپ انہیں دیکھتے تو کسی عام عرب سے زیادہ نہ سمجھتے اور کام کی دھن اتنی کہ ۱۸-۱۸ گھنٹے کام کرتے تھے۔

سعودی عرب کے حکمراں شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود کی شہادت کا واقعہ عالم اسلام کے لیے ایسا المناک اور دلسوز حادثہ ہے جس نے دنیا کے ہر صاحب ایمان شخص کو رلایا اور جھنجھوڑ کے رکھ دیا، شاہ فیصل مرحوم اپنے آپ کو ایک بادشاہ سے زیادہ خادم حرمین شریفین کہلانا پسند کرتے تھے، ان کی شہادت سے عالم اسلام کو جو خسارہ ہوا اس کو ہر صاحب ضمیر اور حساس دل شخص نے محسوس کیا، وہ ایسے وقت ہم سے رخصت ہوئے جب کہ عالم اسلام انتہائی نازک ترین دور سے گزر رہا ہے، اور اپنے کارناموں سے بھری ہوئی زندگی کے سبب سے اچھے موڑ پر ان کا حادثۂ وفات پیش آیا، انھوں نے سارے کارنامے خاموشی، سکون، سنجیدگی، ثابت قدمی اور اعلیٰ ہمتی، دور بینی، ذہانت اور ایسی ایمانی قوت سے انجام دیے کہ جس کی مثال اس زمانے کے امراء وحکام کے طبقے میں ملنی مشکل ہے، ان کی زندگی عالمی و اسلامی تاریخ کا ایک قیمتی جزو بن چکی ہے، جس کے دو اہم مرکزی نقطے ہیں، ان میں سے ایک اسلامی غیرت وحمیت اور اسلامی کوششوں کا تعاون وہ جہاں کہیں بھی انجام دی جارہی ہوں اور حرمین شریفین سے ان کو جوڑنا اور ان سے رشتہ مضبوط و مستحکم کرنا، اس کے تئیں ذمہ داری کا احساس وشعور اور وہ عزت جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے، ان تمام امور میں شاہ فیصل مرحوم نے اپنی ذمہ داری کو خوبی کے ساتھ ادا کیا، اور ان سے متعلق ہر کام میں خوب دولت خرچ کی، چاہے وہ مساجد کی تعمیر ہو یا حجاج کا سقایہ ہو، یا تبلیغ ودعوت الی اللہ ہو، انھوں نے بڑی دریادلی سے کام لیا، جس کی نظیر نہیں ملتی، اور ہر موقع پر اور گفتگو کے دوران اسلام سے اپنی وابستگی کو کھل کر ظاہر کیا، اور ایک لمحے کے لیے بھی اس میں ان کو تذبذب وتردد نہیں ہوا، شریعت الٰہی کو نافذ کرنے اور اسلامی دفعات کی تنفیذ واجرا کے سلسلے میں ان کا موقف سخت رہا، اور کبھی انھوں نے اس میں لچک نہیں دکھائی

www.abulhasanalinadwi.org

اور جس قدر ممکن ہوسکا انھوں نے اپنی مملکت کو خارجی و بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ عہد حاضر میں ان کا ملک ان کے زمانے سے زیادہ کسی زمانے میں ظاہری واخلاقی اعتبار سے ترقی یافتہ نہیں رہا، ان کے زمانے میں جو امن وسلامتی اور بیداری وترقی کا زمانہ ہے جس میں دنیا کے مشرق ومغرب میں مسلمانوں میں ان کی شہرت تھی، جوان کے لیے دعائیں کرتے تھے، اوران کی تعریف کیا کرتے تھے، قریب سے دیکھا ہے ہمیں ان سب سے امید قوی ہے کہ وہ اسی قوت وارادے کے ساتھ اوراسی ایمانی جذبے کے ساتھ انشاء اللہ اس کارواں کو آگے بڑھائیں گے۔ ان کے اوپر بڑی نازک اوراس معنی میں دوہری ذمہ داری ہے، کہ ان کا ملک مرکز اسلامی کی حیثیت رکھتا ہے اورانھیں بلد امین اور رسول امین کی آرام گاہ کی نگرانی کا شرف حاصل ہے، لہٰذا ہمیں اگر دیگر مسلم حکام سے ایک بار امید ہوگی، توان حضرات سے دوہری امید ہوگی اوراگر ہم دیگر حکمراں سے ایک بار ناراض ہوں گے توان سے ہماری ناراضگی دوگنی ہوگی، دین نصیحت کا نام ہے خیر خواہی کا نام ہے، ان حضرات سے ہماری محبت اور ہماری یہ خواہش کہ مملکت سعودی عرب اپنے عظیم مقام پر فائز ہواور عالمی بیداری میں اس کو مقام رفیع حاصل ہو، یہ دونوں باتیں ہم پر لازم کرتی ہیں کہ ہم اچھے اور برے حالات میں ان کے دائیں بائیں رہیں، جب تک کہ یہ لوگ حق پر قائم ہیں، ہم ان کا تعاون کرتے رہیں، ان کو مضبوطی دیتے رہیں، راہ اسلام میں اپنی پوری صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ساتھ ان کا ساتھ دیں (۱) ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بصمیم قلب دعا گو ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی اس قابل فخر شخصیت کو جسے خادم حرمین شریفین اور مملکت سعودی عرب کا سربراہ ہونے کا شرف حاصل تھا ایسی جزادے جووہ مجاہدین فی سبیل اللہ، صالحین، اور عادل حکمرانوں کو فرماتا ہے، اور یہ کہ ان کے جانشین اورولی عہد مملکت کو پہلو بپہلو اس قائدانہ کردار کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

□□□

(۱) حضرت مولانا کا ان سے حسن ظن اس طور پر بھی صحیح ثابت ہوا کہ ان کا انتقال بھی شہادت کی صورت میں ہوا، ان کی اسلام پسند پالیسی کو مغربی طاقتیں ناپسند کرتی تھیں، چنانچہ شاہ کے خاندان کے ایک نوجوان نے جو امریکہ میں تربیت پارہا تھا، شاہ مرحوم سے ملاقات کے دوران حملہ کرکے شہید کردیا، اس طرح ان کو اسلام اور ملت اسلام کی نصرت کے نتیجے میں یہ اعلیٰ درجے کا صلہ بھی حاصل ہوا۔ (محمد رابع)

www.abulhasanalinadwi.org

جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ

جو لوگ راقم سطور کے (افتادِ طبع) مذاق ومزاج، مشاغل اور خاندانی روایات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کا حلقۂ تعارف واحباب اور دائرۂ کار، علمی اور فکری اور دعوتی واصلاحی حلقوں تک محدود ہے، وہ عالم اسلام کے حالات پر اثر ڈالنے والے واقعات سے گہرے تعلق وتاثر، ممالک اسلامیہ اور خود اپنے ملک کی لائق قدر اور قابل احترام شخصیتوں کی پوری قدر شناسی اور احترام کے ساتھ ان سے ایک ایسا محدود ومحتاط علاقہ اور ربط رکھتا ہے، جو اس کے علمی وتصنیفی مشاغل پر اثر انداز نہ ہونے پائے، اور اس کو ان کے فیصلوں، رویے اور طرز کار میں شریک وذمہ دار اور جواب دہ نہ بنادے، عرصے سے اس کا عقیدہ اور عمل علامۂ اقبالؔ کے اس شعر پر ہے ؎

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

سربراہانِ مملکت اور اپنے ملکوں کے صاحب اقتدار اور صاحب اختیار شخصیتوں میں سے صرف شاہ فیصل شہید مرحوم (والی مملکت سعودیہ عربیہ) کا استثنا کیا جاسکتا ہے جن سے حجاز یا حرمین شریفین اور اس سب سے بڑی عربی اسلامی مملکت کے سربراہ اور ذمہ دار ہونے کی بنا پر جو عالمِ اسلام کا قلب، بلد امین اور مہبطِ وحی ہے، اس کی اسلام سے نہ صرف وابستگی بلکہ اس کی تعلیمات واثرات کا نمائندہ اور داعی وترجمان ہونا ضروری ہے، اور وہاں کی صورتِ حال عالمِ اسلام کے لیے مقیاس الحرارۃ والبرودۃ (بیرومیٹر) کی حیثیت رکھتی ہے، راقم سطور نے ان کی ولی عہدی اور وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ان سے ملاقات کی اور

www.abulhasanalinadwi.org

ان کو سرزمین مقدس پر اثر انداز ہونے والے بعض واقعات، منصوبہ بندی اور تعلیم و تربیت کے بعض پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا اور باہمی اعتماد و احترام کی فضا میں ان سے تخلیہ میں گفتگو کی، سربراہِ مملکت ہو جانے کے بعد متعدد بار ان سے نجی طور پر ملاقاتیں اور گفتگو ہوئی، لیکن یہ گفتگو ہمیشہ خود انھیں کے ملک کے حالات، ضروریات، حال و مستقبل اور اداروں اور شعبوں تک محدود رہتی تھی، انھوں نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور اس کی قدر کی کہ ان ملاقاتوں سے نہ اپنے لیے ذاتی طور پر نہ کسی تعلق رکھنے والے ادارہ یا منصوبے کے سلسلے میں اجتماعی طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے (جس میں مشکل ہی سے ان کی مثال ملے گی) اس کی بڑی قدر کی، اور بعض اوقات جب میری طرف سے ملاقات کے لیے وقت حاصل کرنے کی کوشش نہیں ہوتی تھی، ان کی طرف سے ملاقات کا اشارہ ہوتا تھا۔

اس محتاط طرزِ عمل کا سب سے بڑا مظاہرہ پاکستان کے صاحب اقتدار اشخاص اور ذمہ داروں کے معاملہ میں ہوا، قیام پاکستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۸ء تک جب کہ مختلف ضرورتوں سے (جن میں سب سے بڑا محرک اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کا لاہور میں طویل قیام اور میر ا بغرض استفادہ اور صحبت وہاں کا سفر اور ہفتوں قیام تھا) نیز اس بنا پر کہ خاندان کا تقریباً دو تہائی حصہ پاکستان میں سکونت پذیر تھا، بارہا پاکستان کا سفر پیش آیا، اس تیس سال کے عرصے میں صدر مملکت اور وزیر اعظم تو ایک طرف، پاکستان کے کسی وزیر یا ذمہ دار حکومت سے بھی ملنے کی کوشش نہیں کی گئی، نہ ادھر سے کبھی تحریک ہوئی، خدا کو یہ منظور تھا کہ زندگی کا یہ آئین اور یہ مسلسل روایت صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے معاملہ میں ٹوٹ جائے۔

اس کی تقریب یہ پیش آئی کہ رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے (جس کی مجلس تاسیسی کا میں روز اول سے رکن ہوں) جون ۱۹۷۸ء کے آخر میں کراچی میں اپنی ایشیائی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ اور اعلان ہوا، یہ کانفرنس ۶ / جولائی ۱۹۷۸ء سے منعقد ہو رہی تھی، میں اس زمانے میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی کمیٹی میں شرکت کی وجہ سے حجاز ہی میں

www.abulhasanalinadwi.org

تھا، میری اس کانفرنس میں شرکت ہر طرح سے قرین قیاس تھی، اور رابطہ کے سکریٹریٹ کی طرف سے اس کے لیے اصرار تھا، میں عزیز گرامی مولوی محمد معین اللہ صاحب ندوی کی معیت میں جو میرے رفیق سفر تھے، ۵/جولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی کے لیے روانہ ہوا، ہندوستان سے رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی کے علاوہ جو رابطہ کی مجلس تاسیسی کے رکن ہیں، میرے دو عزیز رفیق برادر زادۂ عزیز سید محمد الحسنی مرحوم مدیر ''البعث الاسلامی'' اور مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم مدیر ''تعمیر حیات'' کو بھی مدعو کیا گیا تھا، ہندوستان کا ایک مؤقر وفد بھی کانفرنس میں شریک تھا، کانفرنس کی صدارت میزبان ملک کے ایک مؤقر نمائندہ جناب اے کے بروہی صاحب (جو اس وقت وزیر قانون، اسلامی امور اور جنرل محمد ضیاء الحق کے خاص معتمد اور مشیر قانونی تھے) کر رہے تھے، صدر کے طور پر راقم سطور اور انڈونیشیا کے نمائندہ ڈاکٹر رشیدی اور فلپائن کے ابوبکر صاحب کا انتخاب ہوا، جنرل صاحب نے کانفرنس افتتاح کیا، عالم اسلام کے مختلف حصوں سے مؤثر شخصیتیں اور مجلس تاسیسی کے تقریباً تمام اہم ارکان شریک اجلاس تھے، صدر اجلاس اے کے بروہی صاحب سے میرا تعارف حجاز کی اس عالمی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے موقع پر ہوا تھا، جو اس سے کچھ ہی پیشتر مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی تھی، انھوں نے میری بعض تصنیفات کا بھی مطالعہ کیا تھا، بروہی صاحب نے ہی جنرل صاحب سے کانفرنس کے اختتام پر ملاقات کا وقت مقرر کیا، جنرل صاحب سے کسی نے اس سے پہلے میرا تعارف کرا دیا تھا اور ان کو غالباً حضرت سید احمد شہیدؒ سے میرے خاندانی تعلق کا علم تھا، بروہی صاحب نے جنرل صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مولانا نے میری درخواست پر مجھے وہ دعا تلقین کی جو ان کی والدہ صاحبہ نے ان کو سکھائی تھی، اس کے الفاظ ہیں: ''اللھم اتنی بفضلك افضل ماتؤتی عبادك الصالحین'' (اے اللہ مجھے اپنے فضل سے وہ بہتر سے بہتر شے عطا فرما جو اپنے نیک بندوں کو عطا فرمایا کرتا ہے) بروہی صاحب نے کہا کہ مجھے بہت سے بزرگوں نے مختلف وقتوں میں مختلف دعائیں اور اذکار بتلائے لیکن اس دعا نے میرے دل کو پکڑ لیا اور مجھ پر حاوی ہوگئی، اس پر جنرل

صاحب نے فرمایا کہ میری والدہ بھی میرے لیے بڑی دعائیں اور مجھے خدمت اسلام کی تلقین کرتی تھیں، اوران کی تمنا تھی کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے کام آؤں، آپ مجھے بھی کوئی دعا بتائے جس کا میں ورد رکھوں، راقم نے عرض کیا کہ آپ دورد شریف ہی کو مضبوط پکڑ لیجیے، یہی سب ضرورتوں کے لیے کافی ہے، مجھے حال میں معلوم ہوا کہ جنرل صاحب نے درود شریف کا اپنی زندگی میں خاص اہتمام کیا، مدینہ طیبہ میں ان کی حاضری، مسجد نبوی میں نماز اور مواجہہ شریف میں بڑے ذوق واہتمام کے ساتھ سلام پیش کرنا اور اتنی دیر تک وہاں ٹھہرنا کہ سرکاری طور پر حفاظتی انتظامات کے ذمہ داروں کو مشکل پیش آجاتی اور وہ درخواست کرتے کہ اب آپ اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلیں، لیکن وہ وہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتے، یہ واقعات میں نے مدینہ طیبہ کی حاضری پر قابل وثوق احباب سے بار بار سنے ہیں، میں نے اس مجلس میں حجاز مقدس، حرمین شریفین کے بارے میں (سب سے بڑی اسلامی مملکت کے صدر اور قائدِ افواج اور مسلمان سپاہی کی حیثیت سے) ان کو اپنی خصوصی ذمہ داری سمجھنے اور ان کی حفاظت کے لیے اپنی خدمات اور مساعی صرف کردینے کی طرف بھی متوجہ کیا، جس کو انھوں نے بہت توجہ اور مسرت کے ساتھ سنا، مجھے اس پوری مجلس میں یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک صاحب ایمان مسلمان سپاہی اور ایک مسلمان صدر مملکت سے گفتگو کررہا ہوں، جس کا ایسا احساس مجھے متعدد ذمہ دار اور صاحب اقتدار شخصیتوں سے ملاقات اور گفتگو کرنے میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

۱۹۷۸ء کے اسی سفر میں اسلام آباد میں صدر کے محل میں میری ان سے دوسری ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں صرف جسٹس افضل چیمہ صاحب موجود تھے، جو بعد میں رابطۂ عالم اسلامی کے پاکستانی دفتر کے انچارج منتخب ہوئے، اس وقت وہ مجلس قوانین اسلامی کے صدر وذمہ دار تھے، جنرل صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ آپ ہندوستان سے اچھے تعلقات رکھیں، تاکہ ہم اطمینان سے معتدل اور پرسکون ماحول میں اپنے تعمیری وتعلیمی

ورفاہی کام انجام دے سکیں، انھوں نے فرمایا کہ بالکل یہی میرا بھی خیال ہے، اور میری اس سلسلے میں مرارجی ڈیسائی سے (جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے) ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی رہتی ہے، لیکن کیا کیا جائے یہاں لوگ جذباتی بہت ہیں، ان کے بعد کے مسلسل طرز عمل نے (جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رکھا) ثابت کر دیا کہ وہ اس اصول اور طریق کار کے سختی سے پابند ہیں، اور نازک موقعوں پر بھی انھوں نے دماغی توازن، ضبطِ نفس اور حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔

جنرل صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے ان کے آبائی وطن قصبہ ڈھڈیاں ضلع سرگودھا رجا رہا ہوں تو انھوں نے چیمہ صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ میرے لیے سرگودھا جانے کے لیے خصوصی ہوائی انتظام کر دیں، میں نے مصلحتاً اس کو منظور نہیں کیا اور بطور خود ٹرین کے ذریعہ سرگودھا کا سفر کیا، مجھے معلوم ہوا تھا کہ ان کے والد صاحب کا بھی حضرت سے بیعت وارشاد کا تعلق ہے جس کی مجھے تحقیق نہ ہو سکی۔

۱۹۷۸ء کی ان دو ملاقاتوں کے بعد سے میرا جنرل صاحب سے نہ ملنا ہوا نہ کوئی رابطہ قائم ہوا، غالباً ۱۹۸۵ء یا ۱۹۸۶ء میں انھوں نے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتویں حصہ کا مطالعہ کیا جو معاملات اور اسلام کے نظام حکومت اور سیاست پر ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود بڑی فکر انگیز، کتاب وسنت، عہد خلافت راشدہ، تاریخ اور طریقہائے حکومت کے وسیع اور گہرے مطالعے اور اسلامی سیاسی تحریکات کا نچوڑ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنرل صاحب کو حکومت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے اور ایک اسلامی مملکت کی تشکیل جدید کے لیے ایک ایسی رہنما کتاب کی ضرورت تھی، وہ اس کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے، اتفاق سے اس پر پیش لفظ اور تعارف میرے قلم سے ہے جو محترمی سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب مرحوم ناظم دار المصنفین کے اصرار پر میں نے لکھا تھا، اور اس میں صفائی سے لکھ دیا تھا کہ "سید صاحب

کی تصنیف پر میرا مقدمہ لکھنا آثار قیامت میں سے ہے، لیکن چونکہ یہ کتاب نا تمام اور مختصر ہے اس لیے کسی ناقص کا اس پر کچھ لکھنا قابل عفو در گزر رہے گا۔ ع

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

معلوم نہیں جنرل صاحب کو سہو ہوا یا انھوں نے اظہار تعلق و قدر دانی کا ایک راستہ اختیار کیا کہ مقدمہ نگار کے لیے حکومت پاکستان کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان کیا، میں نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ میں اس عطیہ کا کسی طرح مستحق نہیں، براہ کرم اس کا نصف حصہ ادارہ دار المصنفین کو پیش کر دیا جائے جس نے یہ کتاب دریافت کی اور اس کی اشاعت کا انتظام کیا، بقیہ حضرت سید صاحبؒ کے پس ماندگان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے جو کراچی ہی میں مقیم ہیں۔

جنرل صاحب سے ایک ملاقات ۱۹۸۴ء میں شرق اردن، یمن اور حجاز سے واپسی کے دوران کراچی میں ہوئی، جنرل صاحب نے اس ملاقات کے لیے اپنے مجوزہ پروگرام میں کچھ ترمیم بھی کی، محترمی جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مرحوم اس ملاقات کے خاص محرک اور اس میں واسطہ تھے، میں نے جنرل صاحب کی خدمت میں قبۃ الصخرۃ (مسجد اقصیٰ) کا وہ خوبصورت مرمری ڈھانچہ پیش کیا جو مجھے عمان میں پیش کیا گیا تھا، اس ہدیہ میں (زبان حال سے) اس کا اشارہ بھی تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت اور اس کا استخلاص بھی ایک صاحب ایمان، مسلم صدر مملکت کے ذمہ داریوں میں ہے، غالباً اسی سفر میں کراچی کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کے نمائندہ نے مجھ سے انٹرویو لیا اور یہ سوال کیا کہ صدر مملکت نظام اسلامی کے جاری کرنے اور اس کو حقیقی معنی میں اسلامی مملکت بنانے کا عرصے سے وعدہ کر رہے ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے کی ابھی تک نوبت نہیں آئی، اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

میں نے کہا ایسے موقع پر دو رویے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کوئی مسلمان جو صورتاً بڑا متشرع نظر نہ آتا ہو، آپ سے کہے کہ میں ایک مسجد کی تعمیر کرنا چاہتا ہوں، آپ اس سے کہیں کہ یہ صورت اور خانۂ خدا کی تعمیر؟ آپ کو کبھی مسجد میں جانے کی توفیق بھی ہوئی، اور

آپ کے باپ دادا نے بھی یہ کام کیا؟ تو اگر وہ مسجد بنانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے تو کان پکڑ لے گا، اور اس ارادہ سے باز آجائے گا، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ کہیں سبحان اللہ ارادہ مبارک ہو، آپ ہی جیسے لوگوں نے مسجدیں بنائی ہیں، ہم بھی اس کار خیر میں شریک ہیں، اور آپ کا ہاتھ بٹائیں گے، تو اگر اس کام میں تردد تھا تو وہ اس کا عزم کرلے گا، اور مسجد کی تعمیر کی سعادت حاصل کرے گا۔

مجھے اس موقع پر یمن کے ایک عالم کی وہ گفتگو یاد آگئی جو حکمت یمانی کا ایک نمونہ ہے(۱)، یہ اسی سال (مئی ۱۹۸۴ء) کا واقعہ ہے، راقم سطور کو صنعاء کے ایک قدیم محلہ میں ایک یمنی عالم سے ملایا گیا جو میری عربی تصنیفات کا مطالعہ کر چکے تھے، اور میرے خیالات سے واقف تھے، انھوں نے کہا میرے خیال میں دو راستے ہیں، جن کو دینی جدوجہد کرنے والے اختیار کر سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایمان کرسی والوں (اہل حکومت) تک پہنچا دیا جائے، دوسرا یہ کہ اہلِ ایمان خود کرسیوں تک پہنچ جائیں (یعنی حکومت کی ذمہ داریاں براہ راست سنبھال لیں) انھوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ پہلے طریق کار کو ترجیح دیتے ہیں، میں نے کہا آپ نے بالکل صحیح فرمایا، ہمارے یہاں برِ صغیر میں گیارہویں صدی ہجری میں امام ربانی مجدد الف ثانی نے یہی طریق کار اختیار کیا، اور اپنے لوگوں کو حکومت کی کرسیوں تک پہنچانے یا خود پہنچنے کی کوشش کے بجائے اس وقت کے سربراہ مملکت تک ایمان کی دعوت اور حمیت اسلامی کی دولت پہنچانے کی کوشش کی اور اس کو اطمینان دلایا کہ وہ کرسی حکومت تک پہنچنے کی کوشش تو الگ رہی اس کا وسوسہ بھی دل میں نہیں لاتے، یہ کام انھیں کو کرنا ہے، اور ہر طرح سے وہ اس کے اہل ہیں، ان کی رگوں میں مجاہدین اسلام اور صاحبِ حمیت فاتحین اور ربانیان سلطنت کا خون ہے، اسی کے ساتھ اہلِ دربار اور اساطین حکومت سے رابطہ قائم کرکے ان کے دلوں میں دینی حمیت کا جوش اور خدمت اسلام کا

---

(۱) ایک صحیح حدیث میں اہلِ یمن کی تعریف میں یہ لفظ آئے ہیں "الایمان یمانٍ والحکمة یمانیة" (ایمان یمن کی چیز ہے اور حکمت یمن کا امتیاز ہے)۔

www.abulhasanalinadwi.org

جذبہ پیدا کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا جو اس سے کہیں بہتر تھا، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں آیا جو اس سے بہتر اور اس سے زائد پابند مذہب تھا، اور شاہجہاں کے بعد ہندوستان کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جیسا متشرع، حامی دین اور فقیہ و صالح بادشاہ آیا، جس کو ہمارے ایک اہل نظر عرب فاضل دوست (۱) نے "سادس الخلفاء الراشدین" (چھٹا خلیفۂ راشد) کا لقب دیا ہے۔

جدید تجربوں نے تو اس میں اور اضافہ کیا ہے کہ بعض جماعتیں صرف اہل ایمان کا کرسیوں تک پہنچنا ضروری نہیں سمجھتیں بلکہ اس سے آگے خاص وردی پوش اہل ایمان کا پہنچنا ضروری سمجھتی ہیں، اور اس سے کم پر راضی نہیں، جنرل صاحب مرحوم کی ملاقاتوں کے سلسلے میں یہ جملہ معترضہ آگیا، لیکن اس سے اس صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے جس سے ان کو اپنے پورے دور اقتدار میں واسطہ رہا ہے، اب ہم پھر موضوع کی طرف آجاتے ہیں، اور اس سلسلے میں آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔

جون ۱۹۸۶ء میں میرا عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں شرکت کے لیے استنبول (ترکی) جانا ہوا، اس سے فارغ ہو کر ۲۸ رجون کو دہلی جاتے ہوئے ڈھائی تین دن کے لیے کراچی ٹھہرنا ہوا، غالباً ۲۹ رجون کو اپنے ایک مرحوم دوست منصور بٹلہ صاحب کے یہاں دوپہر کے کھانے پر تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، انھوں نے کہا جنرل صاحب ٹیلی فون پر ہیں، اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ میرے کراچی پہنچنے کی اطلاع ان کو کہاں سے ہوئی، میں نے رسیور ہاتھ میں لیا، جنرل صاحب خود بول رہے تھے، انھوں نے ہماری آمد پاکستان پر خوشی کا اظہار کیا اور اسلام آباد آنے کی دعوت دی، میں نے وہاں آنے سے معذرت کی اور کہا کہ اس وقت اس کا موقع نہیں ہے، بات ختم ہوگئی، رات کو دار العلوم بنوری ٹاؤن میں جہاں قیام تھا، ان کا ٹیلیفون آیا، انھوں نے فرمایا

---

(۱) نامور شامی فاضل و ادیب علامہ سید علی طنطاوی (حال مقیم مکہ مکرمہ) مراد ہیں، جو عہد حاضر کے چوٹی کے صاحب علم و اہلِ قلم ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

کہ اگر آپ نہیں آسکتے تو میں آتا ہوں، میں کل کراچی آپ سے ہی ملنے آرہا ہوں، آپ دن کا وقت کسی کو نہ دیں، اتفاق سے وہی دن میری روانگی کا تھا، اور ظہر بعد دہلی کے لیے پرواز تھی، صبح ایک فوجی افسر آئے، انھوں نے کہا کہ کھانا بھی آپ کو جنرل صاحب کے ساتھ کھانا ہے، آپ کن لوگوں کو اپنے ساتھ لانا چاہتے ہیں، میں نے اپنے میزبان اور عزیزی قاری سید رشید الحسن (نبیرۂ والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں والی بھوپال) اور اپنے رفیق قدیم اور ادیب جلیل مولانا محمد ناظم صاحب ندوی اور چند احباب کے نام بتادیئے، اگلے دن صبح جنرل صاحب تشریف لائے، صدر کے محل میں ہم نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور اسی احاطہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، جنرل صاحب بڑی سادگی اور خلوص سے ملے، سیرت نبوی کے عطیہ کا ذکر آیا، جس کی اس وقت تک اس کارروائی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، جس کی ہم نے درخواست کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ اگر آپ قبول کر لیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی، میں نے کہا کہ اس سے پہلے بھی ایسے موقع پر یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔

معلوم ہوا اور حیرت ہوئی کہ جنرل صاحب کو فیصل ایوارڈ کے سلسلے میں میرے طرزِ عمل کا علم تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ پرسنل لاء کے معاملہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے نفقہ مطلقہ اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سلسلے میں جو ہمہ گیر مہم چلائی گئی تھی، اور وزیر اعظم راجیو گاندھی صاحب نے پارلیمنٹ میں ایک نیا بل پیش کر کے (جو بہت کچھ علماء وارکانِ پرسنل لا بورڈ کے مشوروں کی روشنی میں تیار ہوا تھا) جس حقیقت پسندی اور دانشمندی کا ثبوت دیا اس کا جنرل صاحب کو علم تھا، اور انھوں نے اس سلسلے میں راجیو جی کے اقدام کی تعریف کی، یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مجلس کے متعدد باخبر شرکاء کو اتنی واقفیت نہیں تھی، اور ان میں سے بعض بالکل بے خبر نکلے۔

جنرل صاحب مرحوم سے یہ آخری ملاقات تھی، اس وقت بالکل یہ اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شہداء کی فہرست میں ان کا نام لکھا ہوا ہے، اور ان کے لیے خدا کے

www.abulhasanalinadwi.org

دربار میں پہنچنے کا وہ راستہ متعین ہو چکا ہے، جس کی بڑے بڑے اولیاء اللہ نے تمنا کی اور جس کی فضیلت اور علوئے مرتبت پر قرآن وحدیث ناطق ہیں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

خوف اس کا ہے کہ اس سانحے میں اس ملت کے افراد یا کسی فرد کا ہاتھ نہ ہو جس کی حفاظت اور تقویت کے لیے انھوں نے اپنی بہترین توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کیں اور اسلامی نظام اور قوانین کے نفاذ کے سفر کی کچھ منزلیں طے کیں، اور اس کی تکمیلی منازل کی طرف وہ رواں دواں تھے، اندیشہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد (اور متعدد تجربوں کے بعد) پاکستان کے بعض حق گو اور حقیقت پسند اہلِ نظر کی زبان پر لکھنؤ کے ایک قدیم شاعر کا یہ شعر نہ ہو۔

اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیرِ گل
افسوس ہے انھیں کے ہزاروں گلے ہوئے

اللہ تعالیٰ شہید مرحوم کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے جن سے کوئی بشر خالی نہیں، ان کی نیت اور ارادوں اور ان کی دینی حمیت اور اسلام سے تعلق کو قبول فرمائے، اور دونوں پڑوسی ملکوں کے رہنماؤں اور قائدین وسربراہانِ مملکت کو اس کی توفیق دے کہ وہ شریف حقیقت پسند، بلند نگاہ اور عالی ظرف پڑوسی سربراہانِ مملکت کی طرح دونوں ملکوں کی رہنمائی کریں، ان کی بہتر توانائیاں اپنے اپنے ملک کی تقویت اور استحکام، معاشرہ کی اصلاح، بڑھتے ہوئے انتشار، بدنظمی، فرض ناشناسی، اور دولت پرستی کے مرض سے ان کو بچانے کی کوشش کریں جو ان ملکوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے تاکہ ایشیا میں ایسی باوقار وباوزن، مؤثر اور مفید قیادت کو ابھرنے کا موقع ملے، جو بین الاقوامی امور میں بھی، اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا (بزعم خود) فیصلہ کرنے والی طاقتوں کو بھی روشنی دکھا سکے اور عہد حاضر کے لیے بہتر، زیادہ پرسکون اور محفوظ اور باعزت ماحول پیدا کرنے میں مدد دے۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

نواب صاحب چھتاریؒ

میری اور سعید الملک نواب حافظ سر احمد سعید خاں آف چھتاری کی عمر اور حیثیت اور مشاغل میں اتنا تفاوت اور اختلاف تھا کہ میرا ان کے حلقۂ احباب اور معاصرین میں شریک ہونا ایک بعید از قیاس اور غیر معمولی بات تھی، میں ان کا تذکرہ ایک خاندانی رئیس و نواب کی حیثیت سے سنا کرتا تھا، جو اپنی تمام دنیاوی سربلندیوں، اعزاز اور وجاہت کے ساتھ جو اس دور کے کسی مسلمان رئیس کو انگریزی اقتدار میں حاصل ہو سکتی تھی اپنی اسلامیت کو قائم رکھتے ہوئے حفظ قرآن کی دولت کو نہ صرف سینے میں محفوظ کیے ہوئے بلکہ لندن کے قیام اور لکھنؤ اور نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس میں اس کے رمضان مبارک میں سنانے کا معمول جاری رکھے ہوئے اور علمائے حق سے محبت و عقیدت کا رشتہ قائم کیے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی سب سے پہلے اس وقت زیارت کی جب کہ وہ یوپی کے گورنر تھے اور ۱۹۳۳ء کی کسی تاریخ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے تشریف لائے تھے اور اس تقریب میں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی شریک تھے۔ میرا علی گڑھ بار بار جانا ہوتا تھا اور حبیب منزل میں جو نواب صاحب کی کوٹھی کے پہلو میں ہے، اپنے بزرگ و مخدوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی خدمت میں حاضری دینا ضروری تھا، لیکن کبھی نواب صاحب کی خدمت میں حاضری کی نوبت نہیں آئی، نہ ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، یہ ہم کلامی ایک مرتبہ ٹیلیفون پر ضرور ہوئی اور اس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ ندوۃ العلماء مالی مشکلات کے دور سے گزر رہا تھا، اس کو نظام ٹرسٹ سے جس کی کمیٹی

www.abulhasanalinadwi.org

کے نواب صاحب صدر تھے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، حیدر آباد کے دوستوں نے بتایا کہ نواب صاحب اس کے ایک ٹرسٹی اور اسی کمیٹی کے ایک بااثر رکن ہیں، آپ ان کو متوجہ کریں، میں نے ٹیلیفون پر ان سے گفتگو کی، اپنا تعارف کرایا اور اس مسئلے میں ان سے مدد کی درخواست کی، انھوں نے بڑی خوش اخلاقی اور فراخ دلی کے ساتھ وعدہ فرمایا اور آمادگی ظاہر کی اور اس کا جلد ایفا بھی ہو گیا۔

میری ان کی پہلی رودررو ملاقات اس وقت ہوئی جب ۱۹۸۰ء کی کسی تاریخ کو وہ میری علی گڑھ کی قیام گاہ ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاں کے بنگلے پر فیصل ایوارڈ کے اعزاز پر مجھے مبارک باد دینے کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لائے اور اس پر اپنی بڑی مسرت کا اظہار کیا، میں شرمندہ بھی ہوا اور ان کی کریم النفسی اور عالی ظرفی سے متاثر بھی، کہ اس وقت نواب صاحب کی عمر ۹۱-۹۲ سال سے متجاوز تھی، یہ ملاقات میرے لیے اپنی بعض تصنیفات کے پیش کرنے کی تمہید بن گئی، اس سے پہلے میں ان کی آپ بیتی (خود نوشت سوانح عمری) کا مطالعہ کر چکا تھا، مجھے اندازہ تھا کہ وہ اردو زبان وادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور کم سے کم طبقۂ رؤسا کے اہل قلم کی (نواب صدر یار جنگ کو مستثنیٰ کر کے کہ وہ عالم وادیب وصاحب طرز انشاپرداز تھے) صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ میں نے ان کی خدمت میں تازہ تصنیف ''پرانے چراغ'' کی دوسری جلد جو تازہ تازہ شائع ہوئی تھی بھیجنے کی جرأت کی اس کے کچھ عرصے بعد ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا چوتھا حصہ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات سے مخصوص ہے بھیجا، نواب صاحب کا ان دونوں کتابوں کی رسید اور ان پر اپنے تاثرات کے اظہار کے سلسلے میں جو خط آیا وہ ان کے نہ صرف ادبی ذوق بلکہ ان کی دینی اور باطنی کیفیات کا بھی آئینہ دار ہے، اس کتاب کے آخری مضامین میں میرا اپنی مرحومہ ہمشیرہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مصنفہ ''زادِ سفر'' پر بھی ایک مؤثر اور دلدوز مضمون تھا جو خاص کیفیت اور قلبی تاثر کی حالت میں لکھا گیا تھا، اس میں ان کے دعا ومناجات کے چند اشعار بھی بطور نمونہ پیش کیے گئے تھے جو درد واثر میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک ٹوٹے ہوئے

www.abulhasanalinadwi.org

شیشۂ دل کی صدا تھی، ان میں سے چند اشعار یہ تھے ؎

کنج قفس سے بدتر اپنا ہے آشیانہ
اس قیدِ بے کسی میں گزرا ہے اک زمانہ

مغموم دل پہ یارب لازم ہے رحم کھانا
کرتی ہوں میں شکایت تجھ سے یہ عاجزانہ

بارالم ہے دل پر طاقت نہیں ہے دل میں
کیوں کر ہو صبر مجھ سے ہمت نہیں ہے دل میں

اور اس نظم کے خصوصاً یہ دو شعر تو بہت ہی دردانگیز اور پُرسوز ہیں:۔

کب سے لیے کھڑی ہوں میں کاسۂ گدائی
اب تک ملا نہ مجھ کو اور شام ہونے آئی

بندہ نواز! میری منت کی لاج رکھ لے
میری نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے

نواب صاحب خاص طور پر ان اشعار کو پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے تاثر کا بے تکلف اظہار کیا جس سے اندازہ ہوا کہ ان کو دعا ومناجات سے اور اس دولتِ خداداد سے بھی (جو فقراء اور اہل دل کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) حصہ ملا تھا، اس خط کو پڑھیے اور اس قسمت وسعادت پر رشک کیجیے کہ اس دولت وامارت کے ساتھ اللہ نے اپنے ایک بندے کو انابت وتوفیقِ دعا اور سارے اسباب مسرت وسکون کے ساتھ دل شکستگی کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء.

راحت منزل، علی گڑھ

مخدومی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جناب کا عطیہ ''پرانے چراغ'' تو عرصہ ہوا ختم کرچکا ہوں، اور اب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' قریب ختم ہے، یوں تو ''پرانے چراغ'' اردو ادب کے جواہر سے بھری ہوئی ہے، لیکن مجھے جتنا روحانی نفع آپ کی ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ کے تذکرہ سے ملا وہ میرے لیے بڑی نعمت ہے اور مجھے اس سے بارگاہ الٰہی میں التجا کرنے کا طریقہ آگیا، خاص کر جو چند اشعار تذکرہ کے آخر میں ہیں، وہ ایک زخمی دل کی آہ ہیں کہ جس سے دریائے رحمت جوش میں آتا ہے۔ وہی قلب محزوں کی آواز ہے جس سے

www.abulhasanalinadwi.org

باب رحمت کھلتا ہے اور یہی وہ فریاد ہے کہ جس کے واسطے ''اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید'' میری دراز عمر میں مجھے کئی ایسے مواقع آئے ہیں کہ باری تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے راہ ہدایت دکھائی ہے، کبھی انتہائی شفقت کے ساتھ، ایک بار جب کہ میں لندن میں تھا ایسی تنبیہ فرمائی کہ مجھے اس خواب کی حالت میں یقین کامل تھا کہ وہ لمحہ میری زندگی کا آخری لمحہ تھا، میرا تمام جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا اور میں کانپ رہا تھا، آپ کا وقت ان پرانی کیفیات کی تفصیل لکھ کر ضائع کرنا نہیں چاہتا، لیکن میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے ''پرانے چراغ'' بھیج کر مجھے دعا کرنا سکھا دیا، جزاك الله.

میں مبلغ پانچ سو روپیہ کا چک زکات کی مد سے بھیج رہا ہوں، تاکہ غریب طلبا کی مدد کی جا سکے اور دعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ ذات گرامی کو عرصۂ دراز تک قائم رکھے، میں اپنی عمر کے بانوے سال ختم کر چکا ہوں اور اس کی رحمت کا منتظر ہوں ''ہو چکی شام شفق باقی ہے''۔

آپ کا نیاز مند

احمد سعید

یکم فروری ۸۱ء، علی گڑھ

تقدیری بات اور نواب صاحب کے خلوص کا کرشمہ کہ مجھے یہ خط حرمین شریفین کے قیام کے دوران مکۂ معظمہ میں ملا، اس خط کو پڑھ کر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے مقامِ ابراہیم کے قریب ان کے لیے خصوصیت سے دعا کی، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے وہ بہت خوش ہوں گے میں نے اس کی اطلاع دینی بھی مناسب سمجھی کہ ہر صاحب ایمان کا اس پر مسرور ہونا قدرتی امر ہے کہ اس کے لیے ایسے مقام قرب و مقبولیت میں دعا کی جائے ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

www.abulhasanalinadwi.org

اور نواب صاحب کو اپنے بزرگ دادا اور مربی نواب محمود علی خاں صاحب کی وجہ سے جو حرمین شریفین ہجرت کے خیال سے چلے گئے تھے، لیکن پھر شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کی ہدایت پر اپنے ہونہار پوتے کی تربیت کے لیے جس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا ہندوستان بھیجے گئے، حرم مکی سے موروثی تعلق اور قلبی وابستگی تھی، نواب صاحب نے اس خط کو پڑھ کر جو خط لکھا اس نے اس خیال کی تصدیق کر دی، ان کا یہ خط درج کیا جاتا ہے۔

مکرمی و مخدومی مولانا ابوالحسن علی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ میری خوش نصیبی ہے اور باری تعالیٰ کا کرم ہے کہ میرا خط جنابِ والا کو اس وقت ملا جب آپ کا قیام مکہ مکرمہ میں تھا، اور آپ نے اپنے کرم سے میرے واسطے مقام ابراہیم کے قریب دعا فرمائی، مجھے یقین ہے کہ آپ کی دعا میرے واسطے ضرور مقبول ہوئی، یہ بھی تو ممکن تھا کہ میرا خط دفتر میں آپ کے انتظار میں روک لیا جاتا، لیکن باری تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ آپ کو اس وقت اور اس جگہ ملا جہاں اس کی رحمتوں کی بارش ہر وقت ہوتی رہتی ہے، میں تہِ دل سے آپ کے کرم کا مرہونِ منت ہوں۔

جناب والا کی ہمشیرہ مرحومہ کی مناجات کا وہ شعر کہ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ گناہوں کی لاج نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے، مجھے دعا کے وقت یاد آ جاتا ہے، خدا اپنے کرم سے باوجود میرے گناہوں کے میری لاج دنیا اور آخرت میں رکھ لے، آمین۔

آپ کا نیاز مند

احمد سعید

مورخہ ۱۷؍ مارچ ۸۱ء، علی گڑھ

غالباً میں نے ''پرانے چراغ'' کا پہلا حصہ نہیں بھیجا تھا، اس کے سلسلے میں نواب صاحب کا ایک دوسرا خط بھی ہے جو ۸؍ نومبر ۱۹۸۱ء کا لکھا ہوا ہے وہ بھی یہاں نقل کیا جاتا

ہے جس سے خاص طور پر ان کے ادبی ذوق اور تحریر کی شگفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

مکرمی ومحترمی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب والا کا عطیہ ''پرانے چراغ'' باعث شکر وامتنان ہوا، ایک چراغ سحری کے لیے اس سے بہتر اور بے بہا تحفہ کیا ہوسکتا ہے؟ عمر کی ۹۲ سال کی منزل پر انیس کا یہ شعر حسب حال ہے ؎

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ کو لیے کہاں سامنے ہوا کے چلے

جن حضرات کا ذکر آپ نے ''پرانے چراغ'' میں کیا ہے ان میں کئی مرحومین ایسے ہیں جن سے نہ صرف نیاز حاصل تھا بلکہ قلبی تعلق تھا اور رشید احمد صدیقی صاحب سے تو بالکل ایسے مراسم تھے کہ جیسے ہم دونوں ایک خاندان کے افراد ہیں ''پرانے چراغ'' پڑھنے میں دل کو عجیب کیفیت ہوئی، نہ صرف عمر رفتہ کو آواز دینے لگا بلکہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوا کہ عمر رفتہ نے بھی لبیک کہا اور بیتے دن پھر آگئے، پرانی یادوں کے ساتھ وہ پرانی فضا بھی آگئی اس قدر دلکش اور فکر انگیز اردو تحریر یا تقریر دیکھنے اور سننے کا کہاں موقع ملنا ہوا ''مدت ہوئی کہ آشتی چشم وگوش ہے''۔

باری تعالیٰ ذات گرامی کو عرصۂ دراز تک مسلمانوں کی رہنمائی کے واسطے قائم رکھے۔ آمین

جناب والا کا گرامی نامہ صادر ہوا، میں معذرت خواہ ہوں کہ ''پرانے چراغ'' کے عطیہ کی رسید بوجہ ناسازیٔ مزاج نہ جاسکی، اب طبیعت بہتر ہے۔

دعا گو

احمد سعید

۸/۱۱/۸۱، علی گڑھ

www.abulhasanalinadwi.org

نواب صاحب کا ایک خط اور نقل کیا جاتا ہے جس پر تاریخ نہیں ہے اور وہ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' جلد چہارم سے متعلق ہے، مجھے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کے مورث اعلیٰ جن کی نسبت سے یہ خاندان لال خانی کہلاتا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس خط میں اس نسبت کا اثر و برکت نمایاں ہوا۔ مکتوب حسب ذیل ہے۔

مکرمی و مخدومی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب والا کا عطیہ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' سے مستفید ہوا، بہت سی پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئیں، اکبر کی ملحدانہ کوشش کو پڑھ رہا تھا کہ یکا یک یاد آیا کہ ایک بار جب میں .U.P کی حکومت سے وابستہ تھا تو آگرہ گیا تھا، سکندرہ اکبر کی قبر پر بھی جانے کا موقع ملا، میں اصل قبر پر جو نیچے کے حصہ میں تھی گیا، وہاں اندھیرا تھا، اور میں نے دیکھا کہ چند چمگاڈر رہنے لگی تھیں، باہر آیا تو یہ رباعی یاد آئی

آن قصر کہ بہرام در و جام گرفت   روبہ بچہ کرد وشیر آرام گرفت
بہرام کہ گورے گرفتے دایم   امروز نگر کہ گور بہرام گرفت

مجھے بڑے عبرت ہوئی، کچھ روز بعد جب میں اورنگ آباد حضرت اورنگ زیب کے مزار پر حاضر ہوا تو دستار اور بکلوس لگا کر گیا، جوتیاں چھوڑ کر کپڑے کی جوتیاں بھی پہن کر قبر تک گیا اور فاتحہ پڑھی، لوگ وہاں اب بھی شاہی آداب کے ساتھ جاتے ہیں، میں دونوں قبروں کے اس تضاد سے بہت متاثر ہوا۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ ایسا ہے کہ مجھ جیسے شخص کو اس پر لب کشائی نہ کرنا ہی مناسب ہے، مجھے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خطوط کا اقتباس پڑھ کر بہت تسکین ہوئی دو الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا، ''نہ بودن اور ہے اور نہ دیدن اور ہے'' اگر بدعت اور ایسے مسائل کے خلاف حضرت مجدد الف

www.abulhasanalinadwi.org

ثانیؒ نے آواز نہ اٹھائی ہوتی تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں صدیوں سے بت پرستی کا رواج ہے، بت پرستی کا جواز ہو جاتا۔

میں اس طویل عریضہ کی معافی چاہتا ہوں، ایک چیک مبلغ چار سو روپیہ کا غریب طلباء کی خدمت کے لیے روانہ کرتا ہوں، یہ زکات کی رقم ہے۔

نیاز مند

احمد سعید

یہ چند خطوط جو راقم سطور کے خیال میں کسی تبصرہ و تعلیق کے محتاج نہیں، بڑے فطری انداز سے صاحب مکتوبات کے قلب و ذوق کی پاکیزگی، زبان و دل کی رقت و نزاہت اور علم و ادب سے طبعی مناسبت کی ترجمانی کرتے ہیں، چنانچہ اس بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنا غیر ضروری تکلف معلوم ہوتا ہے۔

اسی خیال سے پیش نظر مضمون میں ان خطوط کو قارئین کے سامنے رکھ دینا ہی کافی سمجھا ہے کہ جمال فطرت رنگ آمیزی سے بے نیاز ہوتا ہے ع

روئے دل آرام را حاجتِ مشاطہ نیست

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

چند جلیل القدر علماء و خادمین دین

- مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
- مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندویؒ
- مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ
- مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادیؒ
- مولانا نسیم احمد صاحب فریدیؒ

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت زمانی رقبے کے لحاظ سے بھی بہت وسیع اور جامع تھی، اور معنوی رقبے کے لحاظ سے بھی، زمانی رقبہ تو ۸۸ سال کا ہے جس میں سے ابتدائی زمانہ نکال دیا جائے تو بھی ۷۰ سال کے قریب ہوتے ہیں، معنوی رقبہ اس لیے وسیع ہے کہ علم وفضیلت، بصیرت، وسعتِ علم اور علم کی پختگی ورسوخ، خدمتِ دین اور اس کے ساتھ اصلاح ووعظ وارشاد، عوام سے رابطہ، تربیت ودعوت، وبیعت وارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی، واقعہ یہ ہے کہ شاید (کم سے کم ہندوستان میں) کسی علمی ودینی شخصیت کو کم ایسی ہر دل عزیزی، عام شہرت ومقبولیت، اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا، جو ان کو حاصل تھا، اس کے ساتھ ان کو طویل عرصے تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم وجلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارے کی خدمت اور ترقی کا موقع ملا، ان کی اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کے اختلافات سے بہت حد تک بالاتر ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لیے (جو ہندوستان کے مختلف الخیال گروہوں، دینی جماعتوں اور اداروں کا نمائندہ ہے) روز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا، اور وہ اس عہدے پر باتفاق آراء اس کے قیام کے پہلے دن سے وفات کے دن تک صدر رہے۔

ان کو نبیرۂ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ہونے کی

www.abulhasanalinadwi.org

نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا، اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارے کے منصب اہتمام پر فائز رہے، اور ان کے دور اہتمام میں اس ادارے نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور کے دیکھنے والوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی، انھوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی، انھوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارے کے نام اور اس کی زندگی سے ایسی وابستہ کر دی تھی کہ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا، کاش کہ وہ اس سے علاحدگی کا داغ اٹھائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوتے۔ انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے قاری صاحب کو اس معاملے میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا، واقفیت رکھنے والے پورے حلقے میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ قاری صاحب نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو، نرم رو اور نرم گفتگو تھے، اقبال نے جو کہا کہ۔ ع

نرم دمِ گفتگو، گرم دم جستجو

یہ تعریف قاری صاحب پر صادق آتی ہے۔

قاری صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہردل عزیز ادارہ بنادیا، اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا، اور ان کا اس سے تعلق پیدا کیا، تقسیم سے پہلے تحتی براعظم کے دورے کیے، تقسیم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے۔

قاری صاحب عوام کی اصلاح اور وعظ وارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اسلوب کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی واصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا، جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہنچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر وواعظ، وسیع المعلومات اور

www.abulhasanalinadwi.org

نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا تھا، جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہنچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، ایسے بے ضرر انسان کی اس خوبی یا کمزوری سے لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور عزل ونصب کا بھی وہ نشانہ بن جاتا ہے۔

قاری صاحب نہایت متین وباوقار شخص اور تواضع واخلاق کا پیکر تھے، اسی کے ساتھ پرشکوہ اور باوقار بھی، قاری صاحب ندوۃ العلماء کے بھی ایک مقتدر رکن تھے، اور اس کے کارکن اور ذمہ داران کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے تھے، آخری بار آپ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس میں شرکت کے لیے ندوہ آئے اور تقریر فرمائی، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن ہونے کی بنا پر بھی راقم کو قاری صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا، اور ہم نشینی کا شرف، بعض مرتبہ ان کو سخت تبصرہ اور تنقید سننی پڑی اور انھوں نے عالی ظرفی اور کریم النفسی کے ساتھ اس کو برداشت کیا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک سخت جملہ انھوں نے سنا اور کچھ جواب نہیں دیا، ان کے بعض اہلِ تعلق سے معلوم ہوا کہ اس کے صدمہ سے ان کو بخار آگیا۔

قاری صاحب خانوادۂ بانی دارالعلوم دیوبند کے چشم وچراغ تھے، اور راقم سطور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جن سے مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا تعلق عقیدت کا نہیں بلکہ عشق کا تھا، اور اس کا اندازہ راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب ''دہلی اور اس کے اطراف'' سے ہو سکتا ہے، جس میں مولانا نے اپنے دیوبند اور گنگوہ کی حاضری اور وہاں کے بزرگوں اور قابلِ احترام ہستیوں کے سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت ومحبت کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، قاری صاحب سے وفات سے چند دن پہلے جب لکھنؤ میں ایک تقریب میں (جس میں ان کو کسی ادارہ یا مکان کے سنگ بنیاد رکھنے کے زحمت دی گئی

www.abulhasanalinadwi.org

تھی) ملاقات ومصافحہ کا شرف حاصل ہوا، مصافحہ کرتے وقت فرمایا کہ کچھ دن آپ کے ساتھ رائے بریلی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ وکفی به شرفاً.

افسوس ہے ۶؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اس دنیائے فانی کو الوادع کہا، اور اپنے اسلاف کرام سے جا ملے، جن کی خدمت دین اور اصلاح مسلمین کی یادگاریں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔

وحسن أولئك رفيقاً.

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندویؒ

(متوفی ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء)

قارئین تعمیر(۱) نے شاید بعض اخبارات ورسائل میں مولانا اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم کے انتقال کی اطلاع پڑھی ہو، چونکہ مرحوم ملک کی سیاسی زندگی سے کنارہ کش، ایک سنجیدہ مصنف واخبار نویس، اورنہایت خاموش کام کرنے والے تھے، عرصہ ہوا کہ ندوۃ العلماء اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جن سے مولانا مدت العمر وابستہ رہے خود گوشہ گیر ہوچکے ہیں، اس لیے ان کے دیرینہ خادم اور مخلص کارکن آپ کے تعارف وتذکرہ کے محتاج ہیں، مولانا کی گوناگوں خصوصیتوں، ان کی بے لوث خدمت وتعلق اور حقوق کا تقاضا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کو فراموش نہ کیا جائے، اپنی طویل صحافتی وتصنیفی زندگی میں انھوں نے سیکڑوں جانے والوں کی تعزیت کا فرض انجام دیا ہے اوران کے کارناموں کو دُہرایا ہے، آج ان کا ذکر نہ کرنا بڑی حق تلفی اوراحسان فراموشی ہے۔

مولانا اکرام اللہ خاں مرحوم شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے، عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم وہیں پائی، اس وقت شاہ جہاں پور بڑا علمی مرکز تھا اور مختلف علوم وفنون خصوصاً معقولات کے بڑے بڑے مدرس موجود تھے، میر محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن کے لیے جب استاد واتالیق کی ضرورت پیش آئی تو شاہ جہاں پور ہی کے ایک عالم مولانا مسیح الزماں خاں صاحب مرحوم کا انتخاب ہوا، شاہ جہاں پور میں مولانا کے رفیق درس مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب دارالعلوم دیوبند بھی تھے، شاہ جہاں پور کے اساتذہ میں سے مولانا

(۱) یہ مضمون لکھنؤ سے نکلنے والے رسالہ "تعمیر" (شمارہ ۱۵ر فروری ۱۹۵۲ء) کے لیے لکھا گیا تھا۔ (ناشر)

www.abulhasanalinadwi.org

مرحوم مولوی سید محمد علی صاحب کا بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے جو فارسی کے بڑے ادیب اور عقلیات کے تبحر عالم تھے۔

غالباً مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کی تحریک واشارہ سے جو مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ندوہ کے ناظم تھے، مولانا اکرام اللہ خاں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علمی عروج کا زمانہ تھا، ہندوستان کے نامور علماء اور باکمال اساتذہ مدرس تھے، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولوی ضیاء الحسن صاحب مرحوم، مولانا عبدالباری ندوی، حاجی معین الدین ندوی وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ علامہ شبلی مرحوم معتمد تعلیم اور دارالعلوم کے طلبہ کی علمی و ذہنی تربیت کی طرف بذات خود متوجہ تھے، تکمیل کے بعد کچھ عرصہ مولانا نے دارالعلوم کے نائب مہتمم کی خدمات انجام دیں اور کئی سال تک "الندوہ" کے جو ملک کا معیاری علمی رسالہ تھا ایڈیٹر رہے، اس عرصے میں آپ کو ندوہ کی نظامت اور اس کے ذمہ داروں کا خاص اعتماد حاصل رہا۔

اسی عرصے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے علمی کاموں اور اس کے رسالہ "کانفرنس گزٹ" کی ادارت کے لیے ندوہ سے کسی موزوں آدمی کو طلب کیا، مولانا سید عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء نے اس منصب کے لیے مولانا اکرام اللہ خاں مرحوم کو انتخاب کیا، اور آپ لکھنؤ سے علی گڑھ منتقل ہو گئے، جہاں آپ نے اپنی عمر پوری کر دی۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے کانفرنس کے دوسرے علمی کاموں کے ساتھ نواب وقار الملک مرحوم کی سوانح حیات کی ترتیب کا کام مولانا کے سپرد کیا، یہ بہت بڑا کام تھا، وقار الملک کی زندگی اور ان کے کارنامے ایک طرف ہندوستان وحیدرآباد پر پھیلے ہوئے تھے، دوسری طرف ان کی سرگرمیاں سیاست وتعلیم دونوں کو محیط تھیں اور تعلیم اور سیاست دونوں میں انھوں نے عرصے تک مسلمانوں کی قیادت کی تھی، ان کی سوانح لکھنا در حقیقت مسلمانوں کی پچاس برس کی تعلیمی وسیاسی تاریخ مرتب کرنے کے مرادف

www.abulhasanalinadwi.org

تھا، یہ ایک ایسے عہد کی تاریخ تھی جو مسلمانوں کی قومی زندگی میں بہت پُر آشوب، پُر از واقعات اور نازک تھا، اس خدمت کے لیے بڑی متنوع صلاحیتیں، متوازن دماغ، پختہ قلم اور جفاکش مؤرخ درکار تھا، مولانا ان ذمہ داریوں سے بڑی خوبی و کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، انھوں نے ''وقار حیات'' لکھ کر اردو کے لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا، اردو کے تاریخی ذخیرے میں اس کتاب کو ممتاز ترین مقام حاصل ہے، بعض حیثیتوں سے اس کو ''حیات جاوید'' پر بھی فوقیت حاصل ہے، وہ عقیدت مندی کے اس غلو سے خالی ہے جس کی بنا پر مولانا شبلی مرحوم ''حیات جاوید'' کو کتاب المناقب کہا کرتے تھے، اس کے علاوہ سنجیدہ وشگفتہ طرز تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے، مسلمانوں کی پچھلی سیاسی و تعلیمی تاریخی کا ایک سلسلہ ہے جو ''حیات جاوید'' سے شروع ہوتا ہے اور ''حیات شبلی'' پر ختم ہوتا ہے ''وقار حیات'' بیچ کی کڑی ہے جس کے بغیر یہ تاریخ مکمل نہیں ہوتی، اور یہ خاص عہد سمجھ میں نہیں آسکتا، مسلمانوں کے سیاسی ارتقا اور ان کے تعلیمی نظریات اور اداروں کو سمجھنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

''وقار حیات'' کے علاوہ جوان کا ایک زندہ جاوید علمی کارنامہ ہے، آپ کی یادگار وہ صدہا مقالات ہیں جو کانفرنس گزٹ کے ضخیم فائل میں محفوظ ہیں، اور جوان کی سنجیدہ نگاری، متانتِ تحریر اور پختگی کی شہادت دیتے ہیں اور یہ وہ جوہر ہے جو ادب وصحافت کے بازار میں نایاب ہوتا جا رہا ہے، مولانا کے مقالات، طویل تمہیدوں، ادبی صنعتوں، لفظی شان وشکوہ سے خالی، گٹھے اور جچے ہوئے مضامین ہیں، یہ سنجیدہ صحافت کا وہ نمونہ ہے جو ابھی ہمارے ملک میں زیادہ رائج اور مقبول نہیں ہے، مگر زندہ اور ترقی یافتہ ممالک میں اسی کا نام صحیح صحافت ہے۔

مولانا کم گو، تنہائی پسند، قانع، مرنجاں مرنج، بے آزار انسان تھے، وہ دوست نواز، بامروت اور بڑے وضعدار تھے، برسہا برس وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن رہے، مجلس کے جلسوں کی شرکت کے لیے وہ علی گڑھ سے سفر کر کے آتے اور اپنے سب پرانے دوستوں سے ملتے، جہاں برسوں سے قیام کا معمول تھا وہیں قیام فرماتے، اس میں بھی فرق نہ آتا، اہل تعلق علی گڑھ جاتے تو مولانا ان سے اسی حیثیت سے ملتے،

اور حسب مراتب تواضع و اکرام کا حق ادا کرتے۔

ان کی دوسری ممتاز صفت یہ تھی کہ وہ پچھلے دور کی بولتی ہوئی تاریخ تھے، ندوہ و علی گڑھ کے حلقے کے علماء و فضلا اور شاہ جہاں پور، لکھنؤ، علی گڑھ کے ادباء شعراء اور روساء کے صدہا واقعات و لطائف ان کو یاد اور مستحضر تھے اور بڑی سنجیدگی اور برجستگی کے ساتھ ان کو بیان کرتے تھے، ان کی مجلس بڑی باغ و بہار ہوتی، ہفتوں ان کے ساتھ رہیئے، واقعات کی تازگی اور طبیعت کی شگفتگی میں فرق نہ آتا، اور ان کو اعادہ و تکرار کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اخیر میں وہ عرصے تک علیل و مضمحل رہے، ہندوستان کے تعلیمی و لسانی انقلاب اور پھر اخیر اخیر میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی وفات نے ان کو دل شکستہ اور بہت افسردہ کر دیا تھا، بالآخر طویل علالت کے بعد ۱۶ / جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنے خالق سے جا ملے، رحمہ اللہ و غفر لہ۔

ہندوستان میں عالموں اور ادیبوں کی کمی نہیں، مگر خاموش کام کرنے والوں اور سنجیدہ مصنفین کی ضرور کمی ہے، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی کے انتقال سے اس مختصر صف میں ایک باوقار جگہ خالی ہو گئی ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں معلوم ہوتا۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ

عالم ربانی، داعی الی اللہ وخادمِ دین مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ذات کم سے کم ہندوستان کے علمی و دینی حلقے اور خصوصیت کے ساتھ راقم کے حلقۂ احباب کے لیے قطعاً محتاجِ تعارف نہیں، شاید دو حقیقی بھائیوں میں بھی اتنی قریبی رفاقت، یکجائی، ہم نشینی، ہمسفری اور اتحاد فکر و عمل رہا ہو جو ہم دونوں میں تھا، سلوک و تربیت، تحریک و دعوت، تصنیف و اظہارِ خیال کے علاوہ تقریباً ۱۵ سال کے قریب (لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع محمد علی لین امین آباد) میں یکجائی رہی، پنج گانہ نمازوں میں معیت و شرکت، اجتماع سے خطاب و درس، کھانے اور ناشتے کی یکجائی سالہا سال قائم رہی۔ دہلی کے مرکز تبلیغ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری، ان کی دعوت میں شرکت و ہم سفری، پھر رائے پور، سہارن پور کی حاضری، عارف باللہ، و مرشد زمانہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پوری سے انتساب و ارادت، پھر رابطۂ العالم الاسلامی مکہ معظمہ کی رکنیت اور شرکت میں رفاقت اور سفر حج و زیارتِ مدینہ میں بار بار مصاحبت، اتحاد خیال و اتحاد عمل یہ سب وہ خصوصیتیں اور امتیازات ہیں جو ان دو شخصوں میں کم دیکھنے میں آتے ہیں جن کا مولد و منشا، مدرسہ و دانش گاہ، شہر و وطن اور خاندانی انتساب الگ الگ ہو۔

مولانا ایک حادثے کے نتیجے میں جو دارالعلوم دیوبند سے واپسی پر سواری پر پیش آیا تھا، پھر اس میں دوسرے سفر میں اور اضافہ ہو گیا تھا تقریباً دس سال تک اضطراراً نہ صرف خانہ نشین بلکہ صاحب فراش رہے، اس طویل مدت اور اضطراری حالت میں بھی وہ افادۂ مسلمین اور خدمت دین سے کنارہ کش اور منقطع نہیں رہے، مشہور دینی مجلہ ''الفرقان'' ان

www.abulhasanalinadwi.org

کے مضامین وافادات سے مزین و معمور رہا، اور بھی کچھ املائی و تلقینی خدمات وافادات جاری رہے، لیکن یہ مجبوری و معذوری بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۲۶/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (مطابق ۴/مئی ۱۹۹۷ء) کو انھوں نے سحر زسنگ ہوم میں جہاں وہ کئی دن سے زیر علاج و استراحت تھے داعی اجل کو لبیک کہا اور سفر آخرت اختیار کیا، ۲۷/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (۵/مئی) ۹ بجے صبح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، راقم انتقال کے دن رائے بریلی میں تھا، صبح آٹھ بجے لکھنؤ حاضر ہو گیا اور نماز جنازہ میں شرکت کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں صفیں لگ گئیں، خود دارالعلوم میں مقیم افراد (طلبہ واساتذہ) کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہی ہے، اس کے علاوہ ملحقہ مدارس و مکاتب اور شہر کے محلوں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ آگئے، شہر کی انتظامیہ نے ٹریفک کو روک دیا، پانی کے ٹینکر بھی مہیا کر دیے، دو گھنٹے میں یہ جنازہ آخری منزل تک پہنچا اور اس خادم دین، عالم ربانی کو سپرد خاک کیا گیا، غفر اللہ لہ ورفع درجاتہ.

۲۷/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (مطابق ۵/مئی ۱۹۹۷ء) کو بعد نماز مغرب دارالعلوم ندوۃ العلماء (جس میں مولانا نے کئی سال تدریس حدیث کا عمل بھی جاری رکھا اور جس کے وہ مستقل رکن انتظامی اور مشیر و معاون تھے) جلسۂ تعزیت و دعا منعقد ہوا، راقم نے وہاں جو تعزیتی تقریر کی اور اپنی طویل رفاقت اور علمی تجربات و مشاہدات کا خلاصہ پیش کیا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

حمد و ثنا کے بعد!

”وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ“.

شرکائے مجلس، برادران، ورفقائے عزیز!

میرے لیے اس وقت بڑی آزمائش کی بات ہے کہ میں اپنے رفیق مخلص، رفیق فاضل، رفیق مکرم، محبوب رفیق اور رفیقِ رفاقتِ طویلہ بلکہ رفاقتِ اطول حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (پہلی مرتبہ رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے اور کہنا ضروری ہے) کے

www.abulhasanalinadwi.org

متعلق کچھ عرض کروں، یوں تو تعلقات وروابط کی کثرت، واقفیت کے وسیع میدان اور دینی خدمات کے مختلف انواع واقسام سے تعلق وربط ہونے کی وجہ سے مجھے بارہا اس طرح کا ناخوش گوار فریضہ انجام دینا پڑا ہے اور ہندوستان ہی نہیں مشاہیر عالم اسلامی اور مشاہیر مصلحین اور اہل کمال کے بارے میں اپنے مشاہدات وتأثرات اور ان کے فضل وکمال کا اظہار کیا ہے، لیکن اس وقت مجھے جو آزمائش پیش آرہی ہے اور اس سلسلے میں جو مجاہدہ کرنا ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں، اس کی خاص طور پر دو وجہیں ہیں۔

ایک تو مولانا کا فضل وکمال، ملت اسلامیہ پر ان کے حقوق واحسانات اور دوسرے میرا وسیع تعلق، یکجا زندگی گزارنا، یکجا رہنا، اس کی مدت تقریباً نصف صدی ہے، ان سب کی وجہ سے مجھے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کا اندیشہ ہے، اس کے ساتھ ان دقتوں اور ذمہ داریوں کا احساس بھی ہے جو مجھے متفکر بنائے ہوئے ہے، میں جو کچھ کہوں گا وہ ان کے حق کی ادائیگی نہیں ہوگی بلکہ اپنے فرض کی ادائیگی ہوگی، اور یہ واقعہ ہے کہ فرض کی ادائیگی بڑی مشکل ہوتی ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مولانا ان راسخین فی العلم میں سے تھے جن کی مثال کم ملتی ہے، خصوصاً اس زمانے میں علمی انحطاط اور علمی انتشار، تحریکوں کی کثرت، مشغولیتوں کی فراوانی اور ان کا تنوع اتنا ہے کہ علم میں رسوخ حاصل کرنا بڑا مشکل ہوگیا ہے، لیکن جو لوگ مولانا سے اجمالی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں اور اس کی تصدیق کریں گے کہ مولانا ہندوستان کے ان منتخب اور مختص ممتاز علماء میں شامل تھے جنھیں علوم اسلامیہ میں رسوخ حاصل تھا، اور یہ معمولی بات نہیں ہے، وسعتِ معلومات، وسعتِ مطالعہ، تصنیف وتالیف کی صلاحیت، یہ سب چیزیں بہت عام اور کثرت سے پائی جاتی ہیں، لیکن علمی رسوخ یہ بہت اونچی بات ہے اور ایک خاص امتیاز ہے، میں خدا کے گھر میں بیٹھ کر اس کی شہادت دیتا ہوں کہ مولانا کو حدیث میں، تفسیر میں، علم کلام میں اور فرق منحرفہ ومحرّفہ کے بارے میں جو وسیع معلومات تھیں، ان سے جو غیر معمولی واقفیت اور ان کی کمزوریوں اور ان سے پیدا

www.abulhasanalinadwi.org

ہونے والے خطرات کا جتنا صحیح اندازہ ان کو تھا وہ ہندوستان کے کم علماء کو حاصل ہوگا، جن لوگوں نے یہاں ان سے ترمذی شریف پڑھی ہے، وہ اس کی شہادت دیں گے، پھر ان کی جو کتابیں ہیں وہ بتاتی ہیں کہ ان کو علم میں کتنا رسوخ حاصل تھا۔ پھر زمانے کی نبض شناسی، نئی نسلوں کی ضروریات اوران کی نفسیات اور تقاضوں سے گہری واقفیت اوران کے ذہنوں کی گہرائیوں تک پہنچنا اوران کو متاثر کرنا یہ اپنی جگہ پر ایک کمال ہے، اس کے ساتھ علم میں رسوخ اوراس کو پیش کرنے کی صلاحیت، انتخاب کی صلاحیت، ذہنوں کی رعایت، یہ ایک خاص چیز ہے، جن لوگوں نے مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں خاص طور پر ان کی کتاب ''معارف الحدیث'' جو اس مسجد میں عصر بعد سنائی جاتی ہے کم از کم اردو لٹریچر میں یہ بے نظیر کتاب ہے، جس طرح حدیث وسنت کو پیش کیا گیا ہے جس طرح اس سے سبق لینے اوراحادیث کے مختلف پہلوؤں اور مخفی گوشوں کو ابھارا گیا ہے وہ بے مثال ہے، ان کی عام فہم اور مقبولِ عام کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' نیز ''آپ حج کیسے کریں؟'' ''قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟'' ''دین وشریعت'' وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو ممتاز ہی نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے منفرد ہیں، اپنے مقصد، حسنِ انتخاب، حسنِ تعبیر، حسنِ بیان، حسنِ تفہیم اور ذہنوں کی رعایت کی بنا پر اس کو توفیق الٰہی ہی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے چوٹی کے اساتذہ مولانا سید انورشاہ کشمیری صاحبؒ جیسے حضرات سے تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے ان کو علم میں بڑا رسوخ اور کمال حاصل تھا، ان کا یہ رسوخ آخر عمر تک باقی رہا، ہمارے مشاہدے اور علم میں یہ بات ہے کہ بعض حضرات کو ابتدائی دور میں رسوخ فی العلم حاصل ہوتا ہے لیکن جوں جوں ان کی مشغولیتیں بڑھتی جاتی ہیں زندگی کے تقاضے، راحت وآرام اور خانگی زندگی کے مطالبات بڑھتے ہیں، دینی وملی اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا پڑتا ہے ان سے متاثر ہوکر بلکہ ان سے دب کر وہ ایسے ہوجاتے ہیں کہ صحیح عبارت کا پڑھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے، لیکن مولانا کا رسوخ فی العلم آخر تک باقی رہا جو بہت کمیاب بلکہ نادر بات ہے، یہ نتیجہ ہے ان کے والدین

www.abulhasanalinadwi.org

کے حسن نیت، ان کے اساتذہ کرام کی للّٰہیت وخلوص وربانیت کا، پھر مولانا کی محنت وخلوص اور مسلسل علمی اشتغال کا کہ ان کا تعلق علم سے برابر قائم رہا، آخر تک علمی رسوخ وپختگی باقی رہی، اس کا میں عینی شاہد ہوں اور قریب ترین رفیق کی حیثیت سے مجھے خود اس کا تجربہ ہے۔

مولانا کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی حمیت دینی ہے، ایک ہے حمایت، دوسری چیز ہے حمیت، حمایت میں وہ اندرونی جذبہ اور دل سوزی نہیں ہوتی، وہ دل کی تپش اور ذہن کی خلش اور وہ اضطراب وبے چینی نہیں ہوتی جو حمیت میں ہوتی ہے، حالانکہ حروف دونوں کے متقارب ہیں، اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت دینی کا جو جوہر عطا فرمایا تھا وہ کم لوگوں کو ملتا ہے، ہوسکتا ہے دینداری، عبادت گزاری، تہجد اور شب بیداری اور ذکر وشغل میں دوسرے لوگ بڑھے ہوئے ہوں، لیکن دینی غیرت وحمیت کی دولت ونعمت سے مولانا مالا مال تھے، حمیت یہ ہے کہ دل میں آگ سی لگ جائے، سوزش پیدا ہوجائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیا خطرات درپیش ہیں، مسلمانوں کی آبادی کا کیا حشر ہوگا، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے کا کیا انجام ہوگا۔

تقسیم کے بعد مسلمانوں کے یہاں رہنے کے سلسلے میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں بات واضح نہیں تھی کہ مسلمان اب کیسے رہیں گے، لیکن مولانا کا ذہن بہت واضح تھا اور ان کے سامنے کام کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا، یہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت جیسی نعمت سے نوازا تھا، یہ ایک نفسیاتی نقطہ اور تجربے کی بات ہے کہ حمیت بھی ہمیشہ یکساں باقی نہیں رہتی، اس لیے کہ علم جتنا بڑھتا اور معلومات وتجربات میں جتنی وسعت ہوتی جاتی ہے حمیت میں اسی اعتبار سے کمی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ احساس ہی ختم ہوجاتا ہے، جو لوگ عجائب گھر اور میوزیم دیکھتے رہتے ہیں ان کے اندر استعجاب کا مادّہ باقی نہیں رہتا، وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں یکساں ہیں، لیکن میں عینی شاہد کی حیثیت سے گواہی دیتا ہوں کہ اپنے وسیع علم ومطالعے اور مشاہدے کے ساتھ مولانا کے اندر دینی حمیت وغیرت بھری ہوئی تھی۔

میں نے مولانا کو سب سے پہلے ''دار المبلغین'' میں حضرت مولانا عبد الشکور صاحب کے پاس دیکھا، اس کے بعد تعارف وملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، جب میری

کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' شائع ہوئی تو جن خاص خاص لوگوں کو کتاب بھیجی ان میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ بھی تھے، مولانا نے کتاب ملنے کے بعد خط لکھا اس میں انھوں نے تحریر کیا کہ ''یہاں جو وقت ڈاک کا ہوتا ہے وہی کھانے کا ہوتا ہے آپ کی کتاب آئی تو میں اس میں اتنا مشغول ہوگیا کہ میرے لیے کھانا مشکل ہوگیا میں اس سے بہت متاثر ہوا''۔ اس زمانے میں ہندوستان میں ایک نئی تحریک چلی تھی جس کے بانی علامہ مشرقی تھے، جو نام کے تو مشرقی تھے لیکن ذہنی وفکری لحاظ سے مغربی تھے، وہ خاکسار تحریک تھی، جو اس دور کی خطرناک ترین تحریک تھی اس وقت ہندوستان میں تحریکوں کا دور تھا، اس تحریک نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں زیادہ مقبولیت حاصل کی اور ایک طوفان کی طرح پھیل گئی، مولانا کو غالباً سب سے پہلے اس کا احساس ہوا کہ اگر یہ تحریک پھیلنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے سے اس کا رابطہ ہوجاتا ہے تو ایمانی ربط جس میں غیرت اسلامی بھی ہو باقی نہیں رہے گا، معروف ومنکر اور کفر وایمان میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا، اس لیے کہ اس کے جو مقاصد تھے وہ زیادہ تر سیاسی وتنظیمی مقاصد تھے، مولانا اس وقت رائے بریلی تشریف لائے اور انھوں نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اس کی ذمہ داری قبول کروں کہ ایک جماعت بنائیں اور تحریک چلائیں اور میں اس کی قیادت اور ترجمانی کروں، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ کام اس شخص کے سپرد کرنا چاہیے جو انگریزی پر پوری قدرت رکھتا ہو انگریزی میں تقریر کرسکے، بیان دے سکے اور اخبارات میں مضامین لکھ سکے، انھوں نے کہا وہ کون ہے؟ تو میں نے اپنے پیر بھائی حاجی عبدالواحد صاحب کا مشورہ دیا جو انگریزوں کے دور میں پورے پنجاب میں ایم۔اے۔ انگریزی میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوئے تھے، ان دنوں وہ فورٹ سنڈیمن میں تھے، چنانچہ ہم رائے بریلی سے اور مولانا بریلی سے پنجاب میل میں سوار ہوکر لاہور پہنچے، وہاں مولانا مودودی سے ہم لوگوں نے ملاقات کی، پھر حاجی عبدالواحد صاحب سے ملنے فورٹ سنڈیمن گئے جو کوئٹہ سے آگے تھا اور درّہ بولان ہوکر راستہ جاتا تھا، ہم تینوں نے مشورہ کیا پھر طے ہوا کہ اپنی جماعت بنانے سے پہلے ان

www.abulhasanalinadwi.org

دینی ودعوتی مراکز اور خانقاہوں کا دورہ کرنا چاہیئے جہاں کام ہو رہے ہیں چنانچہ ہم لوگ سہارن پور ہوتے ہوئے رائے پور پہنچے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے مشورے پر ہم لوگ مرکز نظام الدین آئے، وہاں تبلیغی جماعت کے نظام کو بچشم خود دیکھا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے ملاقاتیں کیں، بالآخر ہم نے اپنی صلاحیتیں اس جماعت کی نصرت وحمایت اور استحکام کے لیے وقف کر دیں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے، بڑے بڑے اجتماعات میں شریک ہوئے، پورے ملک کا سفر کیا، باہر بھی گئے، جہاں تک تبلیغی جماعت کی افادیت اور ضرورت کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں جو کچھ ہم سے تعاون ہو سکتا تھا وہ ہم نے کیا، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے یہاں دینی وجود کے متعلق جتنا مولانا کا ذہن صاف اور واضح تھا اتنا کسی بڑے سے بڑے عالم کا نہیں تھا، مولانا نے یہاں کے جو حالات سمجھے اور خطرات اور اندیشوں کا ادراک کر لیا وہ مولانا ہی کا حصہ تھا۔

راوڑکیلا اور جمشید پور کے بھیانک فسادات میں تقریباً پانچ ہزار (۵۰۰۰) مسلمان مارے گئے، کھیتوں اور گھروں کے اندر مسلمانوں کے سر تربوز اور خربوزے کی طرح پڑے ہوئے تھے، خون کے چھینٹے دیواروں پر لگے ہوئے تھے، مولانا نے سب سے پہلے ان علاقوں کا دورہ کیا، انھوں نے مجھے آمادہ کیا کہ تم جا کر دیکھ آؤ، چنانچہ میں مولانا ابوالعرفان خاں صاحب ندوی مرحوم کے ساتھ وہاں گیا، تعلیم یافتہ ہندوؤں سے ملاقاتیں کیں، لوگوں کی رائے ہوئی کہ کوئی تنظیم قائم ہونی چاہیئے، تاکہ ملت کے دین اور تہذیب کی حفاظت کی تدبیر کی جائے، اور اس ملک کو اسپین بنانے سے بچایا جائے، چنانچہ ''مسلم مجلس مشاورت'' کی تجویز ہوئی، اس کے بڑے محرک اور داعی ڈاکٹر سید محمود تھے، ہم اور مولانا اس میں شریک ہوئے، پھر کرناٹک میسور وغیرہ کے سفر ہوئے۔

مولانا کا امتیازی وصف جو کم علماء کو نصیب ہوا ہے وہ فرق محرفہ ومنحرفہ سے گہری واقفیت اور ان کے خطرات ونقصانات کا احساس وادراک ہے، کون کون فرق محرفہ ہیں اور کون غیر محرفہ، ان فرقوں کے لیے محاذ بنانا اور اس کو اپنا فرض سمجھنا جتنا مولانا نے اس

میدان میں کام کیا اتنا شاید مولانا مرتضیٰ صاحب چاندپوری نے کیا ہو، میرے سامنے ان کا پورا کام نہیں ہے، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے قادیانیت کا مقابلہ کیا اور اس کے خطرات کا ادراک واحساس کیا، انھوں نے مونگیر میں قادیانیوں سے مقابلہ کے لیے مولانا مرتضیٰ صاحب چاندپوری کو مدعو کیا جب تک مناظرہ ہوتا رہا مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سجدے میں پڑے رہے جب قادیانیوں کو شکست فاش ہوئی اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگے تو مولانا نے سجدے سے سر اٹھایا۔ قادیانی ہوں یا بریلوی ان سب کا مقابلہ مولانا نعمانیؒ نے جتنا کیا اتنا شاید ہی کسی نے کیا ہو، مولانا زبردست مناظر تھے وہ فرق باطلہ اور فرق منحرفہ کی کتابوں سے بہت گہری واقفیت رکھتے تھے اور ان کی بہت سی عبارتوں تک کے حافظ تھے وہ اس طرح عبارت زبانی سناتے کہ جیسے دیکھ کر پڑھ رہے ہوں، اس درجہ مولانا کا استحضار اور حافظہ قوی تھا کہ اس میں مولانا کا کوئی شریک نہیں، مولانا نے شرک وبدعات کا جم کر مقابلہ کیا، ہندوستان کے مسلمانوں کو شرک کے اثرات سے بچایا، بدعقیدگی، اشراک باللہ، عبادتِ قبور، استعانت بغیر اللہ، استغاثہ لغیر اللہ سے بچایا، ہندوستان جیسے ملک میں یہ کام بڑا خطرناک اور نزاکتوں سے بھرا ہوا تھا، عالم عربی میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور مصر وشام میں شیخ حسن البنا اور دوسرے علماء اٹھے اور انھوں نے کام کیا لیکن ہندوستان میں (حضرت سید صاحبؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور چند علمائے مصلحین کے بعد) کماً وکیفاً جتنا کام مولانا نے کیا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے اور کسی کا کام بھی ہو جو ہمارے علم میں نہیں۔

۱۹۵۱ء میں لکھنؤ میں تبلیغی مرکز کی عمارت بنی، ہم دونوں کے ایک مخلص نے اس کی تعمیر اس انداز سے کی کہ ہم دونوں یہاں ساتھ رہ سکیں، مولانا اس وقت بلوچ پورہ میں رہتے تھے، مرکز میں ہم دونوں منتقل ہو گئے، پھر تو شب و روز کا ساتھ ہونے لگا، ناشتہ بھی ساتھ، کھانا بھی ساتھ، نمازوں میں بھی ساتھ، خطاب اور سفروں میں بھی رفاقت رہی، مولانا کی ربانی فراست، دینی واخلاقی صفات، ذہنی کمالات اور تصنیفی سرگرمیاں سب کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے آگئیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت کام لیا، حضرت رائے پوریؒ سے

www.abulhasanalinadwi.org

بیعت کا تعلق تھا وہ فرماتے تھے کہ قیامت میں جب اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ کیا لائے؟ تو میں دو آدمیوں کا نام لوں گا پہلا نام مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا لیا، ان کے اندر اللہ نے متضاد صفات وصلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں جن کے اندر تضاد تو نہیں لیکن عملاً تضاد معلوم ہوتا ہے، کسی کو علمی اشتغال ہوتا ہے تو عملاً دعوت کے کام میں لگنا مشکل ہوتا ہے، ہم سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو بڑے داعی ہیں، لیکن مہینوں ہو جاتے ہیں کہ ان کو کتاب دیکھنے کی نوبت نہیں آتی لیکن مولانا نے دونوں کو جمع کر رکھا تھا۔

مولانا اگرچہ دیوبند کے فاضل اور اس کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے، لیکن اس کے ساتھ ندوۃ العلماء کی تحریک سے بھی اور ندوۃ العلماء کے ادارے سے بھی ان کا مخلصانہ تعلق رہا ہے، انھوں نے یہاں کے ذمہ داروں کی درخواست بلکہ اصرار پر حدیث کی تدریس کی ذمہ داری قبول فرمائی، طلبہ نے ان سے فائدہ اٹھایا، ندوۃ العلماء کی انتظامیہ کے طویل عرصے تک رکن رہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے بنیادی رکن تھے، اس کی سرپرستی اور قلبی تعلق برابر باقی رہا، سنا ہے کہ اس بیماری میں جب ہوش وحواس بجا تھے کوئی عیادت کے لیے گیا تو انھوں نے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ ندوہ جاؤں۔

مولانا نے نازک وقتوں میں بھی اپنی اصابتِ رائے اور تجربات سے ندوے کو فائدہ پہنچایا، ندوہ کا جب پچاسی سالہ جشن ہونے والا تھا تو ہمیں فکر تھی کہ اس کی صدارت کے لیے کون موزوں شخصیت ہوگی تو مولانا نے (جب کہ ہم دونوں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے، حج کا زمانہ بھی تھا) شیخ الازہر الامام الاکبر عبدالحلیم محمود کی رائے دی، جو صوفی منش تھے اور متشرع قسم کے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کے طور پر اور اس زمانے کے حالات کو دیکھ کر نعمت نیز کرامت کے طور پر مولانا کا وجود تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لیا جو اجتماعی جگہوں پر بہت کم کیے جاتے ہیں، تصنیف کرنے والے دعوت سے گریز کرتے ہیں، جلسوں میں تقریر کرنے والوں کے لیے تصنیف مشکل ہے، اس لیے کہ وہ یکسوئی کی طالب ہے، بقدر

www.abulhasanalinadwi.org

ضرورت دینی وملی کاموں میں اور سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لینا ضروری ہوتا ہے، تعمیری سیاست کے ذریعے ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ جامعیت عطا فرمائی تھی۔

مولانا نے تمام سرگرمیوں کے ساتھ رسالہ ''الفرقان'' نکالا جو برصغیر کا نہ صرف ایک ممتاز دینی ودعوتی ماہنامہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا مکتبِ خیال اور مدرسۂ فکر تھا جس سے لوگوں کی ذہنی وفکری رہنمائی ہوتی تھی، توحید خالص اور سنت صحیحہ کا پیغام ملتا تھا، ملی ودینی شعور بیدار ہوتا تھا۔

مولانا کی وفات ملت کا ایک عظیم خسارہ ہے، پھر ان کی معذوری جس کی مدت مہینوں سے متجاوز ہوگئی تھی ملت کا نقصان تھا، مولانا کی وفات سے ملت کا ایک بڑا سرچشمۂ قوت بند ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے کارناموں کو زندہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادیؒ ایم اے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے انتقال سے ایک ایسی جامع شخصیت ہمارے علمی حلقوں سے اٹھ گئی جس کا خلا عرصے تک محسوس کیا جائے گا، مولانا ایک صحیح الفکر، صحیح العقیدہ بلکہ راسخ العقیدہ اور صحیح علمی ذوق رکھنے والے عالم تھے، وہ ایک طرف مشہور دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند کے فارغ، علوم دینیہ میں ملکہ اور پختہ صلاحیت رکھتے تھے، تو دوسری طرف مولانا نے دہلی کے مشہور تعلیمی ادارہ سینٹ اسٹیفینس کالج سے جدید علوم کی تکمیل کی تھی، اس طرح وہ قدیم وجدید علوم سے باخبر اور دونوں کے جامع تھے، مولانا جیسے ذہین شخص کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے علوم دینیہ کی تکمیل کے لیے ایسے اساتذۂ فن مہیا فرمادیے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتے ہیں، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علم اور اعتقاد دونوں میں رسوخ پیدا کرنے کے لیے تنہا ذہانت کافی نہیں، بلکہ بسا اوقات ذہانت وبالِ جان بن جاتی ہے، اس کے لیے وسعتِ مطالعہ بھی کافی نہیں، اس لیے بنیادی بات یہ ہے کہ اساتذۂ فن سے آدمی کو ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے اور پڑھنے کا موقع ملے، اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو کوئی چیز اس کی تلافی نہیں کرسکتی، یہ عجیب المیہ ہے کہ بہت سے ذہین ہی نہیں بلکہ جینیس درجے کے ذہین ترین انسان تھے، لیکن چونکہ انھوں نے اساتذۂ فن اور ان علوم کے ماہرین سے بنیادی کتابوں کا درس نہیں لیا، اس لیے ان کے فکر میں ناہمواری، نشیب وفراز، کھاڑیاں بلکہ دلدلیں بھی تھیں، مولانا اکبر آبادی مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے حدیث، فقہ، تفسیر، بلکہ علوم عصریہ اور علوم دینیہ کو محدث عصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور ان کے معاصرین سے حاصل کیا، تعلیم کا کمال یہ ہے کہ آدمی ایک دم

www.abulhasanalinadwi.org

سے اٹھ کر مبادی کے بعد آخری درجے کی چیزوں اور بلندیوں تک نہ پہنچ جائے، مناسب یہ ہے کہ پوری تعلیم تدریجی انداز سے ہو، اس میں تناسب بھی ہونا چاہیے، یہی مولانا کی خصوصیت تھی کہ انھوں نے مقدمات ومبادی اور نصاب تعلیم کی تکمیل کی۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے والد آگرہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے، ان کی معقول آمدنی تھی، لیکن انھوں نے اپنے تمام دوستوں کی مرضی اور مشوروں کے خلاف دارالعلوم دیوبند میں ہی تعلیم کے لیے انھیں داخل کردیا، بلکہ اس مقصد سے پورے گھروالوں کے ساتھ ایک مکان کرایہ پر لے کر سال بھر دیوبند میں مقیم رہے، تاکہ باقاعدہ ان کی تعلیم کا آغاز ہوجائے، اوران کا دل دینی تعلیم میں لگ جائے، پھر دینی علوم کی تکمیل وتحصیل کے بعد دہلی کے مشہور تعلیمی ادارہ سینٹ اسٹیفینس کالج میں انھوں نے عصری علوم کی تکمیل کے لیے داخلہ لے لیا، وہاں سے انھوں نے باقاعدہ میٹرک سے لے کر بی اے پھر ایم اے کیا، بعد میں پھر اس کالج میں مولانا نے تدریس کا مشغلہ بھی اختیار کیا، ان کے زمانۂ تدریس میں بعض ایسی شخصیتوں نے ان سے تلمذ حاصل کیا، جن کو بعد میں بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوئی۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کی خصوصیت بلکہ انفرادی حیثیت یہ تھی کہ انھوں نے دونوں چیزوں سے اشتغال رکھا، دینی ثقافت ودینی قابلیت بلکہ دینی مشغولیت سے انھوں نے خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، یہ ان کا بہت امتیازی اور نمایاں پہلو ہے، وہ گریجویٹ سے زیادہ ایک عالم کی حیثیت سے مشہور ومسلم ہیں، ان پر ابتدائی اور عربی تعلیم غالب رہی، اور دونوں علوم میں یکساں مہارت ہی کی بناپر مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر انتخاب مدرسہ عالیہ (کلکتہ) کی سطح کے ادارہ اور تعلیمی مرکز کی سربراہی کے لیے ان پر پڑی، جس میں جید اور ممتاز علماء جیسے مولانا حیدر علی صاحب رام پوری، مولانا امیر علی ملیح آبادی جیسے لوگ مدرس رہ چکے تھے، پھر جب ان کی ضرورت علی گڑھ میں محسوس کی گئی توانھیں صدر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے علی گڑھ لایا گیا، جہاں انھوں نے اس شعبہ کو غیر معمولی ترقی دی، پھر اس کے بعد کناڈا کی میکگل یونیورسٹی، مونٹریال میں وزیٹنگ پروفیسر

کی حیثیت سے انھوں نے کام کیا، مولانا اکبرآبادی کی یہ بات قابلِ تقلید اور قابلِ رشک ہے، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کا تخیّل درحقیقت یہی تھا کہ جامع لوگ پیدا ہوں، جامعیت کے ساتھ صحت عقیدہ، علمی اشتغال، سلامت فکر، اور استقامت ان کا شعار ہو۔

مولانا سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ساتھ ندوۃ المصنفین کے مرکز قرول باغ میں رہتے تھے، اور وہیں سے ماہنامہ "برہان" شائع ہوتا تھا، یہ ۱۹۴۰ء کا زمانہ تھا، جب مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے تبلیغ کا کام نیا نیا شروع کیا تھا۔

مولانا کی دینی دعوت سے قربت و تعلق کی بنا پر میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ دہلی شہر کے اہلِ علم سے اس دعوت کا تعارف کرایا جائے، اور ان کو قریب کیا جائے جو علمی مشغولیتوں اور بعض حجابات کی بنا پر اس دعوت سے ابھی قریبی رابطہ اور قریبی تعلق پیدا نہیں کر سکے ہیں، اس سلسلے میں جن لوگوں پر سب سے پہلے نظر پڑی ان میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی تھے، میرا تعارف مولانا اکبرآبادی سے جامع مسجد کے سامنے مولانا سمیع اللہ صاحب کے مکتبۂ عزیزیہ میں ہوا، جو علماء اور دینی کام کرنے والوں کے ملنے کی جگہ تھی، مولانا نے میرے ساتھ جو نیر رفیقِ سفر اور نوجوان کی حیثیت سے اکرام کا معاملہ فرمایا، اس کے بعد تعلقات بڑھتے گئے، یہاں تک کہ جب رسالہ "الندوہ" کے دورِ جدید کی ادارات کی ذمہ داری مجھ ناچیز اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے سپرد کی گئی تو میں نے اس برصغیر کے تمام معروف اہلِ علم سے درخواست کی کہ وہ "میری محسن کتابیں" کے زیرِ عنوان "الندوہ" کے لیے ایک مقالہ تحریر فرمائیں، مولانا سعید احمد اکبرآبادی سے بھی ہم نے اسی طرح کی درخواست کی، انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری یہ درخواست قبول کی، اس کے بعد ہی قریبی زمانے میں جامعہ ملیہ نے مجھے "مذہب وتمدن" کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی، یہ مقالہ بعد میں طبع ہوکر کتابی شکل میں شائع ہوا، اس جلسہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، پروفیسر مجیب صاحب، خواجہ عبدالحی فاروقی (صدر شعبۂ دینیات) موجود تھے، خواجہ صاحب نے مولانا اکبرآبادی

صاحب کو اس جلسے کی صدارت کی دعوت دی، اور فرمایا کہ ہمارے جلسے کا مقرر ایک نوجوان ہے، اس لیے صدر بھی ہم نے نوجوان ہی چنا ہے، بہر حال ان سے رابطہ اور تعلق بڑھتا گیا، اور بہت سی چیزوں میں اشتراکِ فکر اور اشتراکِ مذاق نے مزید رابطہ پیدا کر دیا۔

مولانا اکبر آبادی صاحب کو لکھنے کا بڑا سلیقہ تھا، انھوں نے مولانا شبلی کے اسلوب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور ان کی تحریر میں اسی کا رنگ رہا، جیسا کہ انھوں نے اپنے مضمون "میری محسن کتابیں" میں اس کا اظہار کیا، انھوں نے مولانا شبلی سے دینی مطالب کو ادا کرنے کا سلیقہ اور حوالہ دینے کا اہتمام سیکھا، اور اس کے ساتھ جب ندوۃ المصنفین کا قیام ہوا تو وہ اس کے ممتاز مصنف تھے۔ مختلف اجتماعات اور مجالس میں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، دیوبند کی مجلس شوریٰ میں، مکہ معظمہ میں بھی ملاقات ہوئی، اور جب وہ علی گڑھ میں صدر شعبۂ دینیات تھے، تو وہاں بھی مجھے بار بار جانا ہوا، ان کے علاوہ وہ پابندی سے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں شرکت کرتے تھے، ان کی خاص بات یہ تھی کہ معمولی تحریک پر تیار ہو جاتے تھے کہ طلبہ کو خطاب کریں، وہ بڑے خلوص اور بڑی شفقت و محبت کے ساتھ خطاب کرتے تھے۔

آج مولانا اس دنیا میں نہیں۔ ان کی وفات کا سانحہ اس طرح پیش آیا کہ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا، وہ علاج کے لیے پاکستان گئے ہوئے تھے، جہاں سے اچانک ان کی وفات کی خبر آئی۔ ہمارے علمی اور دینی حلقوں سے ایک صحیح الفکر، صحیح العقیدہ، قدیم و جدید کی جامع شخصیت کا اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ ہے، یہ ایسا خلا ہے جس کا عرصے تک پُر ہونا مشکل ہے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء سے ان کو جو تعلق تھا، بلکہ ان کے علم و فکر کی قدر کرتے ہوئے ہم سب کو ان کی مغفرت کی دعا کرنی چاہیے ـــــــ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے سیئات سے درگزر فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے، جن اداروں سے ان کا تعلق رہا ہے ان کو نقصان نہ پہنچے، خاص طور سے ندوۃ المصنفین کو، جو اس قریبی عرصے میں اپنے دو اہم محسنوں سے محروم ہو گیا۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا نسیم احمد صاحب فریدیؒ

برِ صغیر ہند کی سرزمین میں جس کو ایک بالغ نظر مؤرّخ (۱) نے "اکّالۃ الامم" کہا ہے، اور جہاں باہر سے آئی ہوئی کوئی قوم اپنے اصلی خط وخال کے ساتھ اور کوئی دین اپنی اصلی روح، صحیح تعلیم اور امتیازات کے ساتھ عرصے تک باقی نہیں رہا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے داخلے کے بعد سے ہر دور میں ایسے راسخ العلم غیور طبع اور صاحبِ عزیمت علمائے ربانی پیدا کیے، جنھوں نے اسلام کو کتاب وسنت کی تعلیم اور شریعت اسلامی کے تحفظ اور ملت اسلامیہ کو اپنے مخصوص عقائد اور دعوت اور اپنے ملّی وتہذیبی تشخص کے ساتھ باقی رکھنے کے لیے جدّ وجہد کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

محافظینِ شریعت اور مصلحینِ امت کا یہ سلسلہ دسویں صدی ہجری سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، جب اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور اس عظیم سلطنت کی باگ ڈور ایک ناخواندہ لیکن صاحبِ عزم اور مالکِ نظم فرماں روائے مملکت کے ہاتھ میں آ گئی تھی، جس کو باور کرایا گیا تھا کہ ہر دینِ سماوی کی عمر ایک ہزار برس ہوئی ہے، اور اب وقت آ گیا ہے کہ نبی امی کی جگہ شہنشاہ امی ایک نئے دین، نئی شریعت اور نئے نظامِ زندگی کا آغاز کرے (۲)، اس قدسی گروہ کے سرخیل وپیشوا حضرت شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ) تھے، جن کو اہلِ نظر نے بجا طور پر مجدد الف ثانیؒ کا خطاب دیا اور جس کو ایسی قبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ یہ لقب ان کے نامِ نامی کا قائم مقام بن گیا، ان کی اور ان کے

---

(۱) مکتوب علامہ سید سلیمان ندویؒ بنام راقم سطور۔

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" کا حصہ چہارم مختص بہ سیرت حضرت مجدد الف ثانیؒ از راقم، ومقدمہ "سیرت احمد شہیدؒ" بقلم حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ۔

www.abulhasanalinadwi.org

فرزندانِ گرامی مرتبت بالخصوص حضرت خواجہ محمد معصومؒ کی مساعی جمیلہ سے سلطنت مغلیہ کے تخت پر (جو سلطنت عثمانیہ کے بعد سب سے بڑی مسلم مملکت تھی) جو فرماں روا آیا وہ پہلے فرماں رواسے کہیں بہتر اور احترام دین و شریعت میں کہیں اعلیٰ اور برتر تھا، اور جو سلسلہ ایک ''ماحی دین'' (اکبر) سے شروع ہوا تھا، وہ چوتھے نمبر پر اعلیٰ درجے کے ''حامی دین'' (شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب) پر جا کر منتہی ہوا، جس کو ایک عرب فاضل اور مبصر مؤرخ (۱) نے "سادس الخلفاء الراشدین" (چھٹا خلیفۂ راشد) کا بجا خطاب دیا ہے۔

اس مثبت اور تعمیری انقلاب میں (جس کے لیے خون کا ایک قطرہ بہانے کی ضرورت پیش نہیں آئی) مخفی طور پر جس کا ہاتھ کام کر رہا تھا، وہ حضرت مجدد کی ذات اور مجددی خاندان تھا (۲)۔

پھر اسی علم تجدید و اصلاح کو اسی سلسلے کے حامل و منتسب اور جانشین حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے فرزندانِ گرامی قدر اور خلفائے کبار اور تلامذۂ نامدار نے بلند کیا، جن کی مساعی جمیلہ ہی کا نتیجہ ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ اس وقت تک اپنے دین و شریعت اور اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی ہے، ان کے چاروں صاحبزادگان حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ رفیع الدین، حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ عبدالغنی اور ان کے نبیرۂ گرامی مرتبت حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نیز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دونوں نامدار نواسوں حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت شاہ محمد یعقوب، اسی کے ساتھ اسی خاندان کے نسب و نسبت اور تلمذ اور تربیت کا تعلق رکھنے والے بزرگ مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی (خلیفۂ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ) اور خود اسی خاندان کے تربیت یافتہ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے خلیفۂ نامدار حضرت سید احمد شہیدؒ جن کو بہت سے اہلِ نظر اور اہلِ انصاف نے تیرہویں صدی ہجری کا مجدد مانا ہے، کے کارناموں کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ایں خانہ تمام آفتاب است ایں سلسلہ از طلائے ناب است

---

(۱) علامہ علی طنطاوی وشامی مقیم حجاز، صاحب تصانیف کثیرہ۔

(۲) ملاحظہ ہو مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کا مقالہ ''الفرقان'' کے مجدد نمبر میں۔

www.abulhasanalinadwi.org

زمانے کے تغیر اور نئے تقاضوں کے مطابق اسی نسبی اور نسبتی سلسلے نے ''حفاظت شریعت'' کے ساتھ ''اشاعت شریعت'' کا کام بھی اپنے ذمہ لیا، قرآن مجید کی باقاعدہ تدریس و تفہیم، اردو تراجمِ قرآن، حدیث کی نشر و اشاعت و تدریس، صحاح ستہ کو نصابِ درس میں داخل کرنے، اور حدیث و سنت کے سکّے کو ہندوستان کے علمی حلقوں اور عمومی زندگی میں رواں کرنے اور ردّ شرکت و بدعت و اصلاح رسوم کے عظیم الشان لیکن پُرخطر کام کا بیڑا اٹھانے کی وہ عظیم الشان خدمت انجام دی کہ اس خاندان اور اس کے منتسبین کو مجموعی طور پر اس عہد میں دین کا مجدد اور شریعت و سنت کا پہرہ دار اور ''نقیب و مراقب'' کا خطاب دیا جا سکتا ہے، اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں دینی حمیت و حمایت، شریعت و سنت پر عمل کی توفیق، توحید و شرک اور سنت و بدعت میں امتیاز کی صلاحیت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تبلیغ و دعوت کا جذبہ، مدارس عربیہ کا وجود، علوم دینیہ اور عربی زبان سے شغف و وابستگی، دینی کتب کی وسیع پیمانے پر اشاعت اسی خاندان فاروقی ولی اللّٰہی نسباً، مجددی نسبتاً، وحجازی و یمنی تلمّذاً کے افراد اور ان کے خلفاء و تلامذہ کی مساعی و جدّ و جہد کا نتیجہ ہے۔

ضرورت تھی اور احسان مندی کا تقاضا بھی تھا، نیز ایک تاریخی و علمی فریضہ تھا کہ ان دونوں خاندانوں پھر ان دونوں چراغوں سے روشن ہونے والے ایک تیسرے چراغ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان دونوں کے تربیت یافتہ علماء، داعیان و مصلحین اور اساتذۂ کبار کے حالات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے، ان کی تصنیفات پر وسیع و عمیق نظر ہو، پھر محض مؤرخانہ قابلیت اور انشاء پردازانہ صلاحیت کے ساتھ ہی نہیں، اندرونی جذبے، قلبی تقاضے اور عشق و عقیدت کی حرارت کے ساتھ اس کام کو نہ صرف انجام دیا جائے، ان شخصیتوں کے کارناموں کا نئی نسل سے تعارف کرایا جائے، بلکہ اس کو زندگی کا مقصد اور سعی و جہد کا موضوع بنا لیا جائے، اس لیے کہ ناخواندہ طبقہ اور منکرین و متعصبین کو بھی چھوڑ کر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل ان دونوں خانوادوں اور ان اصلاحی و تجدیدی سلسلوں کی ممتاز شخصیتوں اور کارناموں سے روز بروز ناآشنا ہوتی جا رہی تھی، اور نہ صرف

www.abulhasanalinadwi.org

ناواقفیت تھی، بلکہ ان کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا کی جارہی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے جن چند شخصیتوں کو خاص طور پر منتخب فرمایا ان میں امروہہ کے مردم خیز قصبہ (جس کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے ایک ممتاز ترین تلمیذ اور مسترشد حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہی کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے) کے مایۂ ناز فرد مولانا نسیم احمد صاحب فریدی تھے، (جن کی وفات ۱۶؍ربیع الاول ۱۴۰۹ھ- ۱۸؍اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہوئی) انھوں نے اپنی پوری زندگی اور ساری خداداد علمی وتحریری صلاحیتیں اس موضوع کے لیے وقف کردیں، اور اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے (اور مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے) کہ خاندانِ مجددی اور خاندان ولی اللٰہی کے سلسلے میں اگر کسی تحقیق اور علمی اطمینان اور تاریخی ثبوت کی ضرورت ہوتی تو انھیں سے سب سے زیادہ رہنمائی حاصل ہوتی، مولانا نے تجلیات ربانی (۱-۲) مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ، تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ مع خلفاء وصاحبزادگان، تذکرہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، تذکرہ حضرت شاہ ابوسعید رائے بریلویؒ (۱) وغیرہ شائع کرکے بہت سے ناواقف حلقوں کے لیے واقفیت بہم پہنچائی اور بہت سے ایسے معتقدین اور محبین کے لیے جن کو ضخیم کتابوں کے پڑھنے کی فرصت یا ہمت نہیں تھی، ان حضرات سے واقف کرایا، آخر میں انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ان مکتوبات کے مرتب کرنے اور شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا، جو حیدرآباد کے مخطوطات ونوادر کے ذخیرے میں مدفون تھے، نیز حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات مرتبۂ فاضل گرامی مؤرخ ہند پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی یافت ودریافت اور ترتیب میں بھی ان کی رہنمائی شامل تھی، رسالہ ''الفرقان'' کے ان دو قابل

---

(۱) آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے، اور حضرت شاہ ولی اللہ کے خلفائے کبار میں، آپ کے نام شاہ عبدالعزیزؒ اور خاندان ولی اللٰہی کے ممتاز افراد کے کثیر تعداد میں خطوط آئے جن میں اہم واقعات ووفیات کی اطلاع ملتی ہے اور جن سے اس خاندان والا شان کے ارکان کا شاہ ابوسعید صاحب اور ان کے خاندان سے گہرے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے، اور آپ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، ان خطوط کا مجموعہ سید صاحبؒ کے خاندان میں موجود تھا، اور مولانا نسیم صاحب نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

www.abulhasanalinadwi.org

قدر اور بیش قیمت خصوصی نمبروں میں بھی جو حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضراتِ شہیدین کی یاد میں نکالے گئے، اور جنھوں نے ضخیم اور محققانہ مستقل تصنیفات کی قائم مقامی کی اوران بھولی ہوئی داستانوں کو یہ کہہ کر یاد دلایا اور تازہ کردیا ۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

ان کا بنیادی اور مرکزی حصہ رہا ہے، اوران کے مؤثر پُر از معلومات مقالات نے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا اوران کو ان دونوں سلسلوں میں اور ہندوستان کے آخر دور کی اصلاحی، تجدیدی تاریخ کا ''دائرۃ المعارف'' (انسائیکلوپیڈیا) کہنا صحیح ہوگا، اوران کی وفات سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے، موجودہ نسل کے ذہنی رجحان اور خاص طرح کے علمی ذوق کے پیش نظر اس کا پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے، راقم سطور نے اپنی تقریر میں جو ان کی وفات کی اطلاع پاکر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسے میں کی تھی، اور جس میں حسن اتفاق سے ان کے نامور اور قابل فخر خواہر زادہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی بھی موجود تھے۔ ان کی شخصیت کی دو اہم خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''مولانا مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے، الحمد للہ مجھے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ندوہ میں تشریف لاتے رہتے تھے، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، مجھ سے ان کی خط وکتابت رہتی تھی، اس لیے میں قریبی واقفیت کی بنا پر ان کی دو اہم خصوصیات کا تذکرہ کرنے جارہا ہوں، مولانا نسیم احمد فریدی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا علمی ذوق اور علم میں ان کی فنائیت ہے، علم سے ان کو وہی تعلق تھا جو مچھلی کو پانی سے ہوتا ہے، علمی اشتغال رکھنے والے، تصنیف وتحقیق کرنے والے بہت سے مل جائیں گے، لیکن ایسے لوگ جو علم میں فنا ہوں، علم جس کا ذوق ہی نہیں، بلکہ ذائقہ بن چکا ہے، علم ہی ان کے لیے غذا، دوا، شفا سب کچھ ہو وہ مولانا نسیم احمد فریدی تھے۔ فریدی صاحب مرحوم کی دوسری خصوصیت ان کی سادگی، تواضع، فروتنی اور اخلاق ہے، مولانا مرحوم اتنی سادگی

سے رہتے تھے کہ اجنبی آدمی دیکھ کر بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کوئی بڑے عالم و مصنف ہیں، ہر شخص سے بہت تواضع و اخلاق سے ملتے تھے، موصوف شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور مسترشد و مرید و مجاز تھے، مولانا مدنیؒ سے انھیں بڑی عقیدت اور شیفتگی تھی''۔

مولانا نے قرب وجوار کے علاقوں میں درجنوں مکاتب قائم کیے، اور بہت مقبول و محبوب رہے۔

مولانا کے حقیقی بھتیجے ڈاکٹر نثار احمد صاحب فاروقی، مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے (یعنی مولانا فریدی) اپنے ۷۷ سالہ زندگی میں سخت مجاہدے کیے، امید نہیں کہ اب ہم اپنی بچی کھچی زندگی میں ان جیسی کوئی اور شخصیت دیکھ سکیں گے، جو عالم بھی ہو، درویش بھی، محقق بھی، مؤرخ بھی، ادیب و شاعر بھی، فقیہ مفتی بھی، جس کا علم اس کے اعمال میں رچ گیا ہو، جس نے سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پر عمل کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا ہو، جس نے اطراف وجوانب کے درجنوں دیہات میں دینی مدرسے قائم کر دیے ہوں، نصف صدی سے زیادہ تبلیغ کا کام پورے اخلاص، جانفشانی سے کیا ہو، فقر و مسکنت کی زندگی، اپنی طبیعت ثانیہ بنا چکا ہو۔

اسی خط میں مزید لکھتے ہیں:۔

''انتقال صبح ۸ بج کر ۴۵ منٹ پر ہوا، اسی دن رات میں ۱۰ بج کر چالیس منٹ پر اسی مسجد میں مدفون ہوئے، جس میں ان کے شب و روز گزرتے تھے، اسی جون کے مہینے میں اپنی سخت علالت کے باوجود اپنے پاس سے گیارہ ہزار روپے صرف کر کے مسجد کی تعمیر کرائی تھی، یہ گویا اس جگہ کی قیمت تھی، جو ان کی قبر کے لیے ملی ہے، اخبار اور ریڈیو وغیرہ میں خبر نہ آنے کے باوجود (جنازہ میں) مجمع ۲۵ ہزار سے کم نہ تھا، ہر طبقے اور ہر علاقے اور ہر مکتب اور ہر مذہب کے افراد موجود تھے۔

میں نے کسی جنازہ میں اتنے بہت سے حضرات کو روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا

www.abulhasanalinadwi.org

تھا، جتنا مولانا فریدی کے لیے اشکبار دیکھا، ایک ڈاکٹر صاحب نے جو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہ کے وصال کے وقت موجود تھے، مجھ سے بیان کیا کہ مولانا فریدی کی میت دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ آرام فرما رہے ہیں، جو بھی ملتا تھا، وہ اپنی نئی اور نرالی داستان سناتا تھا، جس سے مولانا فریدی کے اعلیٰ روحانی مراتب کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کے پُر کرنے کی سبیل پیدا فرمائے۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

چند خادمانِ دین، کارکنانِ ملت

احباب و رفقاء

- برادر محترم سید محمد جمیل صاحبؒ
- حاجی عبدالرشید ارشدؒ
- پروفیسر محمد سمیع صاحب صدیقیؒ
- مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندویؒ
- مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندویؒ
- مولانا محب اللہ صاحب لاری ندویؒ
- ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائیؒ
- سید صباح الدین عبدالرحمنؒ
- حکیم عبدالقوی صاحب دریابادیؒ
- پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامیؒ
- مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی جے پوری
- مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری (برمی)
- حاجی احمد غریب صاحبؒ
- محمد اسد صاحبؒ (سابق لیوپولڈ ویس)

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

برادر محترم سید محمد جمیل صاحبؒ

راقم الحروف نے اپنی کتاب "پرانے چراغ" (حصہ اوّل) میں اپنے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے احباب خاص میں سے ایک ممتاز شخصیت اور والد صاحب مرحوم کے عزیز ومعتمد دوست اور پیر بھائی (۱)، الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری کا تفصیل سے تذکرہ کیا اور تعارف کرایا ہے (۲)، سید محمد جمیل صاحب مرحوم جن کا تذکرہ اور مختصر تعارف اور اپنے مشاہدات وتأثرات کا قلم بند کرنا اور قارئین کے سامنے پیش کرنا اس وقت پیش نظر ہے، انھیں کے بڑے صاحبزادے تھے، سیرت وسوانح کے مطالعے کے ایک شائق اور ایک حقیر سوانح نگار اور تاریخ نویس کے ذاتی تجربے اور کسی قدر وسیع اور متنوع مطالعے کی روشنی میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کی خصوصیات وکمالات، مذاق ومزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے اس کے والد ومربی کے حالات وخصوصیات، خاندانی پس منظر اور اس کے عہد وماحول سے واقف ہونا نہ صرف اس شخصیت کی خصوصیات، نشو ونما وارتقا کے عناصر وعوامل کے سمجھنے میں ممدّ ومعاون ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات ضروری ولابدّی ہوتا ہے، اور اس کے بغیر اس کی شخصیت کا منصفانہ وحقیقت پسندانہ مطالعہ، اس کے مختلف اور بعض اوقات متضاد خصوصیات کا تجزیہ وتحلیل دشوار اور بعض اوقات ناممکن ہوتی ہے، اس لیے راقم سطور کا بلاکسی تواضع وانکساری کے ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے مخلصانہ مشورہ ہے کہ "پرانے چراغ" حصہ اول

---

(۱) دونوں مرحومین اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی (م ۱۳۱۳ھ) کے مرید ودست گرفتہ اور معتقد خاص تھے۔

(۲) "پرانے چراغ" حصہ اول صفحہ ۲۹۶-۳۱۴

www.abulhasanalinadwi.org

کے اس مضمون کو جو اٹھارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ضرور پڑھنے کی کوشش کی جائے۔

راقم سطور نے جس عہد و ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں، اور اس نے سمجھنا بوجھنا شروع کیا (والد صاحبؒ کی وفات ۲؍فروری ۱۹۲۳ء کی ہوئی) وہ والد صاحب کے انتقال کے ۳-۴ سال بعد کا زمانہ ہے، جب اس کی عمر ۱۲-۱۳ سال کی تھی، یہ زمانہ انگریزی سلطنت کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا، اور جدید مغربی تعلیم کا ذہنوں اور اخلاق و کردار سے لے کر عقیدت و سیرت اور تہذیب و معاشرت پر جادو کا سا اثر تھا، جو لوگ اسکولوں اور کالجوں سے پڑھ کر نکلتے تھے، بلکہ جو ابھی تعلیم پا رہے تھے، وہ مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور اپنی اپنی سطح و معیار اور معاشی و اقتصادی درجے کے مطابق مغربی تہذیب اور انگریزی لباس اور ہیئت کے چلتے پھرتے پُرزے معلوم ہوتے تھے، نمازوں کی پابندی، شریعت کے احترام، اسلامی شعائر داڑھی وغیرہ اور دین سے واقفیت کا تو ذکر ہی کیا، انگریزوں کی نقالی، انگریزی کے چند لفظ بول لینے پر فخر اور اہل دین وعلماء کی تحقیر و استہزا ان کا شعار بن گیا تھا، ابھی تحریک خلافت نے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں وہ عام ردِ عمل اور مغربی اقتدار و تہذیب سے بغاوت کا وہ رجحان پیدا نہیں کیا تھا (یا کم سے کم وہ راقم سطور کے سامنے نہیں آیا تھا) جو رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ، ان کے رفقاء اور تحریک خلافت کے قائدین کے نعرۂ جنگ و بغاوت، اور اپنی سیرتوں اور صورتوں کی تبدیلی سے (تفاوتِ درجات کے ساتھ) ہندوستان کے مختلف حصوں میں دیکھنے میں آیا۔

اس وقت راقم سطور کی نگاہوں کے سامنے (جو ابھی بچپن ہی کی منزل میں تھا) نمایاں طور پر دو ہی نمونے ایسے آئے جو خالص انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں انگریز اور نیم انگریز اساتذہ سے تعلیم پانے اور اس میں نمایاں امتیاز حاصل کرنے کے باوجود، نہ صرف مغربی تہذیب، مغربی افکار و اقدار اور انگریزوں اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی نقل و تقلید سے آزاد، بلکہ ایک حد تک باغی تھے، بلکہ خالص اسلامی لباس و شعائر کا نمونہ، عقائد میں بالکل راسخ و متصلّب اور فرائض و عبادات کے پابند تھے، یہ دونوں جوان تھے، ایک

www.abulhasanalinadwi.org

برادر مربی ومحترم مولوی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنی جو کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ایس۔سی (B.SC) کی امتیاز (۱) کے ساتھ ڈگری حاصل کر کے میڈیکل کالج لکھنؤ میں تعلیم پارہے تھے، دوسرے برادرِ محترم سید محمد جمیل صاحب جنھوں نے ریاضیات (Mathematics) میں امتیاز حاصل کیا تھا، اور کالج سے پڑھ کر نکلے تھے، دونوں خالص ہندوستانی لباس میں، منھ پر داڑھی، نمازوں کے سخت پابند، اول الذکر مکمل عالم اور دو دینی مدرسوں (دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند) کے فارغ اور نامور عالم دین، مصنف ومحقق مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ کے صاحبزادہ، دوسرے برادرِ محترم سید محمد جمیل صاحب الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری (مرید حضرت گنج مرادآبادی) کے صاحبزادہ۔

پھر جب راقم کا قیام بھائی صاحب مرحوم کی میڈیکل کالج سے فراغت کے بعد اپنے قدیم محلّہ بازار جھاؤلال (۲) لکھنؤ میں ہوگیا، تو عم محترم سید محمد خلیل صاحب اور ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر سید محمد جمیل صاحب کی زیارت اور ان کو قریب سے دیکھنے کا زیادہ موقع ملا، کیونکہ وہ اس وقت احاطۂ لال خاں میں رہتے تھے، جو بازار جھاؤلال کے بالکل متصل ہے، اس وقت جب دیکھا بھائی جمیل صاحب کو انھیں خصوصیات کے ساتھ پایا جو اعلیٰ انگریزی تعلیم پانے والے اور آسودہ حال طبقہ کے نوجوانوں میں کمیاب بلکہ نایاب تھیں، چہرے پر داڑھی (جس کا ابھی آغاز ہی ہوا ہوگا) سادہ لباس، نمازوں کی پابندی، بزرگوں کا ادب واحترام اور سنجیدگی وشائستگی۔

داڑھی کا ذکر آگیا تو یہ لکھنا فائدہ اور دلچسپی اور عبرت وموعظت کے لیے بھی مفید معلوم ہوتا ہے کہ غالباً انھوں نے خود سنایا کہ جب اکاؤنٹس کے ایک بڑے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ان کا (غالباً شملہ میں) ماہرین کی ایک کمیٹی کے سامنے جن میں

---

(۱) بھائی صاحب کو کیننگ کالج میں فرسٹ کلاس آنے پر سونے کا تمغہ اور پوری الٰہ آباد یونیورسٹی میں (جس سے کیننگ کالج ملحق تھا) نمبر دوم آنے پر ایک دوسری دھات کا تمغہ ملا تھا۔

(۲) اب یہ گلی محمد علی لین کے نام سے مشہور ہے، اس کے سامنے جو سڑک جاتی ہے وہ گوئن روڈ کہلاتی ہے، اور یہ سب امین آباد پارک کے عقبی حصہ میں واقع ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

غالباً سب انگریز تھے، انٹرویو ہونے جا رہا تھا، تو ان کو ایک تجربہ کار خیر خواہ نے مشورہ دیا کہ تم اپنی داڑھی منڈا دو، اس داڑھی کے ساتھ تمہارا انتخاب نہیں ہوسکے گا، بھائی سید محمد جمیل صاحب نے مجھے خود سنایا کہ اس انٹرویو میں ایک قادیانی نوجوان بھی شریک ہو رہے تھے، ان سے بھی یہ کہا گیا، انھوں نے اپنے اتالیقوں اور سرپرستوں سے پوچھا اور اس خطرہ کا اظہار کیا، اور بھائی جمیل صاحب نے اپنے والد محترم الحاج سید خلیل صاحب سے پوچھا، ان کا بیان ہے کہ قادیانی نوجوان کو ان کے سرپرستوں نے یا ان کے دینی رہنما نے داڑھی منڈانے کی اجازت دے دی، لیکن سید محمد خلیل صاحب نے جواب میں لکھایا کہا کہ رازقِ حقیقی خدا ہے، وہ چاہے گا تو اس داڑھی کے ساتھ بھی انتخاب ہو جائے گا، داڑھی منڈانے کی ضرورت نہیں، بھائی جمیل صاحب یہ عبرت ناک اور سبق آموز نتیجہ سناتے تھے کہ قادیانی نوجوان کا داڑھی منڈانے کے باوجود انتخاب نہیں ہوا، اور ان کا داڑھی کے باوجود انتخاب ہو گیا، اور پھر ان کے حلقۂ تعارف کو معلوم ہے کہ وہ ترقی کرتے کرتے ہندوستان میں اس شعبے کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچے اور جب وہ پاکستان منتقل ہوئے تو وہاں کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے اعلیٰ عہدہ پر پہنچے اور اسی سے پنشن لی "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ"۔

بھائی جمیل کچھ عرصے مدراس کے اکاؤنٹس کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے، پھر ریلوے کے چیف اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا اور دہلی میں ان کی پوسٹنگ ہوئی، یہ وہ زمانہ ہے کہ جب راقم سطور کا حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری اور نظام الدین قیام کا دور شروع ہوا تھا (۱۹۴۱ء-۱۹۴۴ء) اسی زمانے میں بھائی جمیل صاحب اور ان کے والد محترم چچا سید محمد خلیل صاحب کا قیام بھی قرول باغ میں رہتا تھا، قریب ہی ندوۃ المصنفین کا دفتر واقع تھا، جہاں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا قیام تھا، دوسری طرف مولانا محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کچھ عرصے کے لیے ہندوستان آئے ہوئے مقیم تھے، راقم سطور اکثر وہاں حاضر ہوتا اور کبھی یکجا اور کبھی متفرق ان حضرات سے ملاقات ہوتی، اس کے کچھ

www.abulhasanalinadwi.org

عرصے بعد ہی ملک کی آزادی، تقسیم اور قیام پاکستان کا واقعہ پیش آیا اور ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کی طرح (اور غالباً ملازمت کی انتظامی واقتصادی تقاضوں کی بنا پر) بھائی سید محمد جمیل صاحب بھی پاکستان منتقل ہوگئے، اور وہاں کچھ ہی عرصے کے بعد اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر فائز ہوئے، ان کا تقرر اور قیام ایک عرصے تک اس عہدے پر مشرقی پاکستان میں ہوا، اور اسی دوران قیام میں انھوں نے ہمارے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کو ڈھاکہ تشریف لانے کی دعوت دی، (ان سے غالباً قیام پاکستان کے زمانے میں بیعت کا تعلق ہوگیا تھا) یہ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے، حضرت مولانا محمد صاحب لائل پوری کی معیت میں ڈھاکہ تشریف لے گئے اور سید محمد جمیل صاحب کی کوٹھی پر قیام فرمایا، سید جمیل صاحب حضرت کی ہمرکابی میں چاٹگام بھی گئے، مشرقی بنگال میں حضرت کا قیام پندرہ دن رہا، سید جمیل صاحب نے اس قیام کے دوران حضرت کی خدمت اور ہمرکابی اور حضرت کی تشریف آوری سے افادۂ عام کا شرف اور سعادت حاصل کی۔

مشرقی پاکستان سے پھر وہ پورے پاکستان کے اکاؤنٹنٹ جنرل ہوکر کراچی آگئے اور کئی سال تک اس عہدے پر فائز رہے، ۱۹۵۴ء میں (رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ) حضرت رائے پوری کا قیام کوہ مری گھوڑا گلی میں جناب محمد شفیع قریشی صاحب اور ملک محمد دین صاحب کی دعوت اور درخواست پر ہوا، راقم سطور بھی حاضر تھا، اور اس کا قیام ایک ہی کمرے میں عم محترم سید محمد خلیل صاحب اور برادر محترم سید محمد جمیل صاحب کے ساتھ رہا، عم محترم ہم دونوں کو بالکل اپنے فرزندوں کی طرح دیکھتے اور سلوک کرتے تھے، ۲۴ گھنٹے ساتھ رہ کر باپ بیٹے (رحمۃ اللہ علیہما) کے معمولات، اخلاق و برتاؤ اور عبادت کے انہماک کو بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور دونوں کو بہت ممتاز پایا۔

۱۹۵۶ء میں بھائی جمیل صاحب اپنے والد محترم کے ساتھ چند دن کے لیے لکھنؤ تشریف لائے، سفر کا اصل مقصد تعلق والوں (خاص طور پر بھائی صاحب مرحوم) سے ملنا ہی تھا، عم محترم کی شفقت اور برادر محترم کی محبت اور اس ملاقات کی مسرت ابھی تک ذہن

www.abulhasanalinadwi.org

میں تازہ اور آنکھوں کے سامنے ایستادہ ہے۔ دینی استقامت، اسلام کے لیے فکر مندی اور خوش اوقاتی کے ساتھ ان کی ایک بڑی امتیازی صفت اپنے والد ماجد کی خدمت اور ان کا ادب و تعظیم بھی تھی، لوگوں نے ان کو (اس مرتبہ و وجاہت کے باوجود جوان کو حاصل تھی) والد کے جوتوں کے فیتے کھولتے دیکھا ہے، اور یہ تو راقم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ والد صاحب قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے ہیں، اور وہ ان کا کوٹ لیے انتظار میں کھڑے ہیں کہ وہ فارغ ہوں تو وہ ان کو پہنائیں۔

پاکستان کے قیام میں برادرِ محترم سید محمد جمیل صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اور خصوصی شغف واہتمام اس نوزائیدہ اسلامی ملک میں عیسائیت کی اشاعت وفروغ کے خلاف ان کی فکر و مہم تھی، غالباً پاکستان میں چند ہی افراد ایسے ہوں گے جن کو اس خطرے کا ان کی طرح احساس اور اس کے سدِّ باب اور استیصال کے لیے ان کا سا اہتمام ہوگا، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ لاہور کے دورانِ قیام میں (جو غالباً صوفی عبدالحمید صاحب وزیر پنجاب کی کوٹھی پر تھا) بھائی سید محمد جمیل صاحب نے ذرا تفصیل سے حضرت کے سامنے اس کا نقشہ کھینچا اور اس کی وسعت اور سنگینی کا اظہار کیا، اس وقت جہاں تک یاد ہے، حضرت کے حجرے میں ان کے اور راقم سطور کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، حضرت نے سب کچھ خاموشی سے سنا اور جواب میں فرمایا کہ ''تم ہو تو انشاء اللہ خطرہ نہیں ہے''۔ وکفیٰ به شهادةً.

پھر ان کا دوسرا کارنامہ (جو اپنی اہمیت اور عظمت میں کسی طرح کم نہیں ہے) ان کا کوریا کا سفر و قیام ہے، اور وہاں ان کے قیام سے اسلام کی جو اشاعت اور مسلمانوں کی (جو ترکی افواج اور باہر کے آئے ہوئے مسلمانوں کی شکل میں تھی) جو خدمت اور بعض مساجد کی جو تعمیر عمل میں آئی وہ سنہرے بلکہ نور کے حروف میں لکھنے کے قابل ہے، وما التوفیق إلا من عند الله. (۱)

---

(۱) کوریا کے بارے میں بعض بیانات، حالات کے جائزے اور سفرناموں میں سید محمد جمیل صاحب کے ان تبلیغی و تعمیری خدمات کا اعتراف اور تذکرہ ملتا ہے، جو انھوں نے وہاں انجام دیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

اعلیٰ ملازمت سے فارغ ہونے اور پنشن یاب ہونے کے بعد انھوں نے کراچی میں اشاعتِ قرآن اور دینی تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز کی جس کا ذوق ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا، اور اس میں انھوں نے اضافہ بھی کیا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب راقم سطور سعودی عرب اور یورپ کے سفروں میں آتے جاتے کراچی کے چندروزہ قیام میں اپنے قریبی اعزہ اور اہل خاندان کو چھوڑ کر عمِ محترم سید محمد خلیل صاحب کے حق ومرتبے کے احترام میں اور ان کی وفات کے بعد بھائی سید محمد جمیل صاحب کے خلوص ومحبت کی بنا پر انھیں کے یہاں قیام کرتا تھا، اس قیام کے دوران ان کی ان اصلاحی، تعلیمی ودینی سرگرمیوں سے واقفیت کا قریبی موقع ملا، اور بعض اوقات ان کی دعوت وارشاد پر ایسی بعض مجالس کو خطاب کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

آخر وہ ناگزیر اور باعث قرب وسعادت سفر آخرت پیش آگیا جس سے کسی کو چارہ نہیں، اور وہ ۲۶ رجنوری ۱۹۸۸ء کو راہی ملک بقا ہوئے، غفر اللّٰہ له ورفع درجاته.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

حاجی عبدالرشید ارشد پشاوریؒ

دفینِ مکہ

مارچ ۱۹۴۴ء میں مجھے مجلس سیرت پشاور کے سکریٹری، اے۔آر۔ارشد صاحب کا خط ملا کہ اس سال مجلس سیرت پشاور کی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو اس کے سالانہ جلسے میں جو بڑے اہتمام سے ہوتا ہے مدعو کیا جائے، صوبۂ سرحد اور پشاور سے آپ کے خاندانی روابط بھی ہیں اور وہ حضرت سید صاحب کی تحریک اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی جولان گاہ رہا ہے، اس لیے آپ کو ایک بار یہاں آنا چاہیے۔

میں مجلس سیرت اور اس کے سکریٹری کے نام سے بھی نا آشنا تھا، اور ہندوستان کے ان نامور مقررین میں بھی میرا شمار نہیں تھا، جن کو دور دراز مقامات سے دعوت دی جاتی ہے، خط میں اس کا بھی تذکرہ تھا کہ عام طور پر اس جلسے کے لیے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کو دعوت دی جاتی رہی ہے، اس سال کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ دو ندوی فضلاء کو مدعو کیا جائے، ایک آپ، دوسرے مولانا قاری شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی ندوی۔

معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اس خط کو پڑھ کر ایک خاص طرح کی مسرّت وانشراح محسوس ہوا، اور پشاور کے سفر کا جذبہ پیدا ہو گیا، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب) نے بھی پشاور کی نسبت اور تعلق سے اس سفر کی منظوری دے دی اور تائید فرمائی، میں نے سفر کی اطلاع دے دی۔ ہمارے کرم فرما اور مخلص سید صغیر حسن صاحب (۱) نے

---

(۱) سکریٹری حکومت یوپی جو ادارۂ تعلیمات اسلامی کے درس قرآن میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، موہان ضلع اناؤ کے سادات میں تھے، اور راقم سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جب سنا تو سفر میں رفاقت اور مدد کے لیے اپنی طرف سے مولوی عبدالغفار صاحب ندوی جونپوری کو ساتھ کر دیا کہ تنہا سفر مناسب نہیں، ہم نے پہلے مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری دی جن کی علالت کا سلسلہ ایک دو مہینے سے جاری تھا، مولانا نے دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا اور چلتے وقت کہا کہ "اپنا کام نہ بھولنا"۔

دہلی سے پشاور تک فرنٹیر میل کے سکنڈ کلاس ریزرو میں سفر تھا، راستہ عجیب فرحت وانبساط کے ساتھ گزرا، کسی درمیانی اسٹیشن سے شاہ جعفر صاحب بھی ساتھ ہو گئے، لاہور کے اسٹیشن پر برادر عزیز سید احمد الحسنی موجود تھے، انھوں نے دوپہر کا کھانا پاس کے ریسٹورنٹ میں کھلایا اور رخصت کیا، پشاور پہنچا تو اسٹیشن پر (گاڑی کے کئی گھنٹے لیٹ ہونے اور نصف شب میں پہنچنے کے باوجود) ارشد صاحب اپنے چند احباب کے ساتھ موجود تھے، ہمارا قیام ملک خدا بخش صاحب اسپیکر صوبہ سرحد اسمبلی کی کوٹھی پر ہوا۔

اگلے دن سیرت کے پہلے اجلاس میں تقریر ہوئی، اتفاق سے ہم دونوں کی تقریر کچھ بنی نہیں، میں نے ایک ایسا موضوع اختیار کیا جو درسی اور علمی حلقہ کے لیے تو موزوں تھا، لیکن عوام کے لیے نہیں، وہ ندوی نوجوان جو دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، یا پڑھ کر نکلے تھے، اور جن کو اس پر بڑی مسرت تھی کہ اس مرتبہ پہلی بار دو ندوی فضلاء کو مدعو کیا گیا ہے کچھ متاثر نظر آئے، انھوں نے ایسے اشارے کیے جن سے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی خواہش ہے کہ یہ پہلا تجربہ کامیاب ہو، اور اہل شہر اچھا تاثر لیں، مجھے بھی اپنی تقریر نہ جمنے کا احساس تھا، قیام گاہ پر آیا تو دعا کی جس میں ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی جو اکثر رنگ لاتی ہے، میں نے خدا کے سامنے اپنے عجز و نااہلیت کا اقرار کرتے ہوئے مدد کی دعا کی۔

دوسرے دن کا جلسہ اصل جلسہ تھا، اس دن دفاتر میں تعطیل کر دی گئی تھی، اور ہزاروں کی تعداد میں شہر اور قرب و جوار کے مسلمان جلسہ میں آئے تھے، غالبًا سکندر مرزا بھی جو اس وقت اعلیٰ انتظامی عہدے پر تھے، موجود تھے، اور سردار عبدالرب نشتر (۱) بھی

(۱) بعد میں وزیر حکومت ہند۔

www.abulhasanalinadwi.org

تشریف رکھتے تھے، میں احتیاطاً لکھنؤ سے سیرت پر ایک مضمون لکھ کر (جو بعد میں ''سیرت محمدی کا پیغام بیسویں صدی کی دنیا کے نام'' کے عنوان سے شائع ہوا) لے گیا تھا، میں نے ارشد صاحب سے اس کے پڑھنے کی اجازت چاہی، انھوں نے کہا کہ عام طور پر لکھے ہوئے مضامین عوامی جلسوں میں جمتے نہیں اور لوگ ان کو صبر وسکون کے ساتھ سن نہیں سکتے، ہندوستان کے ایک نامور اہل قلم بھی ایک سال آئے تھے، اور انھوں نے بھی مضمون پڑھا، لیکن اُکھڑا اُکھڑا سا رہا اور بے دلی سے سنا گیا، میں نے توکلاً علی اللہ تقریر شروع کی، مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت مضامین کا ورود کہاں سے ہو رہا تھا، اور زبان میں طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں خود بھی اس کے زور میں بہہ رہا تھا اور مجمع بھی مست و سرشار تھا، بعض دیکھنے والوں نے بتایا کہ سردار عبدالرب نشتر چہرہ پر رومال رکھے ہوئے تھے اور آنکھ سے آنسو جاری تھے، تقریر ختم ہوئی تو بہت سے پٹھان اُٹھ کر سامنے آئے اور کہا کہ کیا حکم ہے؟ اسی تقریر کو میں نے پھیلا کر ''الی ممثلی البلاد الاسلامیہ'' (ممالک اسلامیہ کے نمائندوں سے) میں مقالے کے انداز میں ادا کیا ہے۔

اس سفر کا سب سے بڑا تحفہ اور کامیابی عبدالرشید ارشد صاحب کی یافت اور دریافت تھی، جو پشاور میں ٹیلیفون کے محکمے میں ایک اچھے عہدے پر تھے، میں اپنی زندگی میں جن چند آدمیوں سے متاثر اور ان کا معتقد ہوا ہوں، اور جن میں میں نے ایسا اخلاص، فہم، دماغی توازن اور قوتِ عمل دیکھی ہے، جو ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں سے کسی ایک میں ہوتی ہے، ان میں ایک ارشد صاحب تھے، ان کو بھی مجھ سے ایسا تعلق ومناسبت پیدا ہوگئی تھی، جو کم دوستوں اور عزیزوں کو ہوتی ہوگی، تقریر نے پشاور میں ایک خاص دینی فضا پیدا کر دی، جگہ جگہ اس کا چرچا تھا، اس لیے مقرر کی بات کا وزن اور وقعت بڑھ گئی، اس فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تبلیغی طریقے کی دعوت دی، ایک نئی کالونی میں جہاں ملازمین وعہدہ دار رہتے تھے، صوبہ سرحد کا پہلا تبلیغی گشت ہوا، اور اسی وقت سے صوبہ سرحد میں تبلیغی کام کی بنیاد پڑ گئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اگلے ہی مہینے اپریل ۱۹۴۴ء میں ارشد صاحب مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں نظام الدین حاضر ہوئے، میں نے حضرت کو جو تعارفی عریضہ لکھا اس میں یہ بامعنی فقرہ بھی تھا کہ ''ارشد صاحب صوبۂ سرحد کے رجل رشید ہی نہیں ارشد ہیں''۔(۱)

ارشد صاحب کو بھی مولانا کی ذات اور تبلیغی کام سے ایسا گہرا اور پائدار تعلق ہوا کہ انھوں نے پہلے پشاور اور کلکتہ میں پھر جاپان اور حجاز میں اس کو سلیقے سے انجام دیا، جاپان میں تو ان کے ہاتھوں قبول اسلام کا دروازہ کھل گیا(۲)، اور حجاز میں اس کام کا وسیع تعارف اور خواص کا رجوع ہوا، وہ اس سلسلے میں امریکہ بھی گئے، حکومت سعودیہ نے آٹومیٹک ٹیلی فون کی اسکیم منظور کی تو اس کے انچارج اور افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا۔

میں صوبۂ سرحد کے ان مقامات کو جن کا تعلق تحریک مجاہدین سے تھا دیکھنا بھی چاہتا تھا اور ضروری مقامات کی تصویر اور نقشہ بھی لینا چاہتا تھا، اس کے لیے ارشد صاحب نے ایک نقشہ نویس (Draftsman) کو بھی ہمارے ساتھ کر دیا تھا، میں نے اس سفر میں ہنڈ، مانیرئی، پنجتار اور بالاکوٹ (مشہد مجاہدین) کی زیارت کی اور ضروری تصویریں بھی لیں، بالاکوٹ میں ہم لوگوں کا قیام سرکاری گیسٹ ہاؤس میں رہا، جس کے لیے ارشد صاحب نے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔

اگلے ہی سال ارشد صاحب نے اپنی انجمن کی طرف سے پھر جلسۂ سیرت کے

---

(۱) قرآن شریف کی آیت کی طرف اشارہ ہے، جس میں ایک نبی کی زبان سے کہا گیا ہے: "أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ" (سورۂ ہود-۷۸) کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ پشاور اور صوبۂ سرحد کی اس پچھلی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے جس کا تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک جہاد و اصلاح و قیام حکومت اسلامیہ علی منہاج الخلافۃ سے تھا، اور اس سلسلے میں اہل سرحد نے جو کردار ادا کیا تھا، یہ جملہ بڑا بامعنی و برمحل تھا، ''ارشد'' رشید کے مقابلے میں اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی زیادہ معقول آدمی اور بڑھا ہوا صاحب رشد و ہدایت ہے۔

(۲) جاپان میں اسلام کا تعارف و تبلیغ اور اس کے اثر و قبولیت اور جاپانیوں کے قبول اسلام کی تفصیل ''سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ'' تالیف مولوی سید محمد ثانی حسنیؒ کے گیارہویں باب میں دیکھی جائے جس میں ارشد صاحب کے طویل خطوط کا ایک طویل اقتباس درج ہے، ملاحظہ ہو، ص: ۵۲۹ تا ۵۴۰

www.abulhasanalinadwi.org

لیے دعوت دی اور میں نے عزیزی محمد رابع سلمہٗ، اور حاجی نور الٰہی صاحب پشاوری کی معیت میں بالاکوٹ حاضری دی، پشاور کے قیام میں حاجی ارشد صاحب کے مکان پر قیام رہا اور انھوں نے اور ان کے گھر والوں نے ایسی پذیرائی کی اور ایسے تعلق ومحبت کا اظہار کیا، جو قریب ترین عزیزوں اور مخلص احباب کا مہمان بننے میں بھی شاذ ونادر دیکھنے میں آیا ہے، ان کا یہ تعلق برابر بڑھتا گیا، وہ ہمارے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت بھی ہوگئے، اور حضرت کے قیام لاہور کے دوران جو تقریباً ہر سال طویل مدت کے لیے ہوا کرتا تھا، انھوں نے برابر حاضری دی اور استفادہ کیا، پر جب وہ آٹومیٹک ٹیلی فون کی اسکیم کے نگراں اور افسر کی حیثیت سے حجاز منتقل ہوگئے تو جدہ میں ان کا اپنا ہی گھر تھا، ۱۹۶۹ء میں جب حجاز حاضری ہوئی تو جدہ میں انھیں کے گھر میں سعودی ریڈیو کی فرمائش پر "وفود الأمة بين يدي نبيّها" (امت کے وفود آقا کے حضور میں) کے عنوان سے میں نے ایک تقریر تیار کی، یہ ایک ولولہ انگیز اور ایمان افروز مضمون تھا جس کو سعودی ریڈیو اور خود لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن نے کئی بار نشر کیا۔

"حاجی ارشد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغی دینی دعوت سے اتنا زیادہ تعلق دیا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتے اس دینی دعوت کی داغ بیل ڈال دیتے اور جی جان سے اس کام کو کرتے، اور اپنے جذب وکیف اور درد وسوز سے بہت سے رفیق بنا لیتے، اور یہی درد وسوز ان رفیقوں میں پیدا کر دیتے، حاجی ارشد صاحب نے کلکتہ پہنچ کر اس دینی دعوت کو وہاں کے اہلِ علم واہلِ درد کے سامنے کیا اور بہت جلد لوگوں نے اس کو اپنا لیا اور کام شروع کر دیا، ان کام کرنے والوں میں رضوی برادران خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اس کام کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا، ان سب کی یہ خواہش تھی کہ مولانا محمد یوسف صاحب کلکتہ تشریف لائیں، تاکہ کلکتہ کے لوگ مولانا کا ولولہ انگیز خطاب سنیں، اور آپ کی صحبت سے مستفید ہوں، مولانا رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ کلکتہ تشریف لے گئے، اور آپ کے

www.abulhasanalinadwi.org

تشریف لے جانے سے کلکتہ میں تبلیغی فضا قائم ہوگئی“۔(۱)

جہاں تک جاپان کا تعلق ہے، اس میں ارشد صاحب کے تشریف بری سے ایک انقلابی، دعوتی و تبلیغی فضا پیدا ہوگئی، جو توقع وقیاس سے ماوراء وبالاتر تھی، اور محیّر العقول طریقے پر وہاں کے تعلیم یافتہ اور وہاں کے قدیم مذہب سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا، یہ لکھنا کچھ مبالغہ آمیز نہیں کہ ”آج جاپان میں اسلام کے نام لیوا جتنے بھی رہتے بستے ہیں، اور خدمتِ دین کا کام کرتے ہیں، ان میں سے اکثر ارشد صاحب کی محنت کا نتیجہ ہیں“ قیام جاپان اور اس کی محیر العقول کامیابی اور دعوتی فتوحات کی تفصیل ارشد صاحب کے اس خط میں دیکھی جائے جو پوری تفصیل کے ساتھ ”سوانح حضرت مولانا محمد یوسفؒ“ میں ص ۵۲۹ سے ۵۴۰ تک پھیلا ہوا ہے، جس میں ہر طبقے کے ممتاز جاپانیوں کے قبول اسلام اور گہرے تاثر کا تذکرہ تفصیل سے آیا ہے۔

اس مضمون کا اختتام جس میں حاجی ارشد صاحب مرحوم کی شہیدانہ وفات کا بھی تذکرہ ہے ”سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب“ سے نقل کیا جاتا ہے، جس میں مصنف ”پرانے چراغ“ کا قلم بھی شریک ہے۔

”حاجی ارشد صاحبؒ جو پہلے اے آر ارشد کے نام سے معروف تھے، ان خوش نصیب افراد میں سے ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظرِ عنایت ہوئی، اور باوجود اپنی خالص مغربی تعلیم اور اعلیٰ ملازمت کے، اپنے اخلاص وللّٰہیت، دینی انہماک وخود فراموشی اور مجاہدہ وایثار کے ذریعے، اعلیٰ دینی ترقیات وکمالات کو پہنچے اور پھر اسی راہ میں شہید ہوکر جنت المعلیٰ میں اکابر اولیاء اللہ کے پاس جگہ پائی، وہ پشاور کے رہنے والے تھے، اصل نام عبدالرشید تھا، ارشد کو تخلص کے طور پر اختیار کیا تھا، جو ان کا نام بن گیا، تقسیم سے پہلے پشاور کلکتہ اور بمبئی میں ٹیلی فون کے محکمے میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے، تقسیم کے بعد عرصے تک

---

(۲) ”سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی“ از مولوی محمد ثانی حسنی مرحوم صفحہ ۲۶۵۔

www.abulhasanalinadwi.org

لاہور میں ٹیلی گراف کے ڈویزنل انجینئر رہے، پشاور کی ملازمت کے زمانے میں دعوت وتبلیغ سے تعارف ہوا اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنے تعارفی خط میں ان کے متعلق لکھا تھا کہ "یہ صوبہ سرحد کے رجل رشید نہیں بلکہ ارشد ہیں" مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی نظر میں ان کو بھانپ لیا اور ان کے متعلق بڑی خصوصیت کے کلمات فرمائے، پاکستان سے وہ محکمہ جاتی مشن پر جاپان گئے اور وہاں تقریباً دوڈھائی سال رہے، اس عرصے میں ان کے ہاتھ پر بڑی تعداد میں جاپانی مسلمان ہوئے اور ان کی مقبولیت وتاثیر اور تائید الٰہی کے عجیب واقعات پیش آئے، اگر ان کا قیام رہ جاتا تو شاید قبول اسلام کا سلسلہ بہت وسیع اور طویل ہوجاتا، لیکن کام ختم ہونے پر ان کو بلالیا گیا، کچھ عرصے بعد تبلیغی جماعت میں امریکہ گئے، وہاں بھی ان سے بڑا فائدہ پہنچا، جب حکومت سعودیہ نے آٹومیٹک ٹیلی فون کی اسکیم منظور کی تو اس کے انچارج اور افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا، انھوں نے زور شور سے حجاز میں تبلیغی کام شروع کیا، ان سے اس کام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، ۱۴ رشعبان ۱۳۸۳ھ کو مدینہ طیبہ سے خاص کیفیت کے ساتھ مواجہ شریف سے رخصت ہوکر پندرہویں کا روزہ رکھ کر ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ جس میں بعض وہ پاکستانی افسران بھی تھے، جنھوں نے یورپ سے واپسی پر عمرہ کی نیت کی تھی، روانہ ہوئے، جدہ پہنچنے سے پہلے راستے میں موٹر کا حادثہ پیش آیا، جس میں وہ روزہ اور احرام کی حالت میں جاں بحق ہوئے، حرم شریف میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ نماز ہوئی، پھر اس گنج ایمانی کو جنت المعلیٰ میں شیخ العرب والعجم حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ کے پہلو میں دفن کردیا گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ (۱)۔

❑❑❑

---

(۱) "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف" از مولانا محمد ثانی مرحوم حاشیہ صفحہ ۲۵۲-۲۵۴۔

www.abulhasanalinadwi.org

پروفیسر محمد سمیع صدیقیؒ

دنیا میں پرخلوص، بے غرض زندگی کی جو قدر و قیمت ہے اور زندگی میں جو معنویت ہے اور تھوڑی سی لذت اور کیف ہے، وہ انھیں تعلقات و جذبات کی بنا پر ہے، یہ جذبات واحساسات ختم ہوجائیں تو دنیا کاروبار کی ایک منڈی بن کر رہ جائے اور الحمد للہ یہ جذبہ بڑا پاکیزہ ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو بھی پسند ہے "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" میں اسی کی طرف اشارہ ہے پھر "اذکروا محاسن موتاکم" اس میں بھی اسی کی ترغیب ہے کہ دنیا سے جانے والوں کے محاسن کا تذکرہ کرو، اب اس وقت موجودہ نسل میں ندوے کے فارغین اور منتسبین میں چند ہی آدمی ہوں گے جن کا اتنا طویل تعلق اور رفاقت ہوگی جس میں ہمارے مہتمم جناب مولانا محبّ اللہ ندوی صاحب بھی ہیں اور اس وقت جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ان میں اب ہم ہی لوگ سینئر ہیں، اس کے علاوہ ایک محرک اور بھی ہے، وہ یہ کہ دنیا میں ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو بہت عالی مرتبہ اور علمی دینی، روحانی یا سیاسی اور مادی حیثیت سے بہت شہرۂ آفاق ہوتی ہیں اور جن کی عظمت تسلیم کی جاتی ہے اور مشہور ہوتی ہے، عام طور پر انھیں کی زندگیوں کا تذکرہ کرنے کا رواج ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نفسیات کے ایک بہت حقیر طالب علم کی حیثیت سے اور شخصیات کے ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے اس میں تواضع سے کام نہیں لیتا، اور شخصیات کے اچھے طالب علم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میرے گھر میں اس عہد کی طویل ترین اور مکمل ترین شخصیات کا............تذکرہ لکھا گیا اور بچپن سے میرے لیے سب سے زیادہ جو مانوس موضوع اور بیماری میں بھی جس پر میں کتابیں پڑھ سکتا ہوں وہ شخصیات کا موضوع ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

میرا تجربہ اور مطالعہ یہ ہے کہ بہت بڑی شخصیتیں جن کو ساری دنیا مانتی ہو اور تمام دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہو، جن کا طوطی بول رہا ہو، ان کا تعارف کرانے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تو بہت مافوق الفطرت یا غیر معمولی قسم کی شخصیت ہے، ہم اس کی تقلید نہیں کر سکتے فائدہ ضرور ہے اور میں خود یہ کام کرتا آ رہا ہوں، لیکن اس میں عام طور پر آدمی اپنے ذہن میں ایک عذر تلاش کر لیتا ہے کہ یہ تو ماورائے عمل اور ماورائے تقلید ہیں، بلکہ ان شخصیتوں کا تعارف کرانا ان کی شخصیت کے عملی پہلوؤں، قابلِ تقلید پہلوؤں، قابلِ رشک پہلوؤں کو نمایاں کرنا مفید ہوتا ہے جو چاہے ہم سے بلند ہوں، لیکن عام انسانی سطح کے لوگ ہوں اور جنھوں نے مخالف ماحول میں اور ناسازگار حالات میں اپنے کردار کی خصوصیات اور اپنا دین سے تعلق قائم رکھا ہو، ان کا تذکرہ کرنا بہت مفید ہوتا ہے اور مہمیز کا کام دیتا ہے، اور ایسے ماحول میں بھی آدمی دین کو قائم، اپنے کردار کو باقی رکھ سکتا ہے، استقامت کا ثبوت دے سکتا اور دوسروں کو فیض پہنچا سکتا ہے اور اس کی زندگی خدمتِ خلق کا نمونہ ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا صرف مادیت پر قائم ہے، یہ لوگوں کی بھول ہے، یہ دنیا مادیت پر ضرور قائم ہے لیکن شرافت پر بھی قائم ہے، جس دن اس دنیا سے شرافت ختم ہوئی، اس دن دنیا کی روح نکل جائے گی اور پھر یہ دنیا کاٹنے کو دوڑے گی، آدمی کا گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا، یہ تھوڑی بچی کھچی روایت جو قائم ہے کہ آدمی کسی کو بڑا مانتا ہے، کسی کا احسان مانتا ہے، کسی سے بے غرض محبت کرتا ہے، اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے، یہ وہ چیز ہے کہ جب یہ دنیا سے لے لی جائے تو پھر دنیا میں دم گھٹنے لگے، جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکالنے سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، ہمارا آپ کا دم گھٹنے لگے گا، اگر یہ تعلقات کا رشتہ نہ ہو اور تعلقات کا اثر قلب و دماغ پر نہ ہو تو پھر دنیا میں جی نہیں لگ سکتا، پھر تو یہ خالی دوکان ہے اور دوکان بھی کیا بلکہ یہ ایک قمار خانہ ہے کسی کی ہار کسی کی جیت۔ اور یہ اس کا بھی تقاضا ہے کہ ہماری اور ان کی رفاقت بے لوث اور پر خلوص طریقے پر رہی اور میں شہادت دیتا ہوں کہ

www.abulhasanalinadwi.org

ماسٹر صاحب نے آج تک اپنی ذاتی غرض کے لیے مجھے یاد نہیں کہ کچھ کہا ہو، اور اس کے برخلاف میں نے ان سے فائدہ اٹھایا، بڑھا، ہر وقت وہ فائدہ پہنچانے کے لیے تیار رہتے تھے اور ہمارا جن چند آدمیوں سے عزیزوں کی طرح تعلق تھا ان میں ایک ماسٹر صاحب بھی تھے۔

سفر امریکہ میں کچھ دن قیام ماسٹر صاحب کے فرزند ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کے یہاں کرنا پڑا جن کے مکان کا نام ندوہ ہے جو ندوہ سے تعلق کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس کو میں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ندوہ-نیویارک امریکہ لکھا ہے، اس وقفہ میں ماسٹر صاحب کی آمد کا علم ہوا تو مجھے اور عزیزی محمد رابع ندوی جو اس وقت میرے رفیق تھے کو ایسی خوشی ہوئی کہ جیسے اپنے خاندان کے ایک بہت ہی قریبی بزرگ اور عزیز کا انتظار ہوتا ہے۔

یہ وہ محرک ہے جو مجھ سے تکلفاً نہیں جذباتی طور پر کہلوانا چاہتا ہے کہ بھائی یہ چیز دنیا سے بہت تیزی کے ساتھ گھٹ رہی ہے کہ بے لوث محبت ہو اور جو تعلق پہلے سے قائم ہو گیا وہ اخیر تک رہے، یہ واقعات ہمارے معاشرے کے بہت چیدہ اور برگزیدہ افراد کے حالات میں آپ کو ملیں گے، یہ چیزیں میں نے ماسٹر صاحب میں دیکھی اور ان کے صاحبزادوں کے ماموں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب میں دیکھی، اور ایسے ہی اس عہد کے اور کئی وضعدار لوگوں میں۔

اس کا تقاضا ہے کہ میں اس وقت ان کا ذکر کر رہا ہوں اس طریقے سے کہ میرا دل ودماغ شریک ہے، اس میں کوئی تکلف اور کوئی بناوٹ کی بات نہیں، انھوں نے اس تعلق کو نباہا اور ایسا نباہا کہ یہاں کی زمین جو پکڑی یہاں سے-مرکر جو اٹھنا کہتے ہیں- مرکر اٹھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی روح نے قفسِ عنصری سے اسپتال میں پرواز کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا سفر انھوں نے یہاں سے اختیار کیا، یہ تو اضطراری اور وقتی بات تھی، انھوں نے جو در پکڑا اسے چھوڑا نہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمارے لیے اور آپ کے لیے قابلِ تقلید ہیں۔

دوسرا محرک جس کے لیے میں نے کہا کہ بڑے ممتاز اور بہت برگزیدہ شخصیتوں کا انتخاب درست نہیں ہے، بلکہ ان شخصیتوں کا بھی جن کو ان کے حلقۂ احباب کے علاوہ

www.abulhasanalinadwi.org

باہر کے لوگوں نے کم جانا، بعض وقت ان کی زندگی کے پہلو بہت زیادہ قابل رشک اور قابل تقلید ہوتے ہیں، ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ماسٹر صاحب کی ساری تعلیم وتربیت جدید تھی، انھوں نے تعلیم کے لیے یورپ کا سفر نہیں کیا تھا، مگراس کے علاوہ ان میں کوئی کمی نہیں تھی انگریزی زبان پر ان کو ایسی قدرت تھی کہ اس میں شاعری کرتے تھے، حالانکہ انگریزی زبان کا شعر پڑھ دینا بہت مشکل ہے لیکن وہ اس میں شعر کہتے تھے اور بڑی روانی کے ساتھ اس میں شاعری کرتے تھے، پھر ان کی انگریزی اس میں جتنا ہم لوگوں کو علم ہے اور دوسروں سے بھی سنا ہے کہ بہت ممتاز تھے اور اصول تعلیم کے جو مروجہ معیار تھے وہ ان کو حاصل تھے مگر ان سب کے باوجود چیز ہمارے آپ کے لیے قابل تقلید ہے وہ یہ کہ ان کی دینداری میں فرائض کی پابندی میں، تشرع اور خداترسی میں اور خوش اخلاقی میں کوئی فرق نہیں آیا، ورنہ ہم نے تو ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ آٹھ آٹھ نو نو دس دس برس انھوں نے کسی اچھے دینی معیاری مدرسے میں پڑھا اور تھوڑے دنوں کے لیے کسی کالج میں گئے اور اس طرح بدلے کہ صورۃً وسیرۃً ان کو پہچاننا مشکل ہوگیا، اسی ماحول کے رنگ میں رنگ گئے، لیکن جو زیادہ فکر کی بات ہے وہ یہ ہے کہ ان کے عقائد تک میں فرق پڑ گیا اور فرائض بھی ترک ہونے لگے۔

واقعہ یہ ہے کہ ماسٹر صاحب کی ساری تعلیم انگریزی تھی، اس دارالعلوم میں ۲۴-۲۵ ء سے رہے، اس سے پہلے تو بہرحال وہ اس ماحول میں تھے لیکن جب سے ہم نے دیکھا اور یہاں کے دیکھنے والے سینکڑوں افراد ہوں گے کہ ماسٹر صاحب حتی الامکان صف اول میں اول وقت آجاتے اور تکبیر تحریمہ پاتے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے، ہمارے کتنے عربی مدارس کے فضلاء ہیں جن کو یہ بات نصیب نہیں ہے، یہ وہ چیز ہے جس کو اقبال نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے، خدا شاہد ہے کہ میں آتش نمرود میں داخل ہوا اور ابراہیم کی طرح بے داغ نکل آیا، اور جال کے اندر گیا اور دانا لے کر اڑ گیا اور جال میں پھنسا نہیں، مغربی تعلیم کے جال میں پھنسا نہیں، تو یہ بہت بڑی قابلِ رشک اور میں اس کو ایک درجے

کی ولایت سمجھتا ہوں یعنی ماحول کی مخالفت کے باوجود کوئی آدمی دین پر قائم رہے، جما رہے اور دین کے فرائض کے ادا کرنے سے شرمائے نہیں یہ اس زمانے کے لحاظ سے ولایت سے کم نہیں ہے، یہ تو بہت آسان ہے کہ ایک آدمی خالص دینی اور روحانی ماحول میں رہے اور وہ نماز کا پابند ہو، کیسی بھلی نماز پڑھتا ہے تو کوئی بڑے کمال کی بات نہیں ہے، یہ؟ اور انگریزی کا عالم اگر فرائض ادا کرتا ہے، دین کے شعائر قائم رکھتا ہے تو یہ اس کے لیے آزمائش کی بات ہے کہ اس نے کس انگریزی ماحول میں نماز چھوڑ دی ہو، تو ماسٹر صاحب کی جو چیز سب سے قابل رشک ہے وہ اب اللہ تعالیٰ کے یہاں کام آ رہی ہوگی، وہ یہ کہ اس تعلیم کا ان کے عقائد پر، ان کے اعمال واخلاق پر، ان کی سیرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ماسٹر صاحب کی زندگی بہت قابل رشک تھی جو سیدھی سادی ایک متوسط الحال آدمی کی طرح انھوں نے پوری گزار دی، کسی کو خبر نہیں کہ ان کے بیٹے کون ہیں؟ کیا کیا پڑھا ہے؟ کہاں رہتے ہیں کوئی اظہار مظاہرہ کرتے! اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی جماعت کے ساتھ یہ تو خود ایک ولایت کی دلیل ہے۔

ماسٹر صاحب ندوہ کی مسجد کے عقب میں رہتے تھے، اس نعمت کا شکر کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد کا پڑوس عطا فرمایا ہے کہ گویا مسجد کے سایے میں گھر بنایا ہے، خدا کا شکر ہے کہ ہمسایۂ خدا ہوں، شعر ہے غالب کا: یہ ہمسایہ خدا ہوتا ہے، مسجد کے زیر سایہ جو رہتا ہے گویا ہمسایۂ خدا ہے۔

ماسٹر صاحب مصنف بھی تھے اور برجستہ انگریزی میں گفتگو کر لیتے تھے اور بارہا ندوے کا تعارف انھوں نے اسی زبان میں کرایا، وہ فنِ تعلیم اور اصولِ تعلیم کے ایک مبصر اور ایک استاد بھی تھے، یہ ہمارے اور آپ کے سیکھنے کی چیز ہے، اور اس میں دو باتیں مجھے آپ سے کہنی ہے: ایک تو یہ کہ دیکھئے قرآن مجید میں ہم کو یہ تعلیم دی گئی ہے "وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ، وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ". یہ برسبیل حکایت ہے، لیکن حقیقت میں

www.abulhasanalinadwi.org

برسبیل ہدایت ہے، اپنے پیش رووں کے لیے، اپنے بڑوں کے لیے دعا کرنا یہ ایمان کی علامت ہے اور مومنین کی صفت ہے۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندویؒ

جون ۱۹۲۶ء کی کوئی ابتدائی تاریخ تھی، راقم سطور اس زمانے میں اپنے مربی ومحسن استاد شیخ خلیل بن محمد عرب یمانی بھوپالی سے پڑھنے کے لیے بھوپال ہاؤس واقع گھسیاری منڈی لکھنؤ سے (جہاں وہ اپنے برادر اکبر اور سرپرست مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے زیر سایہ اور زیر تربیت مقیم تھا) آیا کرتا تھا، دو وجیہہ، شریف صورت اور خوش لباس نوجوان جن کی عمر اس وقت ۱۳-۱۴ سال کے قریب معلوم ہوتی تھی، عرب صاحب کے مکان واقع بازار جھاؤلال میں جو امین آباد لکھنؤ کی ایک گلی میں واقع ہے اور اب محمد علی لین کا پتھر وہاں لگا ہوا ہے، داخل ہوئے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحبزادے بھوپال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں، اُن کے والد حافظ محمد الیاس خاں صاحب بھوپال میں مہتمم مساجد و وظائف ہیں، اور اُن کا وہاں کے محکمۂ اوقاف سے تعلق ہے، بھوپال کے رشتے سے یہ دونوں مولانا خلیل عرب صاحب کے پاس آئے ہیں، ان میں سے بڑے کا نام محمد عمران خاں بتایا گیا، معلوم ہوا کہ یہ حافظ ہیں، دوسرے کا نام محمد عرفان خاں، بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا داخلہ دارالعلوم کے عربی دوم میں ہوا۔

راقم اس زمانے میں جیسا کہ کہا گیا اپنے بھائی صاحب کے ساتھ جو میڈیکل کالج لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ابھی ان کی پنج سالہ تعلیم کا آخری سال باقی تھا، مقیم تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء جو وہاں سے خاصے فاصلے پر بادشاہ باغ میں واقع ہے، کبھی کبھی اپنے ان عزیزوں سے ملنے کے لیے جو وہاں زیر تعلیم تھے جاتا تھا، وہاں مولانا عمران خاں صاحب کو کھیل کے اوقات میں دارالعلوم کی مرکزی عمارت کے سامنے کے میدان

www.abulhasanalinadwi.org

میں ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھا اور معلوم ہوا کہ ان کو اچھی مشق ہے، بعد میں غالباً کچھ عرصے کیپٹن بھی رہے، اس وقت اس محدود دید وشنید کے علاوہ نہ اتفاق ہوا نہ اس سے زیادہ مواقع تھے، اس وقت دارالعلوم کی ہاکی کی ٹیم بہت مضبوط اور ممتاز تھی، اور بعض بڑے تعلیمی اداروں اور ہاکی کی ٹیموں سے اس کا مقابلہ (میچ) بھی ہوتا تھا، اس سلسلے میں عمران خاں صاحب ہی کے کیپٹن شپ میں ندوہ کی ٹیم رائے بریلی بھی کسی ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے آئی اور اس نے فائنل جیتا، اس وقت ہمارے مسکن ومقام دائرہ شاہ علم اللہؒ میں (جو تکیہ کلاں کے نام سے مشہور ہے) اس کو اعزازی طور پر دعوت دی گئی اور پرانے تعلقات کی بنا پر اس کی خاطر مدارات کی گئی۔

مولانا سے راقم کا اصل ربط وتعلق وموانست اس وقت ہوئی جب وہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکیؒ کے حلقۂ درس میں باقاعدہ شامل وشریک ہوا، اس وقت ایک سال مولانا عمران خاں صاحب کی درس حدیث میں رفاقت حاصل ہوئی، مولانا حیدر حسن خاں صاحب کو علامہ حسین بن محسن انصاری یمانی سے حدیث میں شرف تلمذ حاصل تھا، جن کے درس اور خدمت وتعلیم حدیث کا مرکز بھوپال ہی تھا، اس لیے وہ بھوپال سے نہ صرف واقف ومانوس تھے، بلکہ اس سے ایک جذباتی اور قلبی تعلق بھی رکھتے تھے، اور غالباً اسی وجہ سے مولوی حافظ محمد عمران خاں پر خصوصی نظر شفقت تھی، راقم مولانا حیدر حسن خاں صاحب ہی کے ساتھ دارالعلوم کی بالائی منزل پر انھیں کے حجرے میں مقیم تھا، جو اُن کی قیام گاہ بھی تھی، اور دارالحدیث بھی تھا، اور وہاں مولوی حافظ محمد عمران خاں صاحب کا اکثر آنا اور بیٹھنا ہوتا تھا، اس عرصے میں وہ جمعیۃ الاصلاح (طلباء کی یونین) کے ناظم بھی رہے، اور اس کی تنظیم وترقی میں ان کا بڑا حصہ ہے، اس تعلیمی رفاقت کے زمانے میں ان کی فطری صلاحیتوں تنظیمی اور قیادتی مناسبت اور خوش اوقاتی کا بھی علم ہوا، اور یہ ایک غیر اختیاری اور من جانب اللہ بات تھی کہ رفقائے درس کی اچھی تعداد اور ان میں سے بہت سے رفقاء کی امتیازی خصوصیات کے باوجود مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب سے ایک

www.abulhasanalinadwi.org

خاص مناسبت اور موانست پیدا ہوگئی جو بحمد اللہ آخر وقت تک رہی۔

۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں مولانا مسعود علی صاحب ندوی (ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ) دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مسجد کی موجودہ عمارت کے بالکل متوازی ایک خس پوش حجرے میں مقیم تھے، وہ ندوۃ العلماء کے ایک فعّال، مبصّر اور باا ثر رکن بھی تھے، دار العلوم کے احاطے اور ماحول میں اس طویل قیام کی وجہ سے وہ دار العلوم کے اساتذہ، کارکنوں اور ان فضلاء سے بہت اچھی طرح واقف ہو گئے تھے، جو دار العلوم میں مقیم تھے، یا ان کی وہاں بکثرت آمد ورفت تھی، اسی زمانۂ قیام میں اُن کو بشدت اس کا احساس ہوا کہ دار العلوم کے مقاصد وخصوصیات کے تسلسل کے قائم رکھنے اور ان کو ترقی دینے کے لیے کچھ نئے تقرّرات اور اضافوں کی ضرورت ہے، اور انھیں کے الفاظ میں (جو انھوں نے ایک مرتبہ راقم سے زیر تعمیر مسجد کے (جس کی تکمیل ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ، ۱۹۳۲ء میں ہوئی) بالائی حصے پر بلا کر فرمایا) کہ دار العلوم کے اساتذہ بڑے قابلِ قدر اور مستحق احترام ہیں، لیکن دنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا، دار العلوم میں ایک ''سکنڈ لائن'' کی بھی ضرورت ہے، جو بوقت ضرورت ان کی جگہ لے سکے، اور دار العلوم کی خصوصیات ومقاصد کا سلسلہ جاری رکھے، اس سلسلے میں ان کی نظر تدریس کے لیے چند نوجوان اور جدید فضلاء پر پڑی جن میں مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی، مولوی مسعود عالم صاحب ندوی، مولوی محمد ناظم صاحب ندوی اور خاکسار راقم الحروف تھا، اور انتظام واہتمام اور دفتر کو مستعد وفعّال بنانے کے لیے مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب پر نظر پڑی، جن سے اُن کو مزاجی وانتظامی مناسبت بھی تھی، جہاں تک راقم اور بعض اساتذہ کے تقرر کا تعلق ہے اس کی نوبت ۱۹۳۴ء میں آئی، دفتر کے انصرام کے لیے ان کو مولانا عمران خاں صاحب سے زیادہ کوئی موزوں ندوی فاضل نظر نہیں آیا۔

اس زمانے میں دار العلوم کی مالی حالت بہت کمزور چل رہی تھی، کبھی کبھی تنخواہیں بھی ہر ماہ تقسیم نہیں ہو سکتی تھیں، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ناظم ندوۃ العلماء

www.abulhasanalinadwi.org

ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی رائے ہوئی کہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی سرپرستی اور قیادت میں چند اساتذہ مدراس کا سفر کریں جو ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بڑا تجارتی مرکز اور خاص طور پر چمڑے کی منڈی ہے، اس کا محرّک یہ بھی ہوا کہ چند دن پہلے مدراس کے مشہور تاجر چرم اور رئیس نواب سی عبدالحکیم شمالی ہند کی طرف آئے تھے، اور انھوں نے ندوہ بھی دیکھا تھا، اس کے علاوہ بھی وہاں سے کچھ تعلقات اور تعارف تھا، بہرحال اس غرض کے لیے ایک وفد تشکیل ہوا، جس کے سربراہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم تھے، اور ارکانِ وفد مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی اور یہ ناچیز تھا(۱)۔

یکم مئی ۱۹۴۳ء کو اس وفد کی مدراس کے لیے روانگی ہوئی، اس کی پہلی منزل بھوپال تھی، یہ بھی ایک تقدیری بات تھی کہ بھوپال کے اپنے خاندان کے ایک مرکز ہونے کے باوجود، اس سے پہلے وہاں کے لیے کبھی سفر کا اتفاق نہیں ہوا تھا، اس کے بعد بھی جب جانا ہوا (جیسا کہ آگے تذکرہ آئے گا) اس کے محرّک وداعی رفیق محترم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ہی ہوتے تھے، دوسری منزل ناگپور تھی، تیسری اور آخری منزل مدراس، جہاں توقع کے مطابق کامیابی نہیں ہوئی، اس سفر میں مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب کی انتظامی وقیادتی صلاحیتوں کا ایسا تجربہ ومعائنہ ہوا جو ایسے طویل ونازک سفر کے بغیر ہونا مشکل تھا، یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک خاندان کے چند افراد، ایک تجربہ کار منتظم، رہبر اور ذمہ دار کے ساتھ سفر کر رہے ہیں، اور ان پر انتظامات سفر اور ضروریات کی فراہمی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

جب مدراس کے سفر کا ذکر آ گیا تو یہ بھی کہتا چلوں کہ مولانا کی معیّت میں متعدد سفر ہوئے جن میں ایک کوروائی کا سفر بھی تھا، جو وہاں ایک تبلیغی تعلیم گاہ کے قیام کے مشورے کے سلسلے میں نواب صاحب کی دعوت پر کیا گیا تھا، اور اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے، اور متعدد دانشور اور اہل علم شریک ہوئے

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی حصہ اول" ص ۱۷۰-۱۷۳۔

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، ان سفروں میں یہی تجربہ ہوا کہ مولانا کے ساتھ سفر میں ایسی راحت ملتی ہے، جو سفر کو گویا قیام میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مولانا کے ساتھ ایک سفر بمبئی کا بھی ہوا جس کی تقریب یہ تھی کہ شاہ سعود بن عبدالعزیز ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے، اس وقت ان کا بمبئی میں قیام تھا، ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی تشریف لانے کی دعوت دینی تھی، راقم سطور، مولانا عمران خان صاحب اور غالباً مولانا اویس صاحب ندوی نگرامی ندوۃ العلماء کے ایک وفد کی حیثیت سے بمبئی گئے، اور شاہ سعود ابن عبدالعزیز سے ملاقات بھی کی اور ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں، کارکنوں کا سلام پہنچایا، لیکن لکھنؤ آمد کا کوئی پروگرام نہیں بن سکا۔

پھر ہم دونوں ان سے ملنے کے لیے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی دعوت واشارے پر جو اس وقت وزارت خارجہ میں تھے، بنارس گئے، وہاں ابھی پہنچے تھے، اور مدن پورہ میں قیام تھا کہ اچانک بنارس کے ڈپٹی کمشنر یا کسی اعلیٰ عہدیدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ لکھنؤ سے ناظم ندوۃ العلماء کا ٹیلیفون آیا ہے کہ ملک معظم کے عم محترم امیر مساعد ابن عبدالرحمٰن آل سعود، شاہ کے بجائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معائنے اور اس کے ذمہ داروں سے ملاقات کے لیے کل صبح ہی لکھنؤ پہنچ رہے ہیں، آپ دونوں کو فوراً لکھنؤ بلایا گیا ہے، آپ چاہیں تو کار سے سفر کا انتظام کر دیا جائے، یا اسی وقت (غالباً رات کے ۸ ربجے لکھنؤ جانے والے) ایکسپریس میں سفر کا انتظام کر دیا جائے، ہم لوگوں نے ٹرین کو ترجیح دی اور اس سے صبح ۱۸ ربیع الآخر ۱۳۷۵ھ کو لکھنؤ پہنچ گئے، امیر مساعد خود ایک ذی علم، صاحب مطالعہ امیر تھے، اور مکہ معظمہ میں ان کے دولت خانے پر راقم کو کئی بار ملاقات کرنے اور ان کی ان مجلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے، جن میں مکہ معظمہ کے متعدد ذی علم افراد اور امام حرم مکی شیخ عبدالرزاق حمزہ شریک ہوتے تھے، امیر مساعد کا دارالعلوم میں خیر مقدم کیا گیا، اور انہوں نے شکریہ کی جوابی تقریر بھی کی۔

دفتر کے انصرام اور ایک طرح کے ضمنی اہتمام کے زمانے میں ۱۹۴۷ء کے وسط

www.abulhasanalinadwi.org

میں مولانا کو قاہرہ جانے اور جامع ازہر سے استفادہ کے لیے ایک وظیفہ کی پیش کش ہوئی، جو غالباً صاحبزادہ جنرل عبید اللہ خاں صاحب کے وقف کی طرف سے تھا، ناچیز کی بھی رائے تھی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور یہ مولانا ہی کے لیے نہیں بلکہ ندوۃ العلماء کے حق میں بھی مفید اور معاون ہوگا، مولانا کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کے والد محترم (۱) کو اس بارہ میں قدرے تردّد ہے، مولانا کے ایما پر میں نے بھوپال کا سفر کیا اور حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں اس سفر کی افادیت اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی اہمیت کے بارے میں معروضات پیش کیں، جن سے اُن کو انشراح حاصل ہوا، اور انھوں نے اس کی اجازت دی، مولانا ۶ / اکتوبر ۱۹۳۷ء کو قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے، دو سال جامع ازہر کے کلیہ اصول الدین قسم الوعظ والارشاد کے شعبۂ تخصّص میں رہے، وہاں سے ناچیز کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا، افسوس ہے کہ وہ خطوط محفوظ نہیں رہے، ایک خط کا مضمون یاد آتا ہے، شاید میرے جوابات میں کچھ طویل وقفہ ہوا تھا، اس پر مولانا نے اپنے شکایتی خط میں عربی کا یہ شعر لکھا، جس سے ان کے خصوصی تعلق اور مناسبت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

ستقطع فی الدنیا اذا ما قطعتنی
یمینك فانظر أی کف تبدل

(تم نے اگر ہم سے قطع تعلق کر لیا تو گویا اپنے دستِ راست کو اپنے سے جدا کر دیا، اب سوچ لو کہ اس ہاتھ کا نعم البدل کہاں سے لاؤ گے؟)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دارالعلوم میں ان کے زمانۂ اہتمام اور راقم کے زمانہ

---

(۱) اس وقت حافظ صاحب مہتمم اوقاف تھے، ۱۹۴۰ء میں ان کو پنشن ہوئی، بیماری کے علاج کے لیے وہ اپنے صاحبزادے کے پاس لکھنؤ تشریف لائے اور برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کے زیر علاج رہے، وہ ڈاکٹر صاحب کے تقویٰ اور صلاح سے بہت متأثر تھے، وصیت فرمائی کہ انتقال کے بعد ڈاکٹر صاحب غسل میں بھی شرکت کریں اور نماز جنازہ بھی پڑھائیں، ۲ / دسمبر ۱۹۴۱ء کو وفات ہوئی، ڈاکٹر صاحب ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور لکھنؤ ہی میں ڈالی گنج کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے، غفر اللہ لہ.

www.abulhasanalinadwi.org

تدریس میں اتنا باہمی اعتماد وتعاون اور اشتراک عمل کم دو آدمیوں کے درمیان رہا ہے۔ وہ مصر سے امتیاز کے ساتھ کامیاب لوٹے اور ۱۰؍دسمبر ۱۹۳۹ء کو ان کی واپسی ہوئی، وہ کراچی سے پہلے دہلی پھر ندوہ آئے، پھر بھوپال گئے، واپسی پر ان کے اور مولوی سعد الدین ندوی مرحوم (برادر اصغر پروفیسر مولانا عبدالباری صاحب ندوی واستاد جامعہ ملیہ دہلی) کے استقبال وتکریم میں الاصلاح کے ہال میں جلسہ ہوا، جس میں راقم نے استقبالیہ اور خیر مقدمی تقریر کی، اور ان دونوں حضرات نے اپنے تاثرات ومشاہدات اور ملاحظات پیش کیے۔

مولانا کے قیام مصر کے زمانے میں شدّت سے اس کا احساس ہوتا تھا کہ وہ واپسی پر دار العلوم کے اہتمام کو چست ومؤثر بنائیں اور مولانا حیدر حسن خاں صاحب شیخ الحدیث ومہتمم دار العلوم کے معاون ودستِ راست بن جائیں کہ مولانا کو اپنی ضعیف العمری اور علمی مزاج وکتابی اشتغال کی وجہ سے ایک بیدار مغز، کارگزار اور مستعد نائب کی ضرورت ہے، اور مولانا عمران خاں صاحب سے زیادہ کوئی فاضلِ ندوہ اس کے لیے موزوں نہیں۔

تقدیر الٰہی سے ایسا ہی ہوا کہ معتمد تعلیم حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی طرف سے ان کو ۲۷؍جنوری ۱۹۴۰ء کو نیابتِ اہتمام کا عہدہ سپرد ہوا، پھر جب مولانا حیدر حسن خاں صاحب، خاص اسباب وضروریات کی بناء (۱) پر اپنے وطن ٹونک تشریف لے گئے تو سید صاحب نے یکم فروری ۱۹۴۱ء کو ان کو قائم مقام مہتمم کا عہدہ دیا، پھر ۲۶؍اپریل ۱۹۴۳ء کو ندوہ کی مجلس اعلیٰ کی طرف سے وہ مہتمم بنائے گئے اور اس منصب پر ۱۹۵۸ء تک قائم رہے، یہاں پر ادائے شہادت اور اظہار حقیقت کے طور پر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دور اہتمام، دار العلوم کے نظم وضبط، انضباط اوقات، طلبہ پر اثر اور نظم واطاعت، اور جس کو ایک مختصر اور اصطلاحی لفظ ڈسپلن (Discipline) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، نمایاں طور پر ممتاز اور کامیاب عہد تھا۔

اس عرصے میں ایک قابلِ ذکر ہی نہیں قابلِ فخر وشکر اور تاریخی ہی نہیں، تاریخ ساز

---

(۱) جن کی تفصیل "پرانے چراغ حصہ اول" کے اس مقالے میں آگئی ہے جو مولانا پر ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

واقعہ پیش آیا کہ راقم جنوری ۱۹۴۰ء کے بالکل آغاز میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں نظام الدین دہلی حاضر ہوا اور مولانا کی دعوت تبلیغ سے تعلق اور قلبی و ذہنی تاثر اور ارتباط پیدا ہوا، وہاں سے اس دعوت کے اثرات اور عزم و جذبہ کو لے کر لکھنؤ واپس ہوا، تو سب سے زیادہ اور سب سے پہلے مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس میں رفاقت و مشارکت فرمائی، وہ بذات خود بھی ان تبلیغی دوروں میں شریک ہوتے جو لکھنؤ کے جوار و مضافات میں کیے جاتے اور دہلی کے سفروں میں بھی اکثر رفاقت فرماتے، مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں بھی راقم کے ایک ممتاز رفیق و معاون اور تبلیغی کام کے مؤید اور معین کی حیثیت سے انھوں نے امتیاز حاصل کر لیا، اس زمانے میں لکھنؤ کا جمعرات کا تبلیغی اجتماع دار العلوم کی وسیع مسجد میں ہوتا تھا، جس میں بڑے روحانی اثرات اور برکات نظر آتے تھے، مولانا محمد عمران خاں صاحب اس سے خاص دلچسپی لیتے تھے، اور صبح کو اکثر خواص اور معزز مہمانوں کو دار العلوم کی بالائی منزل پر اپنے حجرے میں بڑے اہتمام سے چائے پلاتے تھے" کاروان زندگی" میں اس موضوع پر لکھتے ہوئے حسب ذیل عبارت آئی ہے جو نقل کی جاتی ہے:

> "میوات کے اہم دوروں اور سفروں میں اکثر مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی مہتمم دار العلوم رفاقت فرماتے، جس کی وجہ سے حضرت کو بھی ان سے ربط ہوا اور ان کو خود حضرت کی زیارت و صحبت اور اس دعوت و عمل سے بڑا نفع ہوا، جس کا نقطۂ ارتقاء یہ تھا کہ وہ بھوپال میں اس دینی جد و جہد کے داعی اول اور وہاں کے تبلیغی اجتماع کا سبب بنے جو ہندوستان کا سب سے بڑا تبلیغی اجتماع بن گیا ہے"۔(۱)

الحمد للہ کہ یہ اجتماع اب بھی سال بہ سال ہوتا ہے، اور عددی، اجتماعی، تربیتی واصلاحی اور اپنی فضا و اثرات کے لحاظ سے وہ ہندوستان کا سب سے بڑا اور مؤثر اجتماع ہے۔

---

(۱) "کاروان زندگی" حصہ اول، ص: ۲۸۸-۲۸۹

www.abulhasanalinadwi.org

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۸ء تک اُن کی توجہات، سرگرمیاں، اور انتظامی صلاحیتیں لکھنؤ اور بھوپال کے درمیان تقسیم رہیں۔

اللہ تعالیٰ کو مولانا سے ایک عظیم الشان بلکہ تاریخ ساز اور یادگارِ زمانہ کام لینا تھا، جو وہ غیر معمولی، باتوفیق اور مؤید من اللہ لوگوں سے لیتا ہے، وہ تاج المساجد کی تکمیل کا کام تھا(۱)، جس کے لیے کسی سلطنت یا کسی بڑے کثیر الوسائل ادارے کی توجہ کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے یہ کام سلطنت اور کثیر التعداد اور کثیر الوسائل افراد کی تنظیم کے بجائے ایک فردِ واحد سے لیا اور یہ مسجد ان کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اس کے لیے انھوں نے بیرونی ممالک کا سفر بھی کیا، اور اپنی صحت وذاتی مصالح کو نظر انداز کر کے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور اس کام کو پورا کر کے رہے، واقف حال لوگوں کے کہنے کے مطابق کام تو کروڑوں کا تھا، لیکن اللہ کے فضل سے ستر اسی لاکھ میں یہ کام ہوا، اس کے ساتھ مسجد میں دار العلوم تاج المساجد بھی قائم ہوا، جو ندوۃ العلماء کی ایک شاخ ہے، اور وہیں کا نصاب پڑھایا جاتا ہے، مولانا اور مولانا کے پورے خاندان نے اس کا التزام رکھا کہ وہاں کے فضلاء اور خود خاندان کے نونہال دار العلوم ندوۃ العلماء ہی سے اپنی تکمیل کریں، اور وہیں کا نصاب ونظام اپنے قائم کیے ہوئے اداروں میں جاری کریں۔

تاج المساجد کی تکمیل کے عظیم الشان کام اور اس سلسلے میں بھوپال کے قیام اور تبلیغی اجتماعات کی ذمہ داری وغیرہ کی بنا پر مولانا کو بھوپال میں طویل قیام اور نگرانی کی ضرورت تھی، اس کی صورت یہ نکالی گئی کہ مولانا اٹھارہ دن دار العلوم ندوۃ العلماء میں اور بارہ دن بھوپال میں قیام فرمائیں، سفر میں بھی کچھ وقت صرف ہوتا تھا، یہاں زمانے

(۱) یہ عظیم الشان مسجد شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی تعمیر اور یادگار ہے اور جو اپنی وسعت اور رقبہ میں شاید لاہور کی شاہی مسجد تعمیر کردہ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد ہندوستان کی سب سے وسیع اور عظیم مسجد تھی، لیکن بیگم صاحبہ کی وفات اور بعض حوادث وموانع کی وجہ سے اس کی تکمیل نہیں ہو سکی، اور وہ اس طرح آباد بھی نہیں کی جا سکی جیسے اتنی بڑی مسجد کا حق تھا، راقم نے اپنے بھوپال کے بعض دوروں میں بعض جانوروں کو بھی پھرتے دیکھا ہے، جب ریاستیں ۱۹۴۹ء میں ہندوستان کی حکومت وانتظام میں شامل کر لی گئیں تو یہ مسجد اور بھی کس مپرسی کی حالت میں پڑ گئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کے تغیر، تقسیمِ ملک اور نئے رجحانات ومحرکات کی بنا پر اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کو پورا وقت عنایت فرمائیں اور پورے نظام کو چلائیں، بعض ارکانِ انتظامی کے مشورے اور اصرار پر اضطرارا یہ تجویز راقم ہی کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں مجلس انتظامی میں پیش ہوئی، اس خیال کا جب بار بار اظہار کیا گیا تو بھوپال کے قیام کی شدید ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر اور اس بنا پر کہ وہاں پر مولانا کا کوئی بدل نہیں تھا، اور مولانا کے شیخ ومرشد حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھی تاج المساجد کی تکمیل اور بھوپال میں ان کی رہنمائی کے بڑے مؤید اور داعی تھے، مولانا نے ۲۲ر جنوری ۱۹۵۸ء کو دارالعلوم کے اہتمام سے استعفا پیش کردیا، جو ۱۹۶۰ء میں منظور ہوا۔

ماہ نومبر ۱۹۷۵ء کی ابتدائی تاریخوں میں ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی قیام گاہ خاتون منزل میں (مولانا کی سہولت کے پیش نظر) ۲۳ر مارچ ۱۹۷۵ء کو مولانا ہی کی صدارت میں ندوۃ العلماء کا جلسۂ انتظامی منعقد ہوا، راقم سطور کی تحریک پر یہ منظور کیا گیا کہ اجلاس کے انتظامات کی عملی ذمہ داری مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کے سپرد کی جائے، جو فضلائے ندوہ میں اپنی انتظامی صلاحیت، مستعدی اور بیدار مغزی میں امتیاز خاص رکھتے ہیں، اور بھوپال کا عظیم ترین تبلیغی اجتماع جو ہر سال منعقد ہوتا ہے، اس کا شاہد عدل ہے، پھر ان کو رفقاء کی ایک ایسی ٹیم کا تعاون، مستعدی اور تجربات کی طاقت بھی حاصل ہے، جو کم ذمہ داروں اور قائدین کو حاصل ہوتی ہے، یہ تجویز بالاتفاق منظور کی گئی۔

۲۵ر تا ۲۸ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱ر اکتوبر، ۱، ۲، ۳ر نومبر ۱۹۷۵ء کو شیخ الازہر الاستاذ الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی صدارت میں یہ عالمی اجلاس منعقد ہوا، جو بیرونی ممتاز ترین علماء، نمائندگانِ تنظیمات وتحریکاتِ اسلامی، ماہرینِ فن اور اہلِ بصیرت شرکاء مہمانوں کی کمیت وکیفیت دونوں حیثیتوں سے ایک عظیم ترین اجتماع تھا، جس کی نمائندوں کی آفاقیت، علمی امتیاز اور تعداد کے لحاظ سے ہندوستان کی نہ صرف قریبی تاریخ میں (بلکہ

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے علم و واقفیت کی حد تک طویل و وسیع تاریخ میں) مثال نہیں ملتی، اجلاس میں صرف ممالک عربیہ کے فاضل نمائندوں کی تعداد ۵۶ تھی، جو اس سے پہلے کسی سرکاری وغیر سرکاری تقریب میں دیکھنے میں نہیں آئی، ممالک عربیہ کے علاوہ یوگنڈا، روس، ایران، تھائی لینڈ، نیپال، مشرقی افریقہ اور بنگلہ دیش کے نمائندے اور وہاں سے آنے والے مہمان بھی تھے، اس اجلاس کی تاریخ سے جو ''روئیدادِ چمن'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کی نقشہ کشی کے لیے ایک اقتباس کا نقل کرنا کافی ہوگا۔

> ''اس تحتی برِّ اعظم کی تاریخ میں شاید پہلا واقعہ تھا، جب علم و فضل اور جمال و کمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی، تنہا جامعات اسلامیہ کے نمائندے، ان کے سربراہ اور ذمہ دار آج جس طرح شانہ بشانہ اور قطار اندر قطار یہاں نظر آرہے تھے، اور دل فریب منظر پیش کررہے تھے، وہ تاریخ کی ایک ایسی امانت ہے جس کو کوئی مؤرخ و وقائع نگار نظر انداز نہیں کرسکتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ڈائس نہیں عالم اسلام کا حسین و جمیل گلدستہ ہے، جس میں اس کے وسیع قلمرو سے ہر رنگ کے پھول اکٹھا کرکے بہت خوبصورتی و خوش ذوقی کے ساتھ سجا دیئے گئے ہیں''۔(۱)

ایسے وسیع اور عظیم اجلاس کا جس میں ایسے متنوع الاذواق اور متفاوت المراتب اشخاص، جماعتیں اور ادارے (ہندوستان کے ممتاز ترین علماء اور مدارس و اداروں کے سربراہوں کے علاوہ) اتنی بڑی تعداد میں شریک تھے، اور تین دن یہ اجلاس چلتا رہا، کامیابی کے ساتھ انتظام، میزبانی اور راحت رسانی اور حسبِ مراتب معاملہ واکرام کوئی آسان بات نہ تھی، لیکن مولانا عمران خاں صاحب کی خداداد انتظامی صلاحیت، وسیع تجربہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فرزندانہ اور ذمہ دارانہ قدیم و طویل تعلق نے اس نزاکت و دشواری اور آزمائش پر قابو پایا اور یہ اجلاس بڑے سکون، مسرّت و اطمینان، بلکہ تعریف

(۱) ''روئیدادِ چمن'' تالیف سید محمد الحسنی مرحوم، ص ۷۹-۸۰

www.abulhasanalinadwi.org

وتحسین کے ساتھ انجام کو پہنچا، ناظم ندوۃ العلماء (خاکسار راقم سطور) کے خطبۂ استقبالیہ کا اردو متن بھی ناظم اجلاس مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی نے پڑھا۔(۱)

مولانا کے ایک اور احسان اور کارنامے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو بڑی معنوی قدر و قیمت رکھتا ہے، وہ یہ کہ راقم سطور پہلی مرتبہ اور تقریباً ہر مرتبہ انہیں کی دعوت وتحریک اور تقاضے پر بھوپال گیا، اور ہمیشہ انہیں کا مہمان رہا، ان کا یہ احسان کبھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ وہی شیخِ وقت، مربی، حکیم و عارف، گلِ سرسبدِ خاندان مجددی حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق وتعارف اور ان سے استفادے کا ذریعہ بنے، جب سفر مدراس کے علاوہ دوبارہ بھوپال حاضری ہوئی تو انہیں کی معیت ورہنمائی میں حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی اور حضرت کو بھی ایسا انس اور تعلق پیدا ہوگیا جو کسی ایسے دور افتادہ اور دوسرے مشائخ سے تعلق رکھنے والے فرد سے کمتر پیدا ہوتا ہے، اس عاجز کا قیام تو مولانا کے مکان پر رہتا تھا، لیکن وہ بھوپال کے ہر مختصر و طویل قیام میں پابندی سے مجلس میں حاضری دیتا اور ارشادات وملفوظات سے استفادہ کرتا، وہیں یہ خیال ہوا کہ ان ملفوظات کو جو مضامین عالیہ اور نہ صرف سلوک وتربیت بلکہ زندگی کے حقائق اور بصائر پر مشتمل ہیں، اور ان میں تصوف کا لُبِّ لباب اور مُجدّدی نسبت وعلوم کا عطر آگیا ہے، قلمبند ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق دی کہ وہیں بھوپال میں اپنی قیام گاہ پر ان ملفوظات کو قلم بند کرنے کا اہتمام کیا اور وہ پہلے رسالہ ''الفرقان'' میں بالاقساط شائع ہوئے، جن پر حضرت کی بھی نظر پڑی، پھر ''صحبتے با اہل دل'' کے نام سے ان کا مجموعہ شائع ہوگیا، اور علمی و دینی حلقوں میں بہت وقعت اور قدر سے دیکھا گیا، اور ملک و بیرون ملک سے بھی تحسین وقدر دانی کے خطوط آئے، یہ توفیق اور خدمت بھی مولانا ہی کے نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی کہ وہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق وتعارف

---

(۱) راقم اپنے ضعف بصارت کی وجہ سے (جو ۱۹۷۷ء کے آنکھ کے اس آپریشن کے بعد جو امریکہ میں عمل میں آیا بفضلہٖ تعالیٰ زائل ہوا، اور وہ براہ راست پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا) خطبہ خود نہ پڑھ سکا تھا، اجلاس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''روئیداد چمن از سید محمد الحسنی یا'' ''کاروان زندگی'' حصہ دوم، ص ۱۷۱-۱۹۵)

www.abulhasanalinadwi.org

کا اعتماد و شفقت کے حصول کا ذریعہ بنے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے مولانا کی ایک اخلاقی بلندی کا ذکر بھی کر دیا جائے کہ ان کے اہتمام سے علاحدہ ہونے کے بعد مئی ۱۹۶۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک بڑی اسٹرائک ہوئی، جس میں تخریبی کارروائی کی بھی کوشش کی گئی اور اس سے تحفظ کے لیے پولیس کی بھی مدد لینی پڑی، اس کے بعد متصلاً مجلس انتظامی کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا نے شرکت فرمائی، راقم سطور پر اس واقعے کا ایسا اثر پڑا جو اس سے پہلے کسی عزیز قریب کی وفات اور کسی بڑے حادثہ کا بھی شاید نہیں پڑا تھا، اس لیے کہ یہ واقعہ اس کی نظامت کے دور میں پیش آیا تھا، مولانا نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھے بھوپال چلنے کی دعوت دی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے، تاکہ ماحول کی تبدیلی سے غم ہلکا ہو اور طبیعت کو سکون حاصل ہو، حیرت اور عبرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ بھی یہ نہیں کہا کہ آپ نے میری علاحدگی اور اہتمام کے دوسروں کے حوالگی کا نتیجہ دیکھ لیا، وہ مجھے برابر تسکین دیتے رہے، یہ کسی شخص کی عالی ظرفی اور شرافتِ نفس کا ایک قابلِ قدر اور نادر الوقوع واقعہ اور نمونہ ہے۔

آخر میں ان کا ایک بڑا کارنامہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر سیمینار کا انعقاد ہے، جو دار العلوم تاج المساجد بھوپال میں ۴ تا ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوا، اس سیمینار میں محترم عمرو موسیٰ سفیر عرب جمہوریہ مصر، متعینہ ہند بھی شریک تھے، اس سے بہتر سیمینار علامہ کی یادگار میں ہمارے علم میں کسی مقام پر نہیں ہوا، از راہِ محبت انہوں نے صدارت کے لیے اپنے اسی قدیم رفیق و محبّ کا انتخاب کیا، جلسے میں ممتاز اہل علم اور دانشور شریک ہوئے اور گراں قدر مقالات پڑھے گئے، سیمینار کی رپورٹ عزیزانِ گرامی ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی اور مولوی محمد حسان خاں ندوی کے قلم سے ''مطالعۂ سلیمانی'' کے نام سے ۵۷۰ صفحات میں شائع ہوئی، مولانا عمران خاں صاحب ندوی نے شدید ضعف و علالت کی حالت میں انتظامات کی نگرانی کی۔

۱۸؍ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو مولانا کی وفات ہوئی، مشہور ہے کہ سنہ پیدائش ۱۹۱۳ء تھا،

اور غالباً راقم نے بھی ان سے یہی سنا ہے، لیکن مولانا کے فرزند عزیز گرامی قدر مولوی حبیب ریحان خاں ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ مولانا کی پیدائش ۱۹۱۱ء ہے، لیکن اب تک ہر جگہ ۱۹۱۳ء ہی درج ہے، مولانا کی تدفین اپنے شیخ طریقت اور محبوب و محترم بزرگ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کے جوار میں جہاں گیر آباد میں ہوئی۔

رحمه الله تعالىٰ ورفع درجاته.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندویؒ

مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کی علالت کی خبر مسلسل مل رہی تھی، آخر میں معلوم ہوا کہ وہ اعظم گڑھ کے اسپتال میں داخل ہیں، اور ان کو آکسیجن دیا جارہا ہے، اس سے اندیشہ پیدا ہوگیا تھا، لیکن اتنی جلد ان کی مفارقت کا اندیشہ نہیں تھا، ۵/دسمبر کو صبح ۱۰-۱۱ بجے ٹیلیفون سے ان کی وفات کا علم ہوا اور قدیم رفیقانہ ومخلصانہ تعلق اور اُن کی یگانہ خصوصیات اور خوبیوں کی بنا پر دلی صدمہ ہوا، راقم کے اور ان کے ربط وتعلق کی مدت نصف صدی سے متجاوز ہے، وہ غالباً ۳۰-۱۹۳۱ء میں دارالعلوم میں آئے، تین چار سال آخری درجوں میں تعلیم پانے کے بعد جس میں درجہ کی اگرچہ رفاقت نہیں رہی مگر طبعی مناسبت اور مزاج وذوق کے اشتراک کی بنا پر بہت قرب ومؤانست رہی، یہ وہ دور ہے جب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی، مولانا محمد اویس صاحب ندوی ہم سب ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، اور دارالعلوم کی مجلسوں اور سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے، پھر جب ہم سب کے استاد امام عربیت اور فاضلِ یگانہ علامہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی صدر شعبۂ ادب عربی کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد ومُربی ہوئے، تو ان سے استفادہ کرنے والوں میں جو نوجوان پیش پیش تھے، ان میں مولانا ابواللیث صاحب بھی تھے، شیخ کو بھی ان سے آخر تک سرپرستانہ ومشفقانہ تعلق رہا اور وہ عراق اور مغرب منتقل ہونے کے بعد بھی ان کو نہیں بھولے، اس کے بعد جب ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم کے اساتذہ کی سلک سے منسلک ہوا تو مولانا ابواللیث صاحب کا بھی قریبی زمانے میں بحیثیت استاد کے تقرر رہا، اس سے ہم دونوں کا ربط وتعلق اور بڑھا، درمیان میں کچھ عرصے کے

www.abulhasanalinadwi.org

لیے اخبار "مدینہ" یا اس ادارہ سے نکلنے والے رسالہ کے سلسلۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے، لیکن جلد پھر دارالعلوم میں آگئے، وہ عربی رسالہ "الضیاء" کے خاص مضمون نگاروں میں تھے(۱)، اسی مناسبت اور ضرورت سے مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی تجویز وہدایت سے ان کا نام شیر محمد کی جگہ پر ابواللیث لکھا جانے لگا، اور پھر وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد مولانا اس نازک اور پرآشوب دور میں ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کے امیر منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے وہ سالہاسال رام پور میں جہاں اس کا صدر دفتر اور اس کے زیر اہتمام چلنے والی ایک تعلیم گاہ بھی تھی، مقیم رہے، لیکن ہمارا تعلق بدستور قائم رہا، میں رام پور جاتا تو انہیں کے پاس ٹھہرتا، وہ لکھنؤ اور رائے بریلی بھی آتے تھے، پھر مرکز دہلی منتقل ہو گیا، لیکن ہمارے روابط برابر قائم رہے، اور اس زمانے میں بھی ان کی دارالعلوم اور رائے بریلی آمد ورفت رہی، ہم دونوں جب جمع ہو جاتے تو پرانی باتیں، دارالعلوم کے بیتے ہوئے دن، ہلالی صاحب کا تذکرہ اور بچھڑے ہوئے دوستوں کی یاد تازہ ہوتی، وہ ندوہ کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے، اس سلسلے میں بھی ان کا آنا جانا ہوتا تھا، مجلس مشاورت کے صوبائی دوروں میں بھی اکثر ان کا ساتھ رہا، اور مناسبت خاص کی وجہ سے راقم، وہ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم ساتھ ٹھہرتے اور اکثر یکجا رہتے، آخر میں بڑی خواہش تھی کہ وہ کچھ دن آرام کرنے اور دوستوں سے ملنے کے لیے دارالعلوم میں آئیں اور قیام کریں، مگر ان کی علالت اور کمزوری کی وجہ سے یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اور انہوں نے اس دنیا سے سفر آخرت اختیار کیا، جس دن ان کی وفات کی اطلاع ملی اسی دن بعد نماز عصر راقم کی صدارت میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں مولوی عبدالنور صاحب ندوی استاد دارالعلوم اور مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی استاد دارالعلوم و مدیر "البعث الاسلامی" نے تقریریں کیں۔

---

(۱) علامہ تقی الدین ہلالی کی سرپرستی میں اور ان کے مقدمہ کے ساتھ دارالعلوم کے ممتاز طلباء کے ممتاز مضامین کا ایک مجموعہ "الباکورۃ الجنیة لطلبة دار العلوم الندوية" کے نام سے شائع ہوا، جس میں مولانا ابواللیث صاحب کے مضمون العضو الأشل کے عنوان سے شامل ہے، جس کے لکھنے والے کا نام شیر محمد المکنّی بأبی اللیث درج ہے، اور تاریخ ۲۰ راگست ۱۹۳۱ء

میں نے اپنی تقریر میں تین باتوں کی طرف خاص اشارہ کیا، ایک ان کی اس خصوصیت کی طرف کہ ایک عظیم ومؤقر جماعت کے امیر ہونے کے باوجود ان کی سادگی، تواضع اور عالمانہ ومدرسانہ طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ اپنے قدیم دوستوں سے اسی بے تکلفی اور اخلاص سے ملتے تھے، جیسے اپنے زمانۂ طالب علمی اور تدریس میں ملتے تھے، مشائخ وعلماء سے بھی ان کے روابط قائم رہے۔(۱)

دوسرے یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جماعت اسلامی جیسی جماعت کی ذمہ داری سنبھالنا جس کے خاص سیاسی نظریات بھی تھے، کانٹوں بھرا تاج سر پر رکھنا یا ہتھیلی میں انگارہ رکھنے کے مرادف تھا، لیکن انھوں نے اس نازک منصب کو صبر واستقامت (۲) اور حکمت وفراست سے نبھایا۔ تیسری اہم بات یہ کہی کہ ہندوستان میں چونکہ جماعت کی قیادت ایک مستند عالم اور خالص دینی وعلمی حلقے کے پروردہ اور ساختہ پرداختہ فرد کے ہاتھ میں تھی، اس لیے اس نے پاکستان کی جماعت اسلامی کی قیادت کے مقابلے میں جو مولانا سید ابوالاعلی مودودی مرحوم کی وفات کے بعد ان افراد کو منتقل ہوئی جو (اپنی دوسری خوبیوں کے باوجود) مکمل عالمِ دین اور خالص علمی ودینی ماحول کے تربیت یافتہ نہیں تھے، زیادہ توازن، اعتدال، دینی پہلو کی رعایت اور علماء ومراکزِ دین سے تعلق اور ان کے احترام کا ثبوت دیا اور وہ ان بعض غلطیوں اور بے اعتدالیوں سے محفوظ رہی جن کی پاکستان میں وہاں کے قدیم علماء اور دوسرا نقطۂ نظر رکھنے والوں کو جماعت سے شکایت ہے، جلسۂ تعزیت کے علاوہ مولانا کے لیے دعائے مغفرت، قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کا بھی اہتمام کیا گیا (۳)۔غفر اللہ له وتقبل حسناته وتجاوز عن سیئاته.

مولانا کا تذکرہ آگیا ہے تو دو لطیفے سناتا چلوں، ایک یہ کہ چند خصوصی احباب کے

---

(۱) جب مرشد محترم حضرت مولانا عبد القادر صاحبؒ رائے پوری کا رام پور تشریف لے جانا ہوتا اور وہاں چند دن قیام ہوتا تو مولانا بھی زیارت وملاقات کے لیے آتے، اسی طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خدمت میں بغرض زیارت وطلب دعا نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آتے اور حضرت شیخ خصوصی توجہ فرماتے اور کبھی مدینہ طیبہ کے کھجور وغیرہ کے تبرکات بھی عطا فرماتے اور مولانا تشکر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے۔

(۲) وہ غالباً تین مرتبہ جیل بھی گئے اور خاصی مدت انھوں نے جیل میں گزاری۔

(۳) مولانا کی وفات کے بعد بعض آثار وقرائن سے اُن کے ساتھ رحمت خداوندی اور قبولیت کے معاملہ کا اظہار ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

ساتھ مولانا کا بھی معمول تھا کہ اگر وہ قریب ہوتے تو عید کے دوسرے دن یا قریبی وقت میں رائے بریلی تشریف لاتے اور پرانی یاد تازہ کرتے، ۱۳۹۷ھ کی عید کا دوسرا دن تھا، اور غالباً ۱۶ ستمبر ۱۹۷۷ء کی تاریخ تھی، مجھ سے عید ملنے کے لیے مولانا ابواللیث صاحب ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم۔اے ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی آئے ہوئے تھے کہ اچانک معلوم ہوا کہ اندرا جی مجھ سے ملنے آرہی ہیں، مغرب کی نماز کے بعد کا وقت تھا کہ وہ ہماری قیام گاہ (دائرہ شاہ علم اللہ عرف تکیہ کلاں) پہنچ گئیں، میں نے ممتاز و مشہور حاضرین مجلس کا تعارف کرایا، جن میں پہلے مولانا ابواللیث صاحب تھے، جو ایمر جنسی کے زمانے میں جیل کاٹ کر آئے تھے، اندرا جی کے جانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ میں جب رائے بریلی شہر میں داخل ہوا تو لوگوں نے بتایا کہ آج اندرا جی (۱) رائے بریلی آرہی ہیں، میں نے کہا کہ ''یہ سوء اتفاق'' ہے، پھر معلوم ہوا کہ وہ آپ سے ملنے بھی جائیں گی تو میں نے کہا ''یہ اَسوَء اتفاق'' ہے۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ مولانا ایک مرتبہ مجھ سے ملنے رائے بریلی تشریف لائے ہوئے تھے، ان کا قیام عموماً مختصر رہتا تھا، میں اپنی قیام گاہ اور مہمان خانے کے بالائی حصہ پر تحریری و تصنیفی کام میں مشغول تھا کہ اچانک مولانا تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ ''میں آپ کو ایک خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں'' میں ڈرا کہ مولانا عالمِ اسلامی یا ملت اسلامیہ ہندیہ کے بارے میں کسی اندیشہ ناک واقعہ یا اس کے امکان سے اپنے وسیع علم و واقفیت کی بنا پر آگاہ کریں گے، میں نے ڈرتے ہوئے کہا کہ فرمایئے، کہنے لگے کہ میرا ارادہ کچھ زیادہ قیام کا ہو گیا ہے، آپ کو خبر دینے آیا ہوں، غالباً انہوں نے اس کتابی ذخیرہ کو دیکھ کر جو نیچے کی منزل میں مہیا تھا، اور جس سے میں اپنے تصنیفی و تالیفی کام میں مدد لیتا تھا، دیکھ کر مزید قیام کا ارادہ فرمایا، جس کی غالباً امارتی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کی بنا پر نوبت نہیں آئی۔

□□□

(۱) اس وقت اندرا جی پرائم منسٹری کے عہدہ پر نہیں تھیں، یہ ایمر جنسی کے خاتمہ اور جنرل الیکشن کے بعد کا زمانہ تھا، جس میں وہ منتخب نہیں ہو سکی تھیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محبّ اللہ صاحب لاری ندویؒ

رفیق قدیم اور محبّ مخلص و محترم مولانا محبّ اللہ صاحب لاری ندوی، ایم اے (علیگ) مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء عرصے سے علیل چلے آرہے تھے، لیکن اپنی علالت اور ضعف کے باوجود دارالعلوم کے اہتمام کا فرض منصبی مستعدی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کررہے تھے، شام کی مجلس میں جب مہمان خانے کے سامنے کرسیوں پر اس راقم کی اساتذۂ دارالعلوم کی ایک معتدبہ تعداد اور بعض عزیز و بعض معزز مہمانوں کے ساتھ نشست ہوتی تھی، تو وہ اپنے مکان سے جو دارالعلوم کے احاطے ہی میں واقع ہے، خراماں خراماں خود یا کسی رفیق کے سہارے تشریف لاتے تھے، اور یہ راقم بھی وقتاً فوقتاً ان کی قیام گاہ پر جاکر ان کی عیادت اور پرسشِ احوال کا فرض انجام دیتا تھا، ان کو معدہ اور شدید ضعف کی شکایت تھی، اور وہ ایک سے زائد بار اسپتال میں بھی داخل ہوئے تھے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور ضعف بڑھتا گیا، ہاتھ میں شدید رعشہ تھا، اور غذا برائے نام۔

لیکن اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اچانک حادثۂ وفات پیش آجائے گا، بمبئی سے واپسی پر دو تین دن لکھنؤ ٹھہر کر راقم رائے بریلی آیا تھا کہ ۲۹ر نومبر ۱۹۹۳ء کو صبح ۸ر بجے کے قریب عزیزی محمد رابع سلمہٗ کا ٹیلیفون آیا کہ مہتمم صاحب کا انتقال ہوگیا، اور بعد مغرب تدفین ہے، یہ خبر قدیم رفاقت، ہم درسی، دارالعلوم کی خدمت اور انتظامات کے سلسلے میں باہمی اعتماد اور تعاون کی بنا پر، نیز ان کے اخلاق و اخلاص، بے نفسی اور دینداری کی بنا پر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری، اور راقم یہ خبر سننے کے بعد ہی بذریعۂ کار اس طرح دارالعلوم پہنچ گیا

www.abulhasanalinadwi.org

کہ اس نے ظہر کی باجماعت نماز میں شرکت کی، اور عزیز ارجمند اشتیاق احمد فرزند مولانا مرحوم سے تعزیت کی، بعد نماز مغرب نماز جنازہ ہوئی، یہ خدمت بھی اسی گنہگار کو ادا کرنی پڑی، پھر ڈالی گنج کے مقبرہ میں جہاں متعدد ندوی فضلاء (مولانا عبدالباری صاحب ندوی مرحوم صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی سابق مہتمم دارالعلوم کے والد محترم حافظ محمد الیاس صاحب ناظم اوقاف بھوپال............اور فاضل عزیز مولوی عبدالنور صاحب (مولوی نور عظیم ندوی مرحوم) مدفون ہیں، پہنچ کر تدفین میں شرکت کی، جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کا اتنا بڑا مجمع غالباً سالہا سال سے نہ ہوا ہوگا، مخصوص اہل شہر اور اہلِ تعلق کے علاوہ دارالعلوم کے تمام اساتذہ اور سب طلبہ جن کی تعداد کم سے کم دو ہزار ہوگی، جنازہ کے ساتھ تھے۔

مولانا محب اللہ صاحب ندوی راقم کے درسِ حدیث اور دارالعلوم کے آخری درجے کے ساتھیوں میں تھے، وہ اس وقت بھی بڑے متواضع، باوقار، اور تعلیم میں یکسو رہنے والے طلبہ میں تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور وہاں سے انھوں نے پولیٹکل سائنس میں ایم۔اے پاس کیا، ان کے زمانۂ قیام علی گڑھ کے دوران بھی یہ راقم متعدد بار علی گڑھ گیا، اس وقت وہ اور ہمارے اور ان کے دوسرے ساتھی مولوی مصطفیٰ کریم صاحب ندوی ایم-اے میں پڑھ رہے تھے اور غالباً آفتاب ہال میں دونوں مقیم تھے، وہاں بھی ان کی وضع قطع فرائض کی پابندی اور عقائد وخیالات میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ اس طرح کی روایات بھی سننے میں آئی ہیں کہ بعض طلبہ اس وقت جو کمیونزم سے متاثر ہو رہے تھے، ان کی گفتگو اور افہام وتفہیم سے راہِ راست پر آئے، اور ان کے خلافِ مذہب رجحانات میں تبدیلی آگئی۔

علی گڑھ سے فراغت کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ لار کے باشندوں اور برادری کے طرز عمل کے مطابق کانپور میں تجارت بھی شروع کی، لیکن وہ جلد دل برداشتہ ہوگئے

www.abulhasanalinadwi.org

اور ۱۹۶۹ء میں انھوں نے دارالعلوم سے تعلق پیدا کرلیا، ۱۳۸۹ھ میں ان کا بحیثیت مہتمم دارالعلوم کے انتخاب ہوا، اور اپنی زندگی کے آخر تک وہ ذمہ داری پر نیک نامی اور اعتماد ومقبولیت کے ساتھ فائز رہے، اور اسی ایک عظیم دینی وعلمی مرکز کی ذمہ داری کے دوران انھوں نے داغ مفارقت دیا، اوران کے شرکائے کار، معاونین، اور اساتذہ وطلبہ نے ان کی دیانت داری، بے آزاری، اور حریفانہ کشمکش یا منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے بیزاری کی شہادت دی، اور وہ اسی مقبولیت اور اعتماد کے ماحول میں دارالعلوم سے جدا اور دنیا سے رخصت ہوئے، اور اپنے رفقاء کو جن کی بہت کم تعداد رہ گئی ہے، اور حلقۂ احباب کو جو (ان کے میدانی کاموں سے دور اور شہرت وعزت حاصل کرنے سے نفور ہونے کی بنا پر) بہت وسیع نہ تھا، داغِ مفارقت دے گئے ع

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا کی جس صفت نے سب سے زیادہ متاثر کیا، اور ان کی دل میں قدر پیدا کی، وہ ان کی قناعت، عزلت پسندی، ہر طرح کے جاہ واعزاز سے بے رغبتی اور قناعت کی صفت تھی، انھوں نے مسلم نیورسٹی میں اس وقت تعلیم پائی جب وہ اپنے نقطۂ عروج پر تھی، اور وہاں کا سند یافتہ ہونا، یا وہاں تعلیم پانا بھی ایک بڑے فخر واعزاز کی چیز تھی، لیکن ان کی کبھی کسی گفتگو یا اظہار خیال یا طرز عمل سے افتخار تو الگ، اس کا مسرت اور امتیاز کے لہجے میں اظہار بھی نہیں دیکھا گیا، اپنے زمانۂ اہتمام میں طلبہ کی دینداری، نمازوں کی پابندی اور مسجد کی حاضری پر ان کی خاص توجہ رہی، وہ کبھی کبھی اس کے لیے گشت بھی کرتے اور اس پر نظر رکھتے، خود بھی ضعف اور مرض کی حالت میں جب تک ممکن ہوسکا وہ خود چل کر مسجد آتے اور جماعت میں شرکت کرتے، اگر حافظہ خطا نہیں کرتا تو یاد آتا ہے کہ وہ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل ہوگئے تھے، اس دینی ذوق ومشاغل کے ساتھ وہ انگریزی اخبار کا پابندی سے مطالعہ کرتے

www.abulhasanalinadwi.org

اور پولٹیکل سائنس کے طالب علم اور سند یافتہ ہونے کی بنا پر وہ ملک کے سیاسی حالات ومسائل اور حالات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتے تھے، اور ان کے بارے میں حقائق ونتائج تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے تھے، کبھی کبھی وہ بعض مقامی رسالوں میں غالباً "ندائے ملت" میں مضامین بھی لکھتے تھے، آخر میں وہ بالکل گوشہ گیر، نشانِ امراض اور سفر آخرت کے لیے پابرکاب ہوکر رہ گئے۔ "غفر اللّٰہ له ورفع درجاته".

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم

راقم سطور کا نشوونما، قیام، تعلیم و مطالعہ اور دینی و علمی خدمت کا سارا زمانہ لکھنؤ میں اس محلے میں رہا جو پہلے بازار جھاؤلال اور اب محمد علی لین امین آباد کے نام سے مشہور ہے، اس محلے کے عقب ہی میں کچہری روڈ واقع ہے، جس میں ڈاکٹر زین العابدین صاحب قدوائی مرحوم عرصۂ دراز سے مقیم تھے، جو قدوائیوں کے مشہور خاندان کے ایک مسکن بھیارہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، اور اب عرصے سے بسلسلۂ مطب اور صاحبزادوں کی تعلیم کے لیے لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے، یہ خاندان شرفائے اودھ کی قدیم روایات کا حامل، ذہانت، قوّتِ عمل اور وضع داری میں زمانۂ دراز سے مشہور و ممتاز ہے، فلسفہ کے بلند پایہ اور عالم مفسرِ قرآن، علم و ادب اور ایک خاص اسلوب تحریر و تنقید کے حامل مولانا عبدالماجد دریابادی؛ سیاسی خدمات، حسنِ انتظام و دیانت میں نامور جمہوریۂ ہند کے اولین وزیر غذا و مواصلات مسٹر رفیع احمد قدوائی؛ قوتِ عمل اور انتظامی لیاقت کے لحاظ سے تحریکِ خلافت میں نمایاں حصہ لینے والے مشہور عالم، تصنیفی و تحقیقی ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اولین اور کامیاب ترین ناظم مولانا مسعود علی ندوی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

میں اپنی تعلیمی مشغولیت اور فطری کم آمیزی کی بنا پر اپنے محلّہ کے قرب و جوار میں رہنے والے بہت سے ممتاز اور معزز حضرات اور اہلِ محلّہ سے بہت کم واقف تھا، کبھی گزرتے ہوئے کچہری روڈ پر ڈاکٹر زین العابدین کے نام کا بورڈ دیکھ لیا کرتا تھا، جو ہومیوپیتھک کے ایک کامیاب معالج تھے، لیکن کبھی ان کے باکمال صاحبزادہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی سے نہیں ملا تھا، جو ۱۹۴۶ء سے ایک مرض و علاج کے نتیجے میں مستقل

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب فراش تھے، لیکن اسی حالت میں وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، ۱۹۵۱ء سے دعوتی وتبلیغی مشغولیت وذمہ داری کی بنا پر میرا مستقل قیام تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں ہونے لگا، ۵۱-۵۲-۱۹۵۳ء میں ہمارے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کا قیام اسی تبلیغی مرکز میں ہوا، اسی زمانے میں ڈاکٹر زین العابدین صاحب سے (جو نماز کے لیے اسی مرکز کی مسجد میں تشریف لاتے تھے) تعارف اور ربط قائم ہوا اور ان کے دینی وادبی ذوق، شعر گوئی اور حذاقت کا علم ہوا، انھوں نے حضرت رائے پوریؒ سے بیعت کا تعلق قائم کیا اور حضرت کی خدمت میں آنے لگے، اس تعلق سے ان کے صاحب کمال اور صاحب قلم لائق صاجزادے ڈاکٹر محمد آصف قدوائی سے بھی تعارف ہوا اور ان کے کمالات وخصوصیات کا اجمالی علم۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ صبح کی نماز کے بعد سیر کو تشریف لے جاتے جو آپ کا قدیم معمول تھا، ہوا خوری میں خدام ومحبین کی ایک جماعت ساتھ ہوتی، واپسی پر ڈاکٹر زین العابدین صاحب قدوائی کے مکان پر (جس کے اور مرکز کے درمیان چند مکانوں کا ہی فاصلہ ہے) تشریف لاتے، اور ان کے لائق فرزند ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھتے، حضرت کو ایسے لائق اور ذہین نوجوان مسلمان فاضل کی مستقل بیماری ومعذوری سے بڑا رنج تھا، آپ ان کی بڑی دلداری فرماتے اور قریب قریب روزانہ ان کو وقت دیتے، رائے پور کے قیام اور لکھنؤ سے دور رہنے کے زمانے میں بھی ان کا تعلق اور تأسف کے ساتھ ذکر کرتے، آصف صاحب نے حضرت سے بیعت کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا۔

یہ تمہید اور ابتدا تھی، میرے اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے آصف صاحب سے ربط وتعلق اور ان کی یگانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی، جب ان کے پاس کثرت سے آنا جانا، اُٹھنا بیٹھنا ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ انگریزی کے ممتاز اہل قلم اور ادیبوں میں ہیں، اور مسلمانوں کی موجودہ انگریزی داں نسل میں جو یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلی ہے، انگریزی لکھنے اور انگریزی زبان پر استادانہ وادیبانہ قدرت رکھنے میں کم ہی

www.abulhasanalinadwi.org

لوگ ان کی ہمسری کر سکتے ہیں، ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ لندن یونیورسٹی کے مشہور نقاد و محقق استاد سیاسیات پروفیسر لاسکی نے دیکھا تھا، اور اس پر اظہار اطمینان اور تعریفی نوٹ لکھا تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اردو میں بھی لکھتے ہیں، تاریخ وسیرت اور دینیات کا بھی مطالعہ ہے، اسی زمانے میں (۱۹۵۹ء) میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطے میں ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اپنی نشریات ومطبوعات کا آغاز انھیں کی کتاب ''مقالات سیرت'' سے کیا، یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں طبع ہوئی اور اہلِ نظر نے اس کو پسند کیا، یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

مجھے عرصے سے ایک ایسے فاضل مترجم اور انگریزی کے کہنہ مشق اہل قلم کی تلاش تھی، جو میری کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' (جو راقم کی سب سے مشہور ومقبول کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا ترجمہ ہے، اور جس کے عربی میں تقریباً بیس ایڈیشن نکل چکے ہیں) انگریزی میں منتقل کرے، اس کے لیے میری نظر ڈاکٹر آصف صاحب ہی پر پڑی انھوں نے بہت دل لگا کر اور بہت انہماک کے ساتھ اس کا ترجمہ مکمل کیا جو "Islam and The World" کے نام سے بار بار چھپا، یہ ان کے کمالِ فن کا پہلا نمونہ تھا، جس سے ان کا ہندوستان اور ہندوستان کے باہر تعارف ہوا، ۱۹۶۳ء میں لندن کے قیام کے زمانے میں انگریزی کے ایک مسلمان اہل قلم (ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری) (۱) نے جو خود انگریزی کے اچھے لکھنے والے اور مترجمین میں ہیں، مجھ سے کہا کہ مولانا آپ یقین کیجیے کہ کسی غیر انگریزی کتاب کا ابھی تک انگریزی میں اس کتاب سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا، میں نے ان کو اپنی کتاب ''قادیانیت'' کے انگریزی ترجمہ کی زحمت دی، انھوں نے ترجمہ مکمل کیا تو مجھ سے کہا کہ مولانا یہ کتاب آصف صاحب کو دکھلا لیجیے گا، میں ان کو استاد مانتا ہوں، یہی تأثر بعض دوسرے حضرات نے بھی ظاہر کیا، اور وہ کتاب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ

---

(۱) سابق پروفیسر پٹرولیم یونیورسٹی ظہران، حال پروفیسر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں انگریزی ٹکسال میں ڈھلا ہوا سکہ ہے۔

آصف صاحب کے اس ترجمے سے ان کی شہرت دُور دور ہوئی، مشہور ایرانی فاضل اور اسلامیات پر لکھنے والے ڈاکٹر سید حسین نصر لکھنؤ آئے تو ان سے ملنے آئے، راقم السطور نے جب ۱۹۷۳ء میں رابطہ کے وفد کے ساتھ مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور ایران گیا تو جب تہران میں ڈاکٹر سید حسین نصر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے تنہا آصف صاحب کے بارے میں پوچھا اور ان کی خیریت دریافت کی۔

اس کامیاب تجربے کے بعد میں اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اپنی کتابوں کے انگریزی تراجم کے لیے ان کو بار بار اور جلد جلد زحمت دینی شروع کی اور انھوں نے از راہ تعلق اور جذبۂ دینی اس معذوری کی حالت میں کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے (اُٹھ کر بیٹھنا تو در کنار) اور ایک نقشِ تصویر تھے، یہ خدمت خوشی سے قبول کی، اور اس میں اپنی سعادت اور دین کی خدمت واشاعت کا ایک ذریعہ سمجھا، ان کی معذوری کی حالت یہ تھی کہ کوئی بھاری کتاب اپنے سینہ پر رکھ کر اس کا ترجمہ نہیں کر سکتے تھے، وہ اس کی جلد توڑ دیتے اور تھوڑے تھوڑے اوراق سامنے رکھ کر ترجمہ کرتے، میں نے کئی دفعہ کہا کہ آپ کے لیے کسی لکھنے والے (اسٹینو) یا ٹائپسٹ کا انتظام کر دیا جائے، انھوں نے منظور نہیں کیا، اور خود ہی اپنے قلم سے لکھنے کی زحمت گوارا کی، ان کے قلم سے اس طرح تیرہ کتابوں کے انگریزی ترجمے نکلے جن کی فہرست طویل ہے، ان میں بعض خالص علمی و دینی کتابیں تھیں، جن میں دینی اصطلاحات، دینی مسائل اور قرآن وحدیث کے اقتباسات کثرت سے تھے، اور قلم کو بہت سنبھال کر اور احتیاط سے چلانے کی ضرورت تھی، مثلاً مولانا منظور صاحب کی مشہور ومقبول کتاب ’’معارف الحدیث‘‘ (۱-۴) میری کتاب ’’ارکان اربعہ‘‘ اور بعض ایسی کتابیں تھیں، جن کے لیے اعلیٰ ادبی اسلوب پر قدرت، حلاوتِ زبان اور نزاکتِ تعبیر کی احتیاج تھی، جیسے ’’نقوشِ اقبال‘‘، جس کا ترجمہ انھوں نے "Glory of Iqbal" کے نام سے کیا اور ان کو ایک حد تک اس پر ناز بھی تھا، دوسرے ’’کاروانِ مدینہ‘‘

جس میں دردو محبت، آشنا دل اور ادب شناس قلم کی ضرورت ہے، وہ ان تمام دشوار گزار اور بعض اوقات دراز و پُر خار وادیوں سے کامیابی سے گزرے اور انھوں نے انگریزی میں اسلامیات کا ایک قیمتی و متنوع ''مکتبہ'' تیار کردیا، جس کی نظیر میرے محدود علم میں اس برِ صغیر ہی میں نہیں، انگریزی بولنے اور لکھنے والے ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ان کا سب سے بڑا وصف جو امید ہے کہ ان کو آخرت میں مراتبِ علیا تک پہنچائے گا، وہ ان کا تسلیم و رضا کا وہ معاملہ ہے جو انھوں نے دو چار سال نہیں ۴۳ سال کی طویل مدت میں قائم رکھا اور کسی نے ان کی زبان سے کوئی حرفِ شکایت نہیں سنا، آخر میں نقل و حرکت کی اس مکمل معذوری و مجبوری کے علاوہ ان کو متعدد اندرونی تکلیفوں سے سابقہ پڑا، جن میں سے ہر تکلیف ایک صابر اور متحمل آدمی کو بھی مضطرب اور بے چین کردینے کے لیے کافی ہے، اسی میں انھوں نے فرائض کی پابندی، ذکر و شکر، تحریری مشغولیت اور علاج و معالجے کی خدمت کو جاری رکھا، مریض ان کے پاس علاج و مشورے کے لیے آتے اور ٹیلی فون سے بھی رابطہ رکھتے، جو ان کے لیے ایک طرح سے دلچسپی اور وقت گزاری کا سامان بھی تھا، نہ ان کے چہرہ پر پریشانی و احتجاج کی کوئی شکن نمودار ہوتی، نہ ان کی زبان پر شکوہ و شکایت کا کوئی حرف آتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہومیو پیتھک کا طریقۂ علاج سے بھی خاص مناسبت بخشی تھی، جو ان کے مطالعہ اور والد ماجد کی صحبت و تجربہ کا بھی اثر تھا، اس طرح سے ایک سرتاپا مرض انسان خدمت خلق سمجھ کر دوسرے مریضوں کی چارہ سازی کرتا اور کوشش کرتا کہ وہ اپنے خاندان پر سراپا بار بن کر نہ رہ جائے، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ وہ طویل المیعاد مریض خستہ و شکستہ انسان ۲۰/ فروری ۱۹۸۹ء کو اپنی سب تکلیفوں سے نجات پاکر اپنے رب و معبود کے دربار میں پہنچ جائے، اس صبر و رضا کا اجر پائے اور اس عالم میں پہنچ کر جس کی شان ہے "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" یہ کہتا ہوا قدم رکھے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ". (وہ کہیں گے کہ خدا کا شکر ہے، جس نے ہم سے غم کو دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار بخشنے والا (اور) قدر داں ہے)

www.abulhasanalinadwi.org

۲۰ر فروری کو بعد نماز عصر ان کی نماز جنازہ ہوئی، جس میں اہلِ علم، اہلِ دین اور احباب واعزہ کی ایک بڑی تعداد شریک تھی، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے نماز پڑھائی اور ان کو عیشِ دوام کے لیے عیش باغ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ ورفع درجاتہ۔

آخر میں اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان کے برادر محترم محمد عارف قدوائی صاحب، ان کے اہلِ خاندان، ہمشیرگان اور ان کے صاحبزادوں نے اس طویل عرصے تک ان کی ایسی خدمت کی اور ایسے انشراح اور احترام کے ساتھ ان کی ضروریات پوری کیں، جس کی مثال مشکل سے ملے گی، اور جو ان کی شرافت خاندانی اور بلند حوصلگی اور حق شناسی کی دلیل ہے۔

جزاهم الله خير الجزاء.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

کسی تعلیم یافتہ اور معزز ملک کے لیے اتنا کافی نہیں کہ وہ سیاسی حیثیت سے طاقتور، معاشی حیثیت سے خوشحال اور خودکفیل ہے بلکہ اتنا بھی کافی نہیں کہ اس میں درجنوں کے حساب سے یونیورسٹیاں اور سیکڑوں کے حساب سے مدارس اور دانش گاہیں پائی جاتی ہیں، اس سب کے ہوتے ہوئے اس کے امتیاز و نیک نامی اور عزت و وقعت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں قابلِ لحاظ تعداد میں ہر طرح کے اجتماعی، معاشرتی اور معاشی مفادات سے بے نیاز و بے پروا ہو کر علمی و تحقیقی کام کرنے والے، اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے والے اور اسی میں بڑی سے بڑی عزت و لذت محسوس کرنے والے دانشور، اہلِ قلم، بادیۂ بحث و تحقیق کے دیوانے اور شمعِ علم کے پروانے پائے جاتے ہیں، جن میں سے ایک ایک آدمی نے اکاڈمی کا کام کیا اور جن کی محنت و انہماک، خود فراموشی و جاں سپاری سے پورا پورا کتب خانہ تیار ہو گیا اور جن کی زبانِ حال اور کبھی کبھی زبان قال (ان کی تندہی اور جفاکشی پر رحم کھانے والوں کو) جواب دیتی رہی ہو کہ ؂

عاشقاں راخستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است وہم خودمنزل است

ہندوستان کے اس عہد اخیر کے انھیں ممتاز اور معدودے چند اشخاص میں (کسی ادارہ، مدرسۂ فکر یا جماعت و فرد کی رعایت و پاسداری کے بغیر کہا جاتا ہے) سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبؒ سابق ناظم دارالمصنفین بھی تھے، جنھوں نے نصف صدی سے زائد مدت تک ایک ایسے شہر میں جو سیاسی واقتصادی مرکزیت و شہرت سے دوراور

www.abulhasanalinadwi.org

مواصلات کی شاہراہِ عام سے الگ، اور ایک ایسے تصنیفی ادارے میں جو حکومتوں کی سرپرستی، گرانقدر مشاہروں اور راحت وفارغ البالی کے وسائل ومواقع سے بے نیاز وبالاتر تھا گزاردی (۱)۔

ان کی تصنیفات کی تعداد پچاس کے قریب ہوتی ہے، جن کے مجموعی صفحات دس ہزار سے کم نہیں، یہ تو ان کی تصنیفات وصفحات کی کمیت (Quantity) کا معاملہ ہے، لیکن جہاں تک ان کی تصنیفات کے موضوعات، عصر حاضر کے تقاضے کی تکمیل کی اہمیت، ان کے مواد ومضامین کی قدر وقیمت اور ان کتابوں کی افادیت اور ان کے ذریعے سے وقت اور ملک وملت کی ضرورت اور مسائل کی اہمیت (Quality) کا تعلق ہے، وہ کمیت سے بھی فزوں تر ہے، اور تعدادِ تصنیفات وصفحات سے بھی اہم تر ہے۔

اہلِ علم ونظر جانتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اسلامی ممالک میں مغرب کے سیاسی تسلط واقتدار اور جہاں وہ نہیں پہنچ سکا وہاں اس کی تہذیبی، ثقافتی اور فکری اثر انگیزی اور اس کے معیار ومقیاس بن جانے کی وجہ سے زیادہ آسان، عام فہم، دلچسپ اور زندگی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فلسفۂ مابعد الطبعیات، سائنس پھر سیاست واقتصادیات سے زیادہ تاریخ ذہنوں کو متاثر ومرعوب کرنے، مفتوحہ ممالک اور زیرِ حکومت یا زیر اثر تعلیم یافتہ نسل میں احساس کہتری، اپنے ماضی اور اپنے قابل فخر اسلاف اور پیش رؤں کے بارے میں بے اعتمادی بلکہ تحقیر وشرمساری، دینی علوم کی تدوین وترتیب اور عہدِ ماضی کے علمی کارناموں کے سلسلے میں شبہات وشکوک پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی تھی، اور اسی صورت حال نے (جس سے اکثر مسلم ممالک کا واسطہ تھا) قدیم علمی اصطلاح میں ایک نئے "علم کلام" کی ضرورت پیدا کردی تھی، جو تاریخ ہی کی زبان میں اور تاریخ ہی کی شہادتوں کی مدد سے اس کا (سپاہیانہ زبان استعمال کرنے سے معذرت کے ساتھ) "ترکی بہ ترکی" جواب دے۔

(۱) سید صباح الدین صاحب ۱۹۳۵ء میں دار المصنفین آئے اور ۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کو سواری کے ایک حادثہ میں لکھنؤ میں انتقال کیا، اس طرح ان کے قیام دار المصنفین کی مدت باون [۵۲] سال ہوتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سب جانتے ہیں کہ تاریخ روایتوں، واقعات اور جزئیات کا ایک ایسا ذخیرہ اور موادِ خام (Raw Material) ہے جس سے کسی عہد کا نقشہ یا کسی شخصیت کا مجسمہ اور حلیہ تیار کرنا اور اس کے بارے میں پڑھنے والوں کے ذہن و نقطۂ نظر کا تعین و تشکیل ایک مؤرخ کی نیت، طریقِ فکر اور مقاصد کے تابع ہوتا ہے، وہ اگر چاہے تو تاریخ کے چند منتشر اجزاء کو ایک خاص سلیقے سے جمع کر کے اس عہد کو مثالی و معیاری عہد اور کسی شخصیت کو پیکرِ جمال و کمال بنا کر دکھا سکتا ہے، اور اگر اس کا ارادہ اور مقاصد کچھ اور ہیں تو کسی بہتان طرازی وافترا پردازی کے بغیر اپنی چابکدستی اور محنت سے اس عہد کو ایک تاریک، پسماندہ اور پُر از معائب دور، اور اس شخصیت یا سلسلۂ ملوک و حکام کو سرتاپا ظالم و مستبد ثابت کر سکتا ہے۔

راقم نے اپنے ایک مقالے میں جو رابطۂ ادب اسلامی کی ایک مجلس میں ''تعارفی وسوانحی ادب اور اس کے تقاضوں و احتیاطوں'' کے موضوع پر پڑھا تھا، عرض کیا تھا کہ جس طرح روز مرہ کی زندگی میں خارجی اجسام کا درجۂ حرارت و برودت (Temperature) ہوتا ہے، اور تمام اجسام کے لیے (موسموں کے اختلاف کے باوجود) ایک ہی درجۂ حرارت و برودت کا تعین نہیں کیا جا سکتا ہے، اسی طرح توصیفی و تنقیدی الفاظ کا بھی درجۂ حرارت و برودت (Temperature) ہوتا ہے، اشخاص اور ان کے مراتب و صفات کے لحاظ سے تعریفی اور مدحیہ الفاظ یا مذمت و تنقیص کے اوصاف استعمال کیے جانے چاہئیں، یہی حال تاریخ کا بھی ہے کہ ایک وسیع النظر تجربہ کار اور فنِ تاریخ سے مناسبت رکھنے والا مصنف و مؤرخ ہی کسی عہد، خاندان حکومت یا شخصیت کی طرف منسوب کیے جانے والے کسی واقعہ، اقدام یا کارروائی یا کسی خلقی و طبعی کمزوری یا بے اعتدالی کے حجم و تناسب کو سمجھ سکتا ہے، کہ اس عہد کے حالات، واقعات، معاشرہ و اجتماع یا اس خاندانِ حکومت و شخص کے اخلاق و سیرت اور پوری زندگی میں اس واقعے و اقدام یا اس اخلاقی کمزوری و بے اعتدالی کا صحیح حجم (Correct Capacity) اور تناسب کیا تھا اور محض اس کی بنا پر اس عہد، خاندانِ حکومت (Ruling Family) یا اس شخصیت کے بارے

www.abulhasanalinadwi.org

میں آنکھ بند کر کے حکم لگانا کہاں تک صحیح ہوگا، تاریخی ذخیرہ ایجابی وسلبی، تعمیری وتخریبی مقاصد، اور مدّاحی وہجونگاری دونوں کے لیے مواد فراہم کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ومستعد ہے، لیکن یہ کام ایک صاحبِ بصیرت، دیانتدار وحقیقت شناس مصنف کا ہے کہ وہ ان روایات وواقعات کا تناسب سمجھے اور ان کو ان کا صحیح حجم اور وزن دے، سب جانتے ہیں کہ فنِ تعمیر، نظامِ مملکت، یہاں تک کہ ادب وتاریخ سب کا دارومدار احساسِ تناسب (Sence of Proprtion) پر ہے، اگر کوئی انجینئر، ناظمِ مملکت، ادیب وشاعر، مؤرخ ونقاد اس صلاحیت سے محروم ہے تو وہ اپنے فن کا حق نہیں ادا کر سکتا، اور آسانی کے ساتھ کسی فرشتہ صفت انسان ومعدلت شعار خاندان کو چنگیز وہلا کو ثابت کر سکتا ہے، اور کسی ظالم وجابر فرد یا خاندان کو فرشتۂ رحمت بنا کر دکھا سکتا ہے۔

ہندوستان کے اسلامی عہد کو جو آٹھ نو صدیوں پر زمانی حیثیت سے اور درّۂ خیبر سے خلیج بنگال تک مکانی حیثیت سے پھیلا ہوا تھا، اور جس میں طاقتور وکمزور، مدبّر وغیر مدبّر ہر طرح کے سلاطین آئے، ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کی تاریخ نویسی اور اس پر عام نتائج مرتب کرنے کا کام اور اپنے قارئین کو متاثر کرنے کا ہنر، مصنف کے طے کردہ مقصد وارادے اور بعض اوقات سیاسی وقومی مفادات کے تابع ہوتا ہے، مشہور انگریز مؤرخ ایلیٹ (Elliot) نے جس نے سب سے تفصیل کے ساتھ انگریزی میں پہلی تاریخ مرتب کی، اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''میں نے اس کتاب میں ایسا مواد (Material). جمع کر دیا ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد کبھی ہندو مسلمان کے دل نہیں مل سکتے'' یہ کام مسلمانوں کے عہد حکومت کی بعض متنازعہ فیہ شخصیتوں کے بارے میں نسبتاً آسان تھا، چنانچہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اس کا سب سے بڑا نشانہ رہا، ہمارے علم میں بیسویں صدی کی ابتدا میں عالم اسلام میں عمومی طور پر اور اس برِّ صغیر (ہندوستان) میں خصوصی طور پر اس حقیقت کی طرف سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے توجہ کی، ایک طرف انھوں نے ''اورنگ زیب عالمگیرؒ'' ''الجزية في الاسلام'' اور ''کتب خانۂ اسکندریہ'' جیسی

www.abulhasanalinadwi.org

محققانہ کتابیں لکھ کر اس نئے تاریخی علم کلام کی بنیاد ڈالی جس کی اس زمانے میں سخت ضرورت تھی، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے مسلمان طلبہ بلکہ نوجوان جدید تعلیم یافتہ فضلاء ودانشور اپنے غیر مسلم استادوں، اور غیر مسلم رفقاء کے طعنے سنتے سنتے تنگ آگئے تھے، اور ان میں احساسِ کمتری پیدا ہورہا تھا، کہ اورنگ زیب نے مندروں کو گرایا اور ہندؤں کو زبردستی مسلمان بنایا، بقول مولانا شبلی ؎

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندوکش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

جزیہ ایک ظالمانہ ٹیکس اور غیر مسلم آبادی کی تذلیل واہانت ہے، عرب فاتحین نے اسکندریہ کا قیمتی ذخیرۂ کتب جلادیا، مولانا کی تصنیفات کے بعد ان مسلمان نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں نے فخر کے ساتھ سر اٹھا کر ان الزامات کا جواب دیا۔

دوسری طرف مصر کے عیسائی فاضل جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" کا جواب "الانتقاد علی التمدن الاسلامی" لکھ کر انھوں نے نہ صرف ہندوستانی علماء بلکہ عرب (مصروشام) کے علماء کی طرف سے بھی (جہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی) فرض کفایہ ادا کردیا، جس کا علامہ سید رشید رضا اور دوسرے عرب فضلاء نے ممنونیت کے ساتھ ذکر واعتراف کیا۔

ہندوستان کی تاریخ بھی اس کی ضرورت مند تھی کہ بغیر کسی تخلیق اور مفروضات کے اسلامی عہد کا روشن رُخ تاریخ ہی کی شہادت سے نمایاں اور روشن کیا جائے، راقم دارالمصنفین ہی کے ایک رکن اور وقت کے تقاضوں کو محسوس کرنے والے ایک انسان و مسلمان کی حیثیت سے سید صباح الدین سے برابر تقاضا کرتا رہا کہ وہ تاریخ ہند کے پورے سلسلے کو مرتب کردیں، اس لیے کہ ایک کہنہ مشق وصاحب نظر مورخ علامہ سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ مصنف اور اہل قلم ہونے نیز فارسی وانگریزی پر عبور رکھنے کی بنا پر، وہ اس کام کو بطریق احسن انجام دے سکتے ہیں، راقم کو معارف کا تازہ نمبر نومبر ۱۹۸۹ء میں یہ

www.abulhasanalinadwi.org

دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حضرت سید صاحبؒ خود ان سے تاریخ ہند کی ترتیب و تکمیل کا تقاضا کرتے تھے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے سلسلے کو جاری رکھو اللہ تعالیٰ پورا فرمائے''۔(۱)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''میں تو چراغ سحر ہوں، شاہ معین الدین احمد صاحب دارالمصنفین کے دوسرے کاموں میں لگیں گے، اب تم ہی کو تاریخ ہند کے سلسلے کو مکمل کر کے اس کے چھپوانے کا انتظام کرنا ہے''۔(۲)

اس سلسلے میں سید صباح الدین صاحب کے قلم سے ۱۹۶۶ء میں ''ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں'' کتاب نکلی جو ایک مفید اور پُر از معلومات کتاب ہے، جس سے ہندوستان میں بسنے اور پیدا ہونے والے غیر ملکی نسل کے مسلمانوں کی ہندوستان کی سرزمین سے وابستگی، ان کی وسیع القلبی اور شرافت کا اظہار ہوتا ہے، اور بہت سی وہ معلومات ملتی ہیں، جو تاریخ وادب کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتیں، ایک ایسے دور میں جب مسلمانوں کے بارے میں (نصابی کتابوں اور تاریخ کے ذریعے) یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ ان کو اس سرزمین سے کبھی گہرا ذہنی اور نفسیاتی تعلق نہیں رہا ہے، وہ ہمیشہ باہر کی طرف دیکھتے رہے ہیں، یہ کتاب ایک مفید خدمت انجام دے سکتی ہے، اس میں امیر خسرو کی ان کتابوں کے اہم مضامین و انتخابات بھی آگئے ہیں، جن سے ہندوستان کی خصوصیات اور معاشرے پر روشنی پڑتی ہے۔

منافرت، غلط فہمی اور غلط بیانیوں کی موجودہ فضا میں ان کی دوسری کتاب ''ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں'' (جو دو حصوں میں ہے) بھی ایک محمود کوشش ہے، جس سے اسلامی عہد کے روشن پہلو سامنے آتے ہیں، اس سے زیادہ اس پہلو کو اُجاگر کرنے والی کتاب ''ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری''

(۱) معارف نومبر ۱۹۸۹ء، ص:۳۶۶ (۲) ایضاً۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہے، جو تین حصوں میں ہے، اور جس کو فاضل مصنف نے حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کے عہد سے شروع کر کے آخری اسلامی عہد تک پہنچایا ہے، اور مسلمان سلاطین کی مذہبی رواداری کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن پر شاید کوئی متصلب فقیہ تنقیدی نظر ڈالے، لیکن منافرت کے اس عہد میں بقائے باہم کی فضا پیدا کرنے کے لیے ایسی کتابوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس موضوع پر اور اسی مقصد کے ماتحت ان کی دوسری کتابیں ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدّنی جلوے''، ''اسلام میں مذہبی رواداری''، ''ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک''، ''عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں'' ہیں، نیز ''بزم تیموریہ'' (جس کی تین جلدیں ہیں) بھی اس سلسلے کی ایک قیمتی کڑی ہے، جس میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں کی علم دوستی، علماء نوازی، اور ان کے عہد کے اصحابِ کمال کا تذکرہ آگیا ہے، نیز ''بزم مملوکیہ'' جس میں غلام سلاطین امراء و شہزادوں کی علم نوازی و معارف پروری اور دربار کے علماء و فضلاء اور ادباء و شعراء کے کمالات پر تبصرہ ہے، آخر میں وقت کے ایک چلتے بلکہ جلتے ہوئے مسئلہ ''بابری مسجد یا رام جنم بھومی'' کے تنازعے کے سلسلے میں ان کی محققانہ کتاب ''بابری مسجد'' ہے، جو دستاویزی و آئینی تاریخی معلومات کا مجموعہ ہے، اگرچہ ٹائٹل پر مصنف کا نام نہیں ہے۔

یہ تاریخ ہند کو اس شکل میں پیش کرنے کی قابل قدر کوشش کا خلاصہ ہے، جس کی اس منافرت اور تاریخ سے سیاست کے اس قدیم رومی اصول (Divide and Rule) پر عمل کرنے کے دور میں سخت ضرورت تھی، لیکن اس کے ساتھ اس عظیم ملک کی اس روحانی، اصلاحی و تربیتی تاریخ کو مسلمان نوجوانوں اور شائقینِ علم کے سامنے پیش کرنے کی ان کی کوشش بھی ناقابل فراموش خدمت ہے، صوفیائے کرام کے کام اور مقام کے تعارف کی نئی زبان اور تاریخی ثقاہت و سنجیدگی کے ساتھ پیش کرنے کی

www.abulhasanalinadwi.org

ضرورت تھی کہ اس زمانے کی نئی نسل فارسی سے نا آشنا اور ملفوظات وسوانح کے پرانے ذخیرے سے نامانوس سے نامانوس تر ہوتی جارہی ہے، اس سلسلے میں حق ناشناسی ہوگی، اگر فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی قابل قدر کتاب ''تذکرہ مشائخ چشت'' کا نام نہ لیا جائے، سید صاحب مرحوم نے ''بزم صوفیہ'' کے نام سے جو سات سوتیئس صفحات پر مشتمل ہے، اس کام کا آغاز کیا اور ان کی یہ کتاب علمی حلقے میں ذوق وشوق سے پڑھی گئی، اس کے علاوہ ہندوستان کے عہد وسطٰی کے فوجی نظام پر ان کی ضخیم کتاب ان کی وسعت مطالعہ کی شاہد اور ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' ان کے ادبی ذوق اور سخن فہمی کی گواہ ہے۔

یہاں تک تو ان کے علمی وتصنیفی کام پر ایک ہلکا سا تبصرہ تھا، دارالمصنفین کی بقا وترقی اور اس کی خصوصیات ومقاصد کے تسلسل میں بھی ان کا حصہ ناقابل فراموش ہے، اس سلسلے میں ان کا ایک بڑا کارنامہ ''اسلام اور مستشرقین'' پر وہ تاریخی سیمنار ہے جو ۲۱، ۲۲رفروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین میں ان کی دعوت پر منعقد ہوا، یہاں پر'' کاروان زندگی'' حصہ دوم سے چند سطور نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

> ''اس سیمنار کا انعقاد دارالمصنفین کی اہم دینی خدمات اور اولیات میں شمار ہونے کے قابل ہے، وہ جس بامقصد سنجیدہ ماحول اور جن ممتاز مسلم وعرب فضلاء کی موجودگی میں انجام کو پہنچا اور اس میں جو فاضلانہ وفکر انگیز مقالات پڑھے گئے، اس پر دارالمصنفین کو فخر اور خدا کی اس توفیق پر شکر کرنے کا حق ہے''۔(۱)

ان کا دوسرا اہم کارنامہ ادارے کا مالی استحکام، پاکستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات کی اشاعت کا انتظام اور علمی حلقوں میں عام تعارف ہے، وہ بڑے اصرار واہتمام کے ساتھ پاکستان کی موقر علمی مجلسوں، سیمناروں اور کانفرنسوں میں بلائے جاتے

(۱) کاروانِ زندگی، ج۲، ص۳۰۱

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، جنرل ضیاء الحق مرحوم ان سے بڑے احترام واعزاز کے ساتھ ملتے تھے، اوران کی شرکت کواہمیت دیتے تھے۔

اس موقع پراس کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ۱۹۸۶ء کے اوائل میں ان کوایک ایوارڈ میں ایک گرانقدر رقم ملی، انھوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ اس سے عمرہ وزیارت کا فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ مبارک سفر کریں گے، تقدیری بات کہ راقم کوبھی انہیں دنوں رابطۂ عالم اسلامی کی "مؤتمر المجمع الفقھی" میں شرکت کے لیے وہاں حاضری دینی تھی، اس طرح اس رفاقت کا ایک غیبی انتظام ہوگیا، اوائل رجب ۱۴۰۶ھ اس مبارک سفر کا پروگرام طے ہوا، اور ۱۶؍مارچ ۱۹۸۶ء کودہلی سے جدہ کے لیے روانگی ہوئی، انھوں نے اس سفر سے پورا فائدہ اٹھایا، بڑے ذوق وشوق اور عقیدت واہتمام کے ساتھ عمرہ کیا اور حرم شریف کی حاضری اور طوافوں کی سعادت حاصل کی۔

مکہ معظّمہ کے زمانۂ قیام میں امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے کھانے پر مدعو کیا، اور دوسری مجالس وتقریبات میں شرکت کی نوبت آئی، پھر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، اور وہاں بستان نورولی میں قیام رہا، جہاں مدینہ طیبہ کے علماء ادباء اوراحباب بہ کثرت آتے رہے، اوران سے تعارف ہوا، اسی زمانۂ قیام میں ہمارے قدیم کرم فرما شیخ محمود الحافظ نے (جو ہندوستان اور وہاں کی شخصیتوں اوراداروں سے بہت واقف ہیں، اوران کے صاحبزادہ استاذ محمد الحافظ جورابطہ کے ایک اہم عہدہ پر فائز ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں) اپنی شاندار قیام گاہ پر بڑی پُرتکلف دعوت کی جس میں اہل علم واہل ذوق کا اچھا اجتماع تھا، اوروہاں مدینہ طیبہ کی مناسبت سے ایک اچھی دینی وادبی نشست رہی اور ہم لوگ ۶؍اپریل ۱۹۸۶ء کوجدہ سے براہ راست ہندوستان واپس ہوگئے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سید صباح الدین صاحب نے چونکہ

www.abulhasanalinadwi.org

یہ سفر اپنے دینی ذوق اور عقیدت کی بناء پر کیا تھا، واپس آکر ''معارف'' میں اس کے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، جب کہ اہل قلم و مدیران رسائل مختلف عنوانوں اور بہانوں سے بڑی آب وتاب سے ایسے سفروں کے تاثرات و مشاہدات کا ذکر کرتے ہیں، راقم کو اس جذبہ اور طرز عمل کی بڑی قدر آئی۔

☐☐☐

www.abulhasanalinadwi.org

حکیم عبدالقوی صاحب دریابادیؒ

۱۹۲۴ء سے جب راقم کی عمر دس گیارہ سال تھی، لکھنؤ سے نکلنے والے ہفت روزہ رسالہ "سچ" سے واقف ہوا، جیسا کہ میں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے، غالباً اس سے زیادہ سیدھا سادہ، عام فہم اور روزمرہ کسی پرچے یا اخبار کا نام اس وقت ہندوستان میں نہ تھا، شاید سب سے پہلے اسی کے ذریعے مولانا دریابادی کا نام نظر سے گزرا اور کان میں پڑا، پھر ۱۹۲۵ء میں جب ندوہ کا سالانہ اجلاس کانپور میں ہوا تو میں بھی ایک کم سن تماشائی کی حیثیت سے جس کے خاندان کا اس تحریک وادارے سے بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا، اول سے آخر تک اجلاس میں شریک رہا، مولانا عبدالماجد صاحب کو پہلی مرتبہ وہیں اسٹیج پر مولانا محمد علی جوہر کے پہلو میں (جو شریکِ اجلاس تھے) بیٹھا ہوا دیکھا، پھر اخبارات ورسائل، ادبی مضامین کے مطالعہ وذوق، سیاسی رجحان کے اشتراک، خاندانی روابط کی بنا پر اور اپنے مربی وشفیق برادر محترم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ سے اس ربط وتعلق کی بنا پر جو مولانا کو ان سے تھا ان کی بار بار زیارت ہوئی، اور بعد میں ان کے پرچے سے جس کا نام اب "صدق" ہوگیا تھا، ایک ذہنی، علمی، فکری اور روحانی ارتباط پیدا ہوا، اور وہ راقم کے لیے ایک مستقل دانش گاہ، دارالمطالعہ، بلکہ ایک تربیتی وروحانی خانقاہ بن گیا، مغربی تہذیب کے سحر وطلسم سے جو اس وقت سارے مشرق پر چھایا ہوا تھا، نہ صرف آزادی بلکہ کسی حد تک بغاوت اور اپنی عمر وثقافت کے لحاظ سے "ذہنی ردِ عمل" سب سے پہلے اس سے پیدا ہوا، اس کا ایک بڑا احسان لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے تعارف ہی نہیں، عقیدت وارادت اور ان کے کلام سے استفادہ

www.abulhasanalinadwi.org

تھا، جو بعد میں نہ صرف محدود اور وقتی تحریروں بلکہ اہم موضوعات پر تحقیقی اور تقابلی مطالعے میں بہت کام آیا اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت اکبر الہٰ آبادی اور مغربی تہذیب پر "تنقید ومقابلہ" کے موضوع پر عربی میں ایک مستقل کتاب قاہرہ سے شائع ہوئی (۱)۔

جہاں تک مولانا کے برادر زادۂ عزیز بلکہ روحانی وفکری فرزند حکیم حافظ مولوی عبدالقوی صاحب دریابادی (عرف آفتاب میاں) کا تعلق ہے، ان سے تعارف جہاں تک یاد ہے سب سے پہلے ۲۷-۱۹۲۶ء میں اس وقت ہوا، جب وہ ہمارے عربی کے اصل استاد اور محسن ومربی شیخ خلیل بن محمد عرب (۲) یمنی بھوپالی سے پڑھنے کے لیے بازار جھاؤلال کی گلی (جواب محمد علی لین کہلاتی ہے) میں واقع ان کے مکان میں جو لکھنؤ یونیورسٹی کے اوقات کے علاوہ جہاں وہ لکچرر تھے، عربی زبان وادب کا نہ صرف ایک مدرسہ بلکہ عربی زبان کا ایک بولتا اور چلتا ہوا ماحول تھا، میں عربی پڑھنے کے لیے آنے لگے، وہ قرآن مجید حفظ کر چکے تھے، اور اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ یا دریاباد میں حاصل کر چکے تھے، وہاں ان سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا، اور اس تعارف وموانست کے لیے اتنی بات کافی تھی کہ وہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے بھتیجے ہیں، ان کے والد محترم مولوی عبدالمجید صاحب ڈپٹی کلکٹر سے بھی بھائی صاحب مرحوم کے تعلقات تھے، عمروں کے تقارب نے بھی ربط وتعلق پیدا ہونے میں مدد کی، شیخ خلیل عرب صاحب کے مکان کی پشت پر چند قدموں کے فاصلے سے بھائی صاحب کی رہائش گاہ تھی، جہاں ہم لوگ رہتے تھے (۳) تعلیم عرب صاحب کے بالاخانے پر ہوتی تھی، اکثر ایسا ہوتا کہ ہم دونوں اتر کر عرب صاحب کے مکان کے عقبی حصے کی دیوار کے نیچے کھڑے ہوجاتے اور دیر تک باتیں

---

(۱) جس کا نام الحضارة الغربية الوافدة وأثرها في الجيل المثقف كما يراه الشاعر الهندي الكبير لسان العصر السيد أكبر حسين الاله آبادی ہے۔

(۲) شیخ کے حالات اور اصل تعارف کے لیے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" کی پہلی جلد کا تعارفی مضمون جو انھیں کے نام کے عنوان سے ہے۔

(۳) بعد میں بھائی صاحب یہاں سے منتقل ہوکر گوئن روڈ پر واقع اس بڑے مکان میں چلے گئے جہاں والد ماجد حکیم مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کی عمر کا بڑا حصہ گزرا اور وہیں ۲ر فروری ۱۹۲۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کرتے، اس گفتگو کا عمومی و مکرر موضوع مولانا محمد علی جوہر (جو اس وقت تحریک خلافت کے قائد اعظم اور رئیس الاحرار تھے، اور جن کا نام اور عقیدت رائج الوقت سکہ کی طرح رواں دواں تھی) کا تذکرہ اور ان سے عقیدت کا اظہار تھا، مولانا عبدالماجد صاحب کا ان سے عقیدت مندانہ ہی نہیں ارادت مندانہ اور فکری اشتراک ہی نہیں عملی تعاون اور رفاقت کا تعلق تھا، اس کے برخلاف راقم اس وقت مولانا ظفر علی خاں مدیر ''زمیندار'' کا نہ صرف معتقد بلکہ ان کی شاعری اور ذہانت سے مسحور تھا، اس وقت ان کا اخبار ''زمیندار'' جو لاہور سے نکلتا تھا، اور اردو کے مشہور ترین اخبارات میں تھا، یا مقبول ترین اخبار تھا، ہمارے یہاں آتا تھا، اس کے سنڈے ایڈیشن کے پہلے صفحہ پر اکثر اور شاید بلا تخلف ان کی کوئی نظم ہوتی جو جادو کا سا اثر رکھتی، میں پہلے اپنے گھر میں ابتدائے عمر ہی میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی مرتب کی ہوئی اردو کی نصابی کتاب ''سفینۂ اردو'' پڑھ چکا تھا، ان کی اس میں دو نظمیں ''راجہ دسرتھ کی کہانی'' اور حیدرآباد کے دریا موسی ندی کے طوفان پر ایک نظم نے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا، اس کے بہت سے شعر یاد تھے، ابتدائے عمر میں شاید کسی شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا، جتنا اس بلبلِ خوش نوا اور شاعرِ سحر بیان سے، اور اس میں اس ادبی ذوق کو بھی دخل تھا، جو خاندانی ورثے کے طور پر ملا تھا (۱)، ہم لوگ دیر تک اس مکالمے اور تقابلی بحث میں مصروف رہتے، اور ہم میں سے کوئی اپنے خیال سے دست بردار نہ ہوتا، لیکن اس گفتگو میں حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم کے مطالعے کی وسعت اور تنوّع اور دلائل کی قوت کا پلڑا بھاری رہتا، اسی زمانے میں انھوں نے اپنے عم فاضل و محترم کی بعض تحریریں اور خلافت کے جلسوں کے بعض خطبہائے صدارت اور خطبہائے استقبالیہ پڑھنے کو دیئے، اور رفتہ رفتہ مولانا محمد علی مرحوم کی عقیدت و عظمت میں اضافہ ہوا (۲)۔

---

(۱) والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ، اردو کے نہ صرف ادیب و مؤرخ بلکہ شعر و شاعری کے بھی بڑے نقاد تھے جس کی شاہد ان کی تصنیف ''گل رعنا'' ہے، دادا صاحب مولوی حکیم سید فخر الدین صاحبؒ فارسی کے بڑے ادیب و انشاء پرداز فارسی کے غالباً اولین انسائکلو پیڈیا و دائرۃ المعارف ''مہر جہانتاب'' کے مصنف اور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔

(۲) جس کا گواہ راقم کا وہ مضمون ہے جو ''پرانے چراغ'' کے حصۂ دوم کی زینت اور اس کا پہلا مضمون ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

پھر وہ وقت آیا کہ بھائی عبدالقوی صاحب کی طب کی تعلیم شروع ہوئی، ان کے خاندان کے متعدد افراد و بزرگ نامور طبیب تھے، اور طب اس وقت ایک شریفانہ اور قابلِ احترام معاش اور خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور وہ علمی ذوق اور دینی مشاغل کے ساتھ جمع ہو جاتا تھا، بھائی صاحب مرحوم سے انھوں نے طب کی کوئی کتاب پڑھنی شروع کی، یہاں پر یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ بھائی صاحب مرحوم کم سخنی میں امتیاز خاص رکھتے تھے، غالباً نہ انھوں نے نام پوچھنے کی ضرورت سمجھی، نہ بھائی عبدالقوی صاحب کے والد ماجد یا عم محترم نے (جنھوں نے ان کو تعلیم کے لیے بھائی صاحب کے سپرد کیا تھا) نام بتایا، اور نام بتایا بھی ہوگا تو عبدالقوی بتایا ہوگا، مگر ان کے گھر کی عرفیت آفتاب میاں تھی، حکیم صاحب ہی نے یہ لطیفہ سنایا کہ ان کے والد ماجد ڈپٹی عبدالمجید صاحب یا عم نامدار مولانا عبدالماجد صاحب بھائی صاحب سے ملنے آئے اور انھوں نے بے تکلف پوچھا کہ آفتاب کا کیا حال ہے؟ یعنی وہ پڑھنے میں کیسا ہے؟ اور ان کو طب سے مناسبت ہو رہی ہے یا نہیں؟ بھائی صاحب نے جو ان کے عرف سے واقف نہیں تھے، بے تکلف جواب دیا کہ "مجھے علم نجوم میں کوئی دخل نہیں ہے، وہ سمجھے کہ وہ آفتاب عالم تاب (شمس) کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ نہیں میں آفتاب سلّمہٗ کے متعلق پوچھتا ہوں جن کو آپ پڑھاتے ہیں، تب بھائی صاحب نے ان کے متعلق اپنا تأثر اور اطمینان ظاہر کیا (۱)۔

اسی زمانے میں ہم لوگوں کو جو متقارب السن تھے، ہاکی کھیلنے اور ہاکی کے ٹورنامنٹ اور میچ دیکھنے کا شوق بلکہ (Hobby) پیدا ہوئی، ہاکی کھیلنے میں ہمارا، ان کا اور برادر عزیز و مکرم مولوی سید ابوبکر صاحب حسنی کا اکثر ساتھ ہوتا تھا، ابوبکر صاحب تو بعد میں ہاکی کے بڑے ممتاز کھلاڑی ثابت ہوئے، اور لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیم میں بڑے بڑے میچوں میں شریک ہونے لگے، حکیم صاحب کو کرکٹ سے بھی دلچسپی ہوئی، اور خاص طور پر

---

(۱) بعض تحریروں سے معلوم ہوا کہ انھوں نے شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب سے بھی طب کی بعض کتابیں پڑھیں اور ان سے استفادہ کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے ایمپائر کا فرض انجام دینے کی بڑی مہارت پیدا ہوئی اور وہ کرکٹ کے بعض بڑے بڑے ٹورنامنٹ اور میچوں کو دیکھنے کے لیے دور دور کا سفر بھی کرنے لگے۔

لکھنؤ میں طب کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے قائم کردہ طبیہ کالج دہلی چلے گئے اور وہاں سے فراغت حاصل کی، ان کے اس زمانے کے ایک رفیق درس حکیم محمد نعیم صاحب کیرانوی بھی تھے جو مہتمم و ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی مکی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، وہ جدہ میں مدرسہ صولتیہ کی طرف سے قائم کی ہوئی منزل حجاج کے عرصے تک منتظم رہے، جو جدہ میں ہندوستانی حجاج کی واحد باوقار اور آرام دہ فرودگاہ تھی، اور ہم لوگوں کا بھی اس میں ٹھہرنا ہوتا تھا، وہ ہمیشہ حکیم صاحب کے بارے میں بڑی محبت سے پوچھتے اور سلام کہلواتے۔

حکیم صاحب نے طب سے فراغت کے بعد انگریزی تعلیم بھی پوری کرلی اور انگریزی میں B.A. کی ڈگری حاصل کی، ان کے عم نامدار جب تک باحیات رہے، وہ ان کے معاون خاص، ان کے مسوّدات کے (جن کا ہر ایک کے لیے پڑھنا آسان نہیں تھا) ناقل و کاتب اور ان کے قوتِ بازو رہے، راقم کا جب دریاباد جانا ہوتا (جو علمی ضرورتوں اور مولانا کی شفقتوں کی بنا پر بار بار پیش آتا) تو حکیم صاحب ہی اس کے معاون و رہبر اور مولانا کے قیمتی کتب خانے سے استفادہ کرنے میں معین و مددگار ہوتے، اور ان کی وجہ سے وہاں کے قیام میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوتی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ مولانا کی متعدد کتابوں ''آپ بیتی'' ''خطوط کے مجموعوں'' اور سب سے بڑھ کر مولانا کی انگریزی اور خاص طور پر بے نظیر اردو تفسیر کے تصحیح و مقابلے اور اس کو طباعت کے لیے تیار کرنے کا کارنامہ ہے، جو بھلایا نہیں جاسکتا۔

مولانا دریابادیؒ کے انتقال کے بعد عرصے تک انھوں نے رسالہ ''صدق'' کو جاری رکھا، جو ہر ایک کے بس کا کام نہ تھا، اس کے لیے اسی دبستان کے ادبی و فکری ساختہ پرداختہ کی ضرورت تھی، جو اس کے معیار اور طرزِ خاص کو بحدِّ امکان قائم رکھے ''صدق'' کے سب

www.abulhasanalinadwi.org

قدردانوں کی خواہش تھی کہ یہ پرچہ جاری رہے، لیکن پورے مالی تعاون کے نہ ملنے اور مصارفِ طباعت کے اضافے اور ترقی نے اس کے بند کرنے پر مجبور کیا۔

جولائی ۱۹۷۰ء کی آخری تاریخوں میں شہر مدراس کے ایک مخیّر و معزز تاجر الحاج ٹی عبدالواحد صاحب (سابق ایم-پی) نے مولانا کو قرآن مجید کے کسی موضوع پر خطبات دینے کی دعوت دی، مولانا اپنے رفیق عزیز حکیم عبدالقوی صاحب کے ساتھ مدراس تشریف لے گئے، حاجی صاحب نے صدارت کے لیے اس نااہل کا انتخاب کیا جو مولانا کی نسبت سے نہ صرف ایک بڑا اعزاز تھا، بلکہ "وضع الشيئ في غير محله" کا مصداق، مولانا نے "مشکلات القرآن"، "قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" کے عنوان سے نیو کالج مدراس کے وسیع ہال میں ۲۸؍جولائی ۱۹۷۰ء سے یکم اگست ۱۹۷۰ء تک مقالات پڑھے(۱) مولانا کا نام سن کر نہ صرف شہر مدراس بلکہ بنگلور، میسور تک کے اہل ذوق علماء و فضلاء، جدید دانش گاہوں کے اساتذہ وطلبہ، اور مولانا کے عقیدت مند اور نادیدہ مشتاق جمع ہوجاتے تھے، شاید اس سے پہلے بہت عرصے سے یہ وسیع ہال شائقین سے اس طرح نہ بھرا ہوگا، جیسا کہ اس موقعہ پر وہ بھرا پُرا نظر آتا تھا، مولانا اور ان کے رفیقِ سفر مولوی حکیم عبدالقوی صاحب اور مولانا کے ایک معتقد اور قدرداں الحاج بہاء الدین صاحب حیدرآبادی کا اور اس عاجز اور اس کے دو رفیقوں (مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اور عزیزی مولوی نثارالحق ندوی) کا قیام بھی حاجی صاحب کی کوٹھی میں رہا اور اس طرح مولانا اور ان کے رفیق عزیز اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی وفات کے بعد بھی حکیم صاحب سے رفاقتِ قدیم، صغرسنی میں تعارف اور بہت سے علمی، ذوقی، اور فکری رشتوں کے اشتراک اور قُربِ مکانی کی وجہ سے برابر ربط رہا، وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں جس کا یہ راقم

---

(۱) ان مقالات یا خطبات کا مجموعہ ٹی عبدالواحد اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع ہوگیا ہے، اور ۱۹ او پیری ہائی روڈ مدارس ۳ سے مل سکتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ناظم، اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی ورکنگ کمیٹی میں جس کا یہ عاجز صدر ہے، شریک ہوتے تھے، اور اتحادِ خیال اور اشتراکِ عمل کا سلسلہ جاری تھا، اور یہ نہیں معلوم تھا، کہ مفارقت کا زمانہ قریب ہے، کئی سال سے ان کی قیام گاہ خاتون منزل میں جو مولانا عبدالماجد صاحب کے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں بھی ان کے قیام، ملاقات اور مجلسوں کی جگہ تھی، راقم کے کچھ عزیز افراد خاندان نے بھی دو مکان بنا لیے، یہاں سالہا سال دارالعلوم ندوۃ العلماء (اپنی مستقل عمارت واقع بادشاہ باغ کی تعمیر سے پہلے) قائم رہا، اور یہیں سے اس کے متعدد مایۂ نازل فرزند اور قابل فخر فضلاء پڑھ کر نکلے جن میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا پروفیسر عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی کاکوروی انسپکٹر مدارس عربیہ، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی پڑھ کر نکلے، جنھوں نے ندوے کا نام روشن کیا، اپنے عزیزوں کی قیام گاہ ہونے کی وجہ سے خاتون منزل اپنا بھی گھر ہو گیا، اور وہاں جلد جلد آنے جانے اور کبھی کبھی رات گزارنے کا موقع ملا۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ایک دن جب خاتون منزل گیا تو اچانک معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سخت علیل ہیں، اور بلرام پور ہاسپٹل جو گولہ گنج اور ندوے کے راستہ پر واقع ہے، داخل ہیں، راقم ان کے برادر خورد اور نامور پروفیسر محمد ہاشم قدوائی (سابق صدر شعبہ سیاست مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و حال ممبر راجیہ سبھا) کی معیت میں حکیم صاحب کی عیادت کے لیے گیا، حکیم صاحب اس وقت ایک غیر شعوری حالت میں تھے، معلوم نہیں پہچان سکے کہ نہیں، لیکن ان کی زبان متحرک تھی، اور تیمارداروں سے معلوم ہوا کہ ان کی زبان سے تلاوت و ذکر سنا گیا، راقم ان کی عیادت اور زیارت کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء چلا گیا، جہاں لکھنؤ میں مستقل قیام رہتا ہے، چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ حکیم صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، نماز جنازہ کی امامت کی خدمت بھی ان کے اسی رفیق و محبّ کو ادا کرنی پڑی، بعد نماز مغرب دارالعلوم کی مسجد میں تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں قدرۃً اسی عاجز کو تعزیتی تقریر کرنا پڑی کہ اس سے زیادہ اس مجمع میں ان کے حالات سے واقف اور اس

www.abulhasanalinadwi.org

حادثے سے متاثر اور حزین شاید کوئی دوسرا نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور ان کو اپنے اسلافِ کرام اور خادمین اسلام کی صف میں جگہ دے، اور ان کے برادران، فاضل وعزیز، برادرزادوں اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحبؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی یونین "جمعیۃ الاصلاح" ادھر چند سال سے توسیعی خطبات کا انتظام کرتی ہے کہ جن سے طلبہ کی معلومات میں اضافہ اوران کی فکر ونظر میں وسعت اور عمق پیدا ہو، اوران میں مزید مطالعہ اور غور وفکر کی تحریک ہو، اس مقصد کے لیے ملک کے ان فضلاء اور دانشوروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو وسیع مطالعے کے ساتھ صحیح نقطۂ نظر بھی رکھتے ہوں، اوران کے خطبات ومضامین ذہنی انتشار اور تشکک وارتیاب پیدا کرنے کے بجائے اسلامی عقائد وافکار اور دینی حقائق، نیز اسلام کی افادیت اور انقلاب انگیزی اور حیات آفرینی کی صلاحیت پر مزید اذعان واطمینان پیدا کریں، میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کو بھی اس سلسلے میں زحمت دیں، اوران سے درخواست کریں کہ وہ کسی ایسے موضوع پر جوان کے فکر ومطالعے کا جولان گاہ رہا ہے، ایک خطبہ دیں، ازراہِ تعلق ومحبت انھوں نے عزیز طلبہ کی اس درخواست کو جس میں میری سفارش اور ایماء بھی شامل تھا، منظور فرمالیا اور "اسلامی فکر وتہذیب کا اثر ہندوستان پر" کے موضوع پر ایک فاضلانہ مقالہ تیار کیا جو ۱۱/اپریل ۱۹۸۲ء کو جمعیۃ الاصلاح کے جمالیہ ہال میں طلبہ اور اساتذہ کے ایک بڑے مجمع کے سامنے جس میں شہر کے متعدد اہل ذوق بھی شامل تھے، پڑھا، جو اول سے آخر تک بڑی دلچسپی اور غور وتوجہ سے سنا گیا، اس سے ہندوستانی اسلامی تاریخ کے کئی نئے گوشے سامنے آئے، اور مجھے اس بات کے اظہار میں ذرا تکلف نہیں کہ خود میری معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوا، خاص طور پر فاتح سندھ محمد ابن قاسم ثقفی کے عہد پر نئی روشنی پڑی اور بعض نئی تفصیلات معلوم ہوئیں، جن کا ماخذ اگرچہ مشہور "چچ نامہ" تھا،

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن ان کو نئے انداز سے پیش کیا گیا، اسی طرح ہندوستان کے صوفیۂ کرام نے ہندوستانی معاشرے پر جو انقلاب انگیز اثرات ڈالے، ان کی بھی کئی کڑیاں جو سوانح وملفوظات کے انبار میں دبی ہوئی تھیں ابھر کر سامنے آئیں، صاحب مقالہ کے تمام نتائج فکر سے اور خاص طور پر ہندوستان کے اہل ذمہ کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، سوفی صدی اتفاق تو مشکل ہے اور ضروری بھی نہیں، لیکن مقالہ نہ صرف معلومات اور مواد سے مملو ہے، بلکہ فکر انگیز اور اس سے آگے بڑھ کر ولولہ انگیز ہے اور اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اور زیادہ تفصیل سے ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد کی تاریخ کا محققانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے، اور اس کے نتائج مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے سامنے پیش کیے جائیں، تاکہ ایک طرف مسلمانوں میں خود اعتمادی اور اسلام کی انقلابی طاقت پر نیا یقین اور اس سے دوبارہ کام لینے کا نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو، دوسری طرف غیر مسلموں کے زاویۂ نگاہ میں وسعت پیدا ہو، اور ان کا نقطۂ نظر اسلامی عہد کی تاریخ کے بارے میں علمی اور حقیقت پسندانہ بن جائے، اور ان میں بجائے شکوہ وشکایت یا تلخی ونفرت کے تشکر وامتنان کے جذبات پیدا ہوں، یہ بات ملک کے وسیع تر مفاد میں ہوگی اور اس سے ”بقائے باہم“ کے نیک مقصد کو تقویت حاصل ہوگی جس کے لیے مثبت و مستحکم علمی وفکری بنیادوں کی ضرورت ہے اور اس طرح کی تحقیقاتی اور علمی کوششیں اس میں قابلِ قدر اور مستحقِ ستایش ہیں۔

مئی ۱۹۸۳ء کے اوائل کی کوئی تاریخ تھی کہ فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کا اچانک خط ملا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں جو برطانیہ کی عظیم ترین اور دنیا کی مشہور یونیورسٹی ہے ایک اسلامی مرکز (Islamic Centre) کے قیام کو سوچا جا رہا ہے، پروفیسر خلیق احمد صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر فرحان احمد نظامی جو اس وقت یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل میں مشغول تھے، اس کے خاص محرک اور اس کے لیے ساعی تھے، یہ یونیورسٹی کی سات سو سال کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ اسلام کے مطالعے، اس پر بحث وتحقیق اور اس سے فضلائے مغرب اور طالبین حق کو روشناس کرنے

کے لیے اس خالص مسیحی، علمی و تعلیمی ماحول و مرکز میں ایک سنجیدہ قدم اٹھایا جارہا ہے، اس تحریک میں St Cross College کے استاد اور وائس پرنسپل Dr. DG. Browning (جن سے ڈاکٹر فرحان نظامی کا خاص ربط و تعلق رہا ہے) پیش پیش ہیں، ڈاکٹر براؤننگ کی شدید خواہش ہے کہ آپ اس کار خیر میں شریک ہوں، اس کی تاسیس اور اس کے مقاصد و دستور العمل کی ترتیب میں مدد دیں، اور ''اسلام و مغرب'' کے عنوان پر مقالہ بھی پڑھیں۔ میں نے اس دعوت کو قبول کرلیا، اور مقررہ تاریخوں میں جن میں میرے لیے پہنچنا مشکل تھا، تھوڑی سی تبدیلی چاہی، ڈاکٹر براؤننگ نے اس کو قبول کرلیا۔

۱۶، ۱۷، ۱۸ار ربیع الاول ۱۴۱۱ھ ، ۷، ۸، ۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو حمد و مناجات کے موضوع پر رائے بریلی میں مولانا محمد ثانی حسنی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کی دعوت پر اور اس کے زیر اہتمام رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) کا چھٹا سیمنار منعقد ہوا، جو اس نوخیز عالمی تنظیم کی تاریخ میں خاص اہمیت اور خصوصیت رکھتا ہے، راقم السطور کو جس کو اس تنظیم کی صدارت کا شرف حاصل ہے رائے بریلی سے وطنی تعلق رکھنے اور اس شہر کے حالات، اور وسائل و امکانات سے واقف ہونے کی بنا پر اس میں بڑا شبہ تھا کہ یہ سیمنار اپنی سابقہ روایات کے شایانِ شان کامیاب ہوگا اور یہ اس مذاکرہ کے لیے (جس کا موضوع بھی بڑا مہتم بالشان اور اہمیت و عظمت کا حامل ہے) موزوں و مناسب مقام ہے، راقم نے اس تاریخی اور نادر الوقوع موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ یہ مجلس مذاکرہ اس شہر میں منعقد ہورہی ہے جس کو تیرہویں صدی ہجری کے مجاہد اعظم اور مجدد وقت حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے وطن اور مولد ہونے کا فخر حاصل ہے اپنے قابل احترام کرم فرما مہربان اور اس زمانے میں برصغیر ہندو پاک کی عظیم دیدہ ور مؤرخ فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس موقع کے لیے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ پر ایک تعارفی و تحقیقی مقالہ سپرد قلم فرمائیں اور اس مذاکرے کو اس سے زینت بخشیں جس سے ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اس اہم مذاکرے کے لیے رائے بریلی کا انتخاب

www.abulhasanalinadwi.org

کچھ بے جا و بے محل نہیں ہے کہ سید صاحب کی دعوت وتحریک، عبودیتِ خالصہ، انابت الی اللہ، تعلق باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ پر مبنی تھی، جس کا قلبی ترجمان اور اس کا خارجی نشان حمد و مناجات ہی ہے، اور اس تحریک نے لاکھوں انسانوں میں رجوع الی اللہ، استعانت باللہ، شب بیداری، اور دعا حمد و مناجات ایسا عمومی ذوق پیدا کر دیا تھا جس کی مثال اصلاح وتجدید اور جہاد فی سبیل اللہ کی تاریخ میں بھی تلاش وجستجو سے ملتی ہے، پروفیسر صاحب نے اس تعلق کی بنا پر جوان کو اس تحریک ودعوت اور اپنے اس نیاز مند سے ہے یہ فرمائش پوری کی ان کو عرصے سے رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہ (جو حضرت سید صاحبؒ کی جائے پیدائش اور سفر ہجرت و جہاد تک ان کی کوششوں اور تعلیم وتربیت کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے) آنے اور دیکھنے کا شوق تھا اور اس کے لیے اس سے بہتر موقع ملنا مشکل تھا، وہ اس سیمنار کے موقع پر ایک دن پہلے ہی تشریف لائے اور اپنا مقالہ مذاکرے کے افتتاحی جلسے میں پڑھا جس میں سید صاحبؒ کی دعوت وتحریک کے عمیق ووسیع اثرات، جہاد فی سبیل اللہ اور ہندوستان کو ''بیگانگانِ بعید الوطن اور تاجرانِ متاع فروش'' اور ''نصارائے نکوہیدہ خصال'' کی غلامی سے آزاد کرانے میں ان کی جدوجہد اور اس کے دوررس اثرات کا مؤرخانہ جائزہ لیا گیا ہے اور غیر مسلم ملکی اور غیر ملکی مورخین کی اس سلسلے میں شہادتیں اور اعترافات پیش کیے گئے ہیں، جن پر ایک وسیع النظر، وسیع المطالعہ اور انصاف پسند مؤرخ ہی کی نظر پڑ سکتی ہے۔

مذاکرے کا افتتاحی جلسہ ۱۶ ربیع الاول، ۷ اکتوبر کو نیشنل انٹر کالج کے وسیع وعریض میدان میں شامیانے کے نیچے ہوا جو حاضرین اور سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور یہ منظر رائے بریلی کی مسلمان آبادی اور اس کے علمی، ادبی مرکزوں اور سرگرمیوں سے دور اور علیحدہ ہونے کی بنا پر تعجب خیز بھی تھا اور مسرت انگیز بھی، اس مجمع میں خاصی تعداد غیر مسلم تعلیم یافتہ حضرات اور شہر کے انتظامیہ کے نمائندوں کی بھی تھی، اس سیمنار میں شرکت کے لیے ہندوستان کی جامعات اور مختلف علمی مراکز کے علاوہ عالم اسلام کی ممتاز علمی وادبی شخصیتوں نے شرکت کی، جن میں مشہور صحافی ومقالہ نگار اور مملکت سعودی عرب

www.abulhasanalinadwi.org

کی مجلس شوری کے رکن شیخ احمد محمد جمال، شاعر طیبہ (مدینہ منورہ) ضیاء الدین صابونی، جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض کے کلیۃ العلوم الاجتماعیہ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالحلیم عُویس، رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے ایک شعبہ کے ذمہ دار محمد محمود الحافظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ممالک عربیہ کے مندوبین نے اپنے کلمات اور تأثرات پیش کیے اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ ان کو اس سیمنار میں شرکت کے توسط سے دعوت و تبلیغ، جہاد فی سبیل اللہ اور علم و تصنیف کے اس مرکز میں آنے کی سعادت حاصل ہوئی، پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنا فاضلانہ ومؤرخانہ مقالہ انتخاب واختصار کے ساتھ پڑھا جس کو لوگوں نے شوق وقدر کے ساتھ سنا۔

۱۶، ۱۷ ر مارچ ۱۹۹۷ء کو عزیز گرامی قدر پروفیسر محمد یونس نگرامی (لکھنؤ یونیورسٹی) وچیئرمین اردو اکیڈمی لکھنؤ کے منشأ اور دلچسپی اور ان کی تحریک اور قدردانی کی بنا پر والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی پر ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد ہوا، جس میں ان کے مابہ الامتیاز منفردانہ اور بے نظیر یا قلیل النظیر تاریخی وتحقیقی خدمات اور امتیازی کمالات پر روشنی ڈالی گئی، اس سیمنار میں دانش گاہوں، مدارس اور جامعات (یونی ورسٹیز) اور علمی وتحقیقی مجالس اور اکیڈمیوں کے اچھی تعداد میں فضلاء، تحقیقی کام کرنے والے اور اہل قلم شریک ہوئے جن میں فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) سعودی عرب کے وزیر امور دینی ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی کے نمائندہ احمد عبداللہ خلیفہ، ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے سابق پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (حال معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان فضلاء کے علاوہ مرکزی وزیر راجیش پائلٹ، صوبہ کی حکومت کے سربراہ اعلیٰ (گورنر اتر پردیش) رومیش بھنڈاری بھی قابل ذکر ہیں، مندوبین کے علاوہ شہر کے معززین کی ایک تعداد بھی شریک ہوئی، سیمنار میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کا فاضلانہ مقالہ ''علامہ حکیم سید عبدالحیؒ، اساسِ فکر و علمی کارنامے'' خاص طور پر ایک بصیرت افروز، فکر انگیز مقالہ تھا، جس میں

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے خاندان (خاندان حضرت سید احمد شہیدؒ) پر تاریخی روشنی ڈالی گئی اور اس کی اصلاحی، دعوتی، مجاہدانہ و علمی کارناموں کا تعارف کرایا گیا، پھر "نزہۃ الخواطر" (۱) کی آٹھ جلدوں پر علمی و حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا، اور کہا کہ اس کتاب نے ہندوستان کی علمی وثقافتی تاریخ کی ایک زبردست کمی کو پورا کیا ہے۔

پروفیسر صاحب مرحوم جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور فضلائے عہد میں اپنے مطالعے کی وسعت ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سے واقفیت، اس کے دینی وروحانی رہنماؤں (مشائخ وسالکین اور روحانی مربیوں) کی تاریخ پر عبور و تحقیق کے لحاظ سے راقم کے علم میں اس وقت اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، تعلیمی و منصبی لحاظ سے بھی وہ اہم منصبوں پر فائز رہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ تاریخ کے صدر، کچھ عرصہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، اس سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے اپنا سارا وقت اور توانائی ہندوستان کے اسلامی عہد اور اصلاحی ودعوتی تاریخ کے اہم ترین رہنماؤں اور مصلحین ومربیوں کے تعارف اور تذکرہ میں صرف کی، جس کا بہترین نمونہ ان کی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" ہے، سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سے ان کا ایک خاندانی تعلق بھی تھا، اور ذہنی ربط بھی، اس کے علاوہ اور بھی ان کے علمی کارنامے اور خدمات ہیں۔ علمی وتاریخ مذاکرات اور فکر ونظر کے جلسوں میں وہ سرگرمی سے حصہ لیتے تھے اور اپنے بیش قیمت معلومات اور وسیع وعمیق مطالعے سے فائدہ پہنچاتے تھے، جن میں سے بعض کا ذکر آچکا ہے۔

راقم سے وہ گہرا عزیزانہ ومحبانہ تعلق رکھتے تھے اور اس کو ان سے بڑی مناسبت تھی، آکسفورڈ یونیورسٹی کے "اسلامک اسٹڈیز سنٹر" کے جوان کے فرزند گرامی قدر پروفیسر فرحان احمد نظامی صاحب کا قائم کیا ہوا ہے وہ رکن تھے، اور یہ راقم بھی، وہاں اکثر ان کا ساتھ اور یکجائی قیام رہتا تھا، لندن کے قیام کے وہ خوش گوار اور دلچسپ ترین اوقات تھے جن میں

(۱) کتاب کا پورا نام "نزھة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" ہے اب "الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام" کے نام سے دار عرفات رائے بریلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس راقم اوران کی یکجائی اورتنہائی ہوئی تھی، اس وقت ان کے علمی مذاکرہ اور معلومات سے لطف اندوز ہونے کا بڑا موقع ملتا تھا اور وہ وہاں کے خوش گوارترین لمحات ہوتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور لکھنؤ میں جو علمی مجالس وتقریبات ہوئیں ان میں بھی وہ بہت شوق اور دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے اور اپنی معلومات اور مطالعے سے فائدہ پہنچاتے۔

بعض عرب ممالک میں اپنے ملک کی سفارت پر بھی رہے اور وہاں بھی ان کی سادگی اور علمی ذوق قائم رہا، ان کے مکان اور جائے قیام علی گڑھ میں ان کا ایک بڑا وسیع کتب خانہ تھا، جو ذاتی طور پر بہت کم لوگوں کے یہاں دیکھنے میں آیا، سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھنے کے ساتھ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ اوران کی دعوت وتحریک اور سلسلے سے بھی عقیدت رکھتے تھے، اور اس کا اعتراف واحترام تھا، اس موضوع پر ایک باقاعدہ سیمنار میں انھوں نے ایک توسیعی خطبہ دیا۔

پروفیسر صاحب کے ماموں مولانا نسیم احمد صاحب فریدیؒ ہندوستان کے آخری دور کی دینی وروحانی تاریخ اوراس کے ممتاز ترین داعیوں اور مربیوں کی تاریخ سے امتیازی اور نمایاں طریقہ پر نہ صرف واقف بلکہ اس کے ماہرین اوراہل اختصاص میں سے تھے پروفیسر صاحب نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا اوران میں ان کا اثر آیا۔

فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی اپنے خاندان (فریدی ونظامی) اوراس کے عقیدت مندوں اوراس کے روحانی وعلمی انتساب رکھنے والوں ہی کے شکریے کے مستحق نہیں، بلکہ ہندوستان کی علمی واسلامی تاریخ کے شائقین اور قدردانوں، جمال وکمال، وضعداری، اصول پسندی، شرافت خاندانی وحفاظت نسبی اورانسانی اوصاف کے تمام قدردانوں کے بھی شکریہ واعتراف کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے ہندوستان کے نامور فریدی خاندان کی تاریخ اوراس کی شخصیتوں کے تعارف اور عہد بعہد اس کے ناموروں اور اس کے ممتاز افراد کے کارناموں، خدمات، خصوصیات، طرز زندگی، باہمی تعلقات اور خدمات دینی وعلمی وملکی کا ایک وسیع اور کئی جلدوں پر حاوی دفتر پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس

سے نہ صرف خاندان کی نامور شخصیتوں کے محاسن اور خصوصیات پر نظر پڑتی ہے، بلکہ ضمنی طور پر عہد قدیم کے حالات، طرز معیشت، معیار زندگی، کسب معاش کے ذرائع اور وضعداریاں سامنے آجاتی ہیں، جو کسی ملک کی عام تاریخ میں نہیں مل سکتیں، اس سلسلہ تاریخ کی جلد اول ''نگاہ فقر'' کے نام سے موسوم کی گئی ہے، جس کو مرشد عظیم و مربی گرامی حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر کے تذکرہ سے معمور ومزین ہونے کا فخر حاصل ہے۔

۶/دسمبر ۱۹۹۷ء کی تاریخ تھی کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے سفر آخرت کیا معلوم ہوا کہ ۵/دسمبر کو جمعہ کی نماز پڑھ کر وہ دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے گھر گئے کچھ ہی دیر بعد حرکت قلب بند ہوجانے سے وہ اپنے رب کے حضور جا پہنچے، غفر اللہ له و رفع درجاته۔

ان کی وفات ایک بڑا علمی سانحہ ہے بظاہر ان کا کوئی بدل اور ان کا ہم پایہ کوئی مؤرخ وسوانح نگار نظر نہیں آتا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجے بلند کرے۔

ان کے علمی امتیاز، تصنیفی و تحقیقی خدمات، کارناموں پھر ذاتی ربط ومناسبت اور سالہا سال کے تعلقات، مؤدت ومناسبت کی بنا پر اس اطلاع کا قلب واعصاب پر اثر پڑا، یہ بھی ایک طرح کا حسن اتفاق اور ان کے حق میں ایک فال نیک تھی، کہ اس وقت ان کا دلی قدرداں اور محب (راقم سطور) مکہ معظمہ جارہا تھا، اس نے ان کی مغفرت وثواب کے لیے حرم شریف میں دعا بھی کی اور بیت اللہ کا ایک طواف بھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی جے پوریؒ

ہر صاحب نظر اور قدر شناس کو اہلِ فضل و کمال اور اپنے محسنین و محبین کے تذکرے اور ان کے بارے میں اپنے تأثرات و تجربات کو قلم بند اور محفوظ کرنے میں مسرّت اور بعض اوقات عزّت حاصل ہوتی ہے، لیکن کسی روشن زندہ اور تابندہ چراغ کو ''پرانے چراغوں'' میں شامل کرنا (خواہ اس کی کتنی ہی ضرورت اور افادیت ہو) ایک دشوار اور ناخوش گوار فریضہ معلوم ہوتا ہے، پھر جب وہ چراغ ایک ''چراغِ ہدایت'' (۱) ہو۔

یہی معاملہ زیرِ تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی جے پوری کا ہے، جن کو آج دل تھام کر ''پرانے چراغ'' کی زیرِ تالیف تیسری جلد کی زینت بنانا ہے، اور جن کی وفات ۲۲؍رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۵؍جنوری ۱۹۹۴ء کو بمبئی میں ہوئی، جہاں وہ زیرِ علاج تھے، اور یوم جمعہ ۲۴؍رجب ۱۴۱۴ھ (۷؍جنوری ۱۹۹۴ء) کو بوقت ۵ بجے تکیہ شاہ مسکین جے پور میں تدفین عمل میں آئی، ناچیز راقم سطور کو اپنے قیامِ بمبئی میں دو مرتبہ اسپتال جا کر ان کی عیادت کا شرف حاصل ہوا، اور انھوں نے اپنے خصوصی تعلق اور شفقت کی بنا پر اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، یہ معلوم نہیں تھا کہ قریب ہی عرصے میں یہ چراغ جو پورے طور پر روشن و تاباں تھا، اور جس سے خاص طور پر گجرات و مہاراشٹر میں دور دور تک روشنی پھیلی تھی، اور بہت سے گھر اور خانوادے عقیدۂ صحیحہ اور ذکرِ الٰہی اور توبہ و انابت کے نور سے منور

---

(۱) حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے دادا کا (جن کے وہ صحیح جانشین تھے) حضرت شاہ ہدایت علی صاحب نام تھا، جن کی پیدائش ۱۲۷۷ھ میں رام پور میں ہوئی، وہ حضرت محمد علی شیر خاں صاحب نقشبند مجددی کے مرید و مجاز تھے، جن کا سلسلہ بارہ واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ تک پہنچتا ہے، شاہ صاحب متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جو تمام تر حضرت مجدد صاحب یا ان کے خاندان و خلفاء سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں اہم کتاب ''انتخاب مکتوبات امام ربانی قدس سرہ'' مطبوعہ حیدرآباد ہے، آپ نے جے پور میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا اور وہیں ۱۷؍جمادی الثانیہ ۱۳۷۰ھ (مطابق ۱۹۵۰ء) میں بہ عمر ۹۳ سال وفات پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ ورفع درجاتہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

و معمور ہوئے تھے ''پرانے چراغوں'' میں شامل ہو جائے گا، اور اپنے جد امجد سے جو خود ایک چراغِ ہدایت تھے جا ملے گا'' و کان أمر اللہ قدرا مقدورا''۔

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے اول اول کب اور کہاں تعارف ہوا، یہ تو اس وقت حافظہ میں محفوظ نہیں ہے، لیکن اتنا ضروری ذہن میں تازہ اور نقش ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں ان سے ایسی مناسبت بلکہ موانست محسوس ہوئی جو اپنے خاص سلسلے کے شیوخ یا ان برادرانِ طریقت سے محسوس ہوتی ہے، جو ایک ہی سلسلے سے منسلک یا ایک ہی مرکز علم وفکر سے وابستہ اور اس کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں، یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ شاہ صاحب جب فرنگی محل لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، تو اس ناچیز کے درس قرآن میں (جو غالباً اس وقت لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں ہوا کرتا تھا) شرکت فرمایا کرتے تھے، اور ہفتہ وار تبلیغی اجتماعات میں بھی جو ہر پنجشنبہ کو پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں پھر کچہری روڈ کے تبلیغی مرکز میں ہوتا تھا، شرکت فرمایا کرتے تھے، اور اسی وقت سے ان کو راقم سطور سے ایک مناسبت اور تعلق قلبی محسوس ہوا (۱)۔

خود حضرت شاہ صاحب کو بھی اس پر ایک گونہ حیرت اور مسرت تھی کہ ان کو اس عاجز سے (ایک ہی شیخ طریقت سے منسلک ہوئے اور ہم وطنی اور ہم درسی کے رشتے کے بغیر) کیوں اتنی مناسبت اور اتحاد فکر ہے، غالباً انھوں نے ایک مرتبہ (رائے بریلی تشریف آوری کے موقع پر یا لکھنؤ میں) خود ہی استعجاب کا اظہار کیا اور پھر اس کی وجہ ارشاد فرمائی کہ میں نے رام پور میں (جو شاہ صاحب کا قدیم وطن تھا) بعض قدیم و معمر اعزہ سے سنا کہ میرے نانا صاحب جو بہت عمر رسیدہ اور ضعیف تھے، اپنے مریدین اور خدام سے فرمایا کہ مجھے گھوڑے پر بٹھاؤ اور تھامے رکھو، پھر تلوار منگوائی اور ہاتھ میں لی اور ہلائی، اور فرمایا کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جب حضرت سید صاحب (حضرت سید احمد شہیدؒ مراد ہیں) تشریف لائیں گے اور جہاد کا حکم دیں گے تو میں رفاقت اور شرکت کر سکوں گا، اس سے اندازہ ہوا کہ

(۱) روایت مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظر کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی واقع دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

www.abulhasanalinadwi.org

ان کا تعلق حضرت سید شہیدؒ سے بیعت وارادت کا تھا، اور یہ بات محل تعجب نہیں کہ حضرت سید شہیدؒ کے متعدد وممتاز ترین رفقاء وخلفاء اور آپ کی دعوت وتحریک کے داعی اور شارح رام پور کے تھے، ان میں سے اس وقت مولانا سید محمد علی صاحب واعظ رام پوری، اور مولانا سید حیدر علی صاحب کا نام لینا کافی ہے، سید صاحب کے خلفاء اور مستفیدین کی فہرست میں اور متعدد نام ملیں گے، جن سب کے تذکرے کا یہ موقع نہیں۔

شاہ صاحب کا تعلق اور آپ کی موانست ومناسبت راقم سطور اور اس کے رفقاء، اساتذۂ دار العلوم ندوۃ العلماء سے بڑھتی گئی، اور ہم لوگوں کو بھی آپ کی ذات میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات نظر آئیں جو عام طور پر (استثنا وتخصیص کے ساتھ) عام شیوخِ طریقت اور ان سالکین میں شاذ ونادر پائی جاتی ہیں، جن کی ارادت وعقیدت کا دائرہ وسیع اور متنوع ہوتا ہے، اور خاص طور پر اہل ثروت، تجار کبار، اور دور دراز کے مقامات کے سربرآوردہ اشخاص ان سے منسلک اور وابستہ ہوتے ہیں، جن کی خصوصیات میں توازن واعتدالِ فکر، زمانہ شناسی، حالات سے باخبری اور ہر طرح کے اہل فضل وکمال کی قدردانی اور تواضع وانکسار نفس ہے، بمبئی کے قیام میں جو اس راقم کو اپنے بعض تحریری کاموں کی تکمیل کے لیے یکسوئی اور سکون وخوشگوار موسم کی بنا پر اکثر گرمیوں کے موسم میں اختیار کرنا پڑتا تھا، اور اپنے مخلص دوست اور کریم النفس میزبان الحاج غلام محمد صاحب (عرف محمد بھائی) مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپور کمپنی کی کوٹھی سہاگ پیلس واقع مدن پورہ میں ہفتوں قیام رہتا تھا، حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت کی وسعت اور تنوع اور امتیاز کا اندازہ ہوا، جو احمد آباد، بمبئی، سورت پر محیط تھا، وہاں بھی متعدد بار شاہ صاحب کی زیارت ہوئی، کبھی خود قیام گاہ پر جانے کی سعادت حاصل ہوئی، کبھی انھوں نے اپنی آمد وملاقات سے مُشرّف فرمایا، کئی احباب اور عزیزوں سے (جن میں سے بعض دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور فاضل ہیں اور ان کے خاندان اور اعزہ شاہ صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے ہیں) اس تعلق ووابستگی کے اثرات وبرکات کا بھی اندازہ ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسی مناسبت اور اعتماد و تعلق کا نتیجہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے دو صاحبزادوں عزیز قدر مولوی فضل الرحیم اور مولوی ضیاء الرحیم کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیا، اور انھوں نے وہاں سے فراغت حاصل کی، آخر الذکر دار العلوم سے فارغ ہو کر جامع ازہر گئے اور وہاں سے بھی انھوں نے سند لی۔

لیکن سب سے زیادہ شاہ صاحب کے قرب و اعتماد بلکہ اعزاز کا مظہر اور اس کی شہادت یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جے پور میں جو راجستھان کی راجدھانی اور خود ہندوستان کا ایک تاریخی خوبصورت شہر ہے، اپنے جد بزرگوار حضرت شاہ مولانا ہدایت علی صاحب مجددی کی یادگار میں ان کے نام پر جامعہ ہدایت قائم کرنے کا ارادہ فرمایا، اور اس کے لیے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو تین طرف سے خشک پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی سرسبز وادی ہے (جو حجاز کی پہاڑیوں اور وادیوں کی یاد تازہ کرتی ہے) شاہ صاحب کی یہ ذرّہ نوازی اور کرم گستری تھی کہ اس کی بنیاد رکھنے کے لیے اس عاجز کا انتخاب فرمایا، اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اس ناچیز راقم سطور کو سنگِ تاسیس رکھنے کی عزت بخشی (۱)، پھر وہ دسمبر ۱۹۸۵ء میں اس جامعہ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا، جس میں دوسری ریاستوں کے ممتاز علماء، ماہرینِ تعلیم اور دانشوروں کو دعوت دی گئی، اور اس عاجز کو عام اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب فرمایا، اس موقع پر جب راقم نے اس ''وادی ہدایت'' میں قدم رکھا تو اس منظر کو دیکھ کر کہ پہاڑوں کے درمیان ایک غیر آباد علاقے میں خدا کے ایک مخلص بندہ اور صاحب عزیمت انسان کی عالی نظری اور اولوالعزمی کے طفیل جامعہ ہدایت کی شاندار عمارت کھڑی ہوئی ہے، بے اختیار مولانا اسلم جے راج پوری مرحوم کا یہ شعر زبان پر آ گیا اور اسی سے راقم نے اپنی تقریر کا آغاز کیا ؎

عزم راسخ ہے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

---

(۱) بنیاد رکھنے کے موقع پر کی گئی وہ تقریر ''مدرسہ کیا ہے؟'' کے عنوان سے مصنف کی کتاب ''پاجا سراغ زندگی'' میں دیکھی جا سکتی ہے، ملاحظہ ہو ص ۱۷۹ تا ۲۰۰ مطبوعہ ''مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء، لکھنؤ

www.abulhasanalinadwi.org

اب یہ وادی علم وہدایت بن گئی اور جامعہ کی وسیع ، شاندار اور خوبصورت عمارتوں اور وہاں رہنے والے طلبہ واساتذہ کی وجہ سے جنگل میں منگل کا سماں نظر آتا ہے۔

شاہ صاحب کی اس وسیع النظری، قدر شناسی ، مہماں نوازی اور علمی ذوق کا نتیجہ تھا کہ رابطۂ ادب اسلامی (جس کی بنیاد مکہ معظمہ میں پڑی تھی اور جس کا ایک مرکزی دفتر ریاض میں ہے اور ایک لکھنؤ میں اور جس کی صدارت عامہ کا شرف اس عاجز کو حاصل ہے، اور عزیز القدر مولوی سید محمد رابع ندوی (حال مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) اس کے سکریٹری اور بلاد عجم کی شاخ کے نائب صدر ہیں) کے ایک سیمینار (مجلس مذاکرہ) منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، جس کا موضوع ''اسلامی ادب اور مغربی وادبی تحریکات'' تھا،اس کے لیے ہندوستان کے متعدد مقامات زیر غور آئے، لیکن مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی کی دعوت کی بنا پر (جو ان کی وسیع النظری اور علم پروری کی ایک نشانی تھی) اوران کے احترام میں جے پور کو ترجیح دی گئی،اور ۱۷، ۱۸ ارفروری ۱۹۸۷ء کو وہاں سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا، اس مجلس مذاکرہ میں جامعۃ الامام محمد بن سعود یونیورسٹی کے ادب عربی کے پروفیسر اور رابطہ کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح بھی سیمنار میں شرکت کے لیے جے پور تشریف لائے، تقریباً پچاس کی تعداد میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذۂ ادب اور دوسرے اہلِ قلم شریک ہوئے، وادی ہدایت کے روح پرور ماحول اور ایک بزرگ کی سرپرستی اور توجہ نے اس میں نورٌ علی نور کا کام کیا، مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کی جانب سے جو صدر مجلس استقبالیہ تھے، جو خطبہ استقبالیہ پیش کیا گیا، اس میں ادب کی قوت اوراثر آفرینی کی وضاحت کے سات افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام سے چند شہپاروں کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا گیا کہ ''ہم کو دیکھتے رہنا چاہئے کہ انسان کی خوبیوں اور صالح قدروں کو تباہ کرنے کے لیے کہاں کہاں اور کیا م کام ہورہا ہے؟'' پھر آپ نے مغرب سے درآمد کیے ہوئے رجحانات اور نظریات کی طرف اشارہ کیا، اس سیمنار کے انعقاد اور اس کے اجتماعات کے سلسلے میں بڑی فراخ دلی اور خوش نظمی کے ساتھ قیام وطعام اور مجالس کے پُرسکون اور راحت رساں ماحول میں انعقاد کا نظم

www.abulhasanalinadwi.org

کیا گیا، جس میں شاہ صاحب کی اولوالعزمی اوران کے صاحبزادوں کی خوش نظمی کا بڑا دخل تھا، سب بیرونی وملکی مہمان بہت اچھے تأثرات لے کرواپس ہوئے۔

شاہ صاحب کی ملّی مسائل سے دلچسپی، ملت کو جو خطرات اور چیلنج درپیش ہیں، ان سے آگہی اور ملت کے تشخص کی بقا کے مسئلہ سے دلچسپی کا یہی ایک مظہر اور ثبوت تھا کہ آپ نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو جو ملت کے دینی، عائلی قانون کے تحفظ اور بقا کے لیے سالہاسال سے کوشاں ہے، اور اصلاح معاشرہ کی بھی ایک ہندگیر تحریک چلارہا ہے، ۱۹۹۳ء میں جے پور میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی اور اس کے انتظام، مہمانوں کے قیام، مجالس کے انعقاد اور اجلاس کی ساری ذمہ داریوں کو قبول فرمایا، ۹، ۱۰، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو یہ اجلاس جامعہ ہدایت کی وسیع اور شاندار عمارت میں اپنی تمام خصوصیات وروایات کے مطابق شاندار طریقہ پر منعقد ہوا لیکن افسوس ہے کہ خود شاہ صاحب بنفس نفیس شرکت نہیں فرماسکے، آپ اس زمانے میں بمبئی میں مقیم اور زیر علاج تھے، لیکن آپ کی دعائیں شاملِ حال رہیں اور صاحبزادگان مولوی فضل الرحیم ندوی اور مولوی ضیاء الرحیم ندوی ازہری نے شاہ صاحب کی پوری نیابت کی اور اجلاس ہر حیثیت سے بڑا کامیاب رہا (۱)۔

اس مختصر مقالے اور محدود تبصرے سے جو بہت عجلت اور مشغولیت کی حالت میں لکھا گیا، شاہ صاحب کی جامعیت، وسیع النظری، حقیقت پسندی، اعتدال وتوازن اور زمانہ حال کی ضرورتوں اور تقاضوں کے سمجھنے کی خصوصیت کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، اوران کا جس مکتب فکر، ماحول اور ماضی سے تعلق تھا، اس میں یہ جامعیت وتنوع خاص ہی خاص افراد کو حاصل ہوتا ہے، جن سے اللہ کو زمانے کے مطابق کچھ کام لینا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے، اوران کے شروع کیے ہوئے کاموں اوران کے قائم کیے ہوئے اداروں کو روبہ ترقی اور پھلتا پھولتا رکھے، اوران کے اخلاف، منتسبین اور مستفیدین کو زیادہ سے زیادہ ان کے کام کو آگے بڑھانے اوران کے چمن کی آبیاری ونگہداری کی توفیق عطا فرمائے وماذلك على الله بعزيز.

□□□

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" حصہ پنجم ص ۲۵۴-۲۷۵

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہریؒ

مولانا ابراہیم احمد مظاہری کا نام اکثر سنا کرتا تھا، اور کبھی کبھی ان کا روزنامہ "دور جدید" بھی نظر سے گزرتا تھا اور ہفت روزہ "استقلال" بھی، یہ دونوں اردو رسالے رنگون سے مولانا ہی کی ادارت ونگرانی میں نکلتے تھے، مولانا بھی ہم لوگوں سے غائبانہ واقف تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے مل چکے ہیں، ذوق اور افکار وخیالات میں غیر معمولی طور پر یکسانی محسوس ہوتی تھی۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں عشق از گفتار خیزد

۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں جب مجھے رنگون جانے کا اتفاق ہوا تو ہوائی اڈے پر پہلی ملاقات ہوئی، میں رنگون میں ایک ماہ رہا اور اس پوری مدت میں شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو جس میں وہ ہمارے پاس تشریف نہ لائے ہوں یا میں ان کے پاس حاضر نہ ہوا ہوں۔

ان کی شخصیت دلکش اور موثر تھی، سنجیدگی اور توازن ان کی سب سے بڑی خصوصیت اور نمایاں وصف کہا جاسکتا ہے، اپنے تمام افکار وخیالات اور اپنی تحریر وتقریر ہر چیز میں وہ نہایت ٹھنڈے دماغ کے متوازن، معتدل اور گہری نظر رکھنے والے انسان تھے۔

متانت ان کی ہر ہر ادا سے ٹپکتی تھی، نہایت وجیہ اور شکیل تھے، ان کے لباس ان کی معاشرت سے نفاست اور حسن ذوق کا اظہار ہوتا تھا، تقریر اور گفتگو میں نرم لہجے سے کام لیتے تھے، مجلسوں میں ان کی سبک روحی، خود اعتمادی اور خوش مذاقی کا اظہار ہوتا تھا، وہ بہت مضبوط کردار کے مالک اور با اصول آدمی تھے، سیاست اور صحافت ہر میدان میں ان کا ایک

www.abulhasanalinadwi.org

خاص مسلک اور اصول تھا جس سے ہٹنے کے لیے وہ تیار نہ تھے، ایسی باتوں میں جس کا تعلق ان کے مرتبہ ومقام یا ان کے افکار وخیالات یا ان کے قومی معاملات سے ہوتا، ان کے ساتھ کوئی لین دین ممکن ہی نہ تھا، قوتِ عمل اور ولولۂ کار میں بھی مولانا بہت ممتاز تھے، مسلمانوں کے خیر وفلاح کے کاموں میں ہمہ وقت مشغول اور منہمک رہتے تھے، اپنی رائے کے اظہار میں فوجی حکومت کے عتاب اور ناراضگی سے بے پروا اور عوام اور رائے عامہ کی مخالفت سے بے نیاز ہوکر وہ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔

وہ ایک ممتاز صحافی بھی تھے، جن کو اردو اخبار نویسوں کی صف اول میں جگہ ملنی چاہیے، ان کے جامع اور مختصر افتتاحیوں سے جو ان کے روزنامہ میں شایع ہوتے تھے، ان کی صحافتی مہارت، دقیقہ رسی اور ادبی معیار کا اندازہ ہوتا ہے، اردو زبان میں ہندو پاک میں جو لٹریچر شائع ہوتا وہ اس سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے، وہ اسلامی ثقافت کے کارواں کا ساتھ دیتے اور اس سے بچھڑنے کے روادار نہ تھے، اردو ادب کا صحیح مذاق رکھتے تھے، عربی زبان میں اسلامی ادبیات کے مطالعے کا بھی ان کو شوق تھا، وہ عمدہ عربی تحریر وانشاء سے ذوق حاصل کرتے تھے اور اس کی ادبی لطافت کو خوب محسوس کرتے تھے۔

دوسری طرف وہ اسلامی ممالک کی اسلامی تحریکات اور اس کے رہنماؤں سے واقف اور وہاں کے اہل فکر اور اہل دماغ کی حیثیتوں سے باخبر تھے، اکثر اشخاص کے متعلق اپنی ذہانت اور مطالعے سے انھوں نے بہت جچی تلی رائے قائم کی تھی، اگر ان میں کچھ عیوب اور کمزوریاں تھیں، تو وہ بھی ان کی نگاہ میں رہتی تھیں، اسی طرح ان کی خصوصیات اور ان کی ضرورتوں پر بھی ان کی نظر تھی۔

وہ برما کی جمعیۃ العلماء کے طویل عرصے تک صدر رہے اور انھوں نے بڑی قابلیت، دانش مندی، جرأت اور استقامت وثابت قدمی کے ساتھ اس کی قیادت ورہنمائی کا فرض انجام دیا، یہاں تک کہ ملک میں اس کا ایک خاص وزن اور وقار پیدا ہوگیا، اور ملکی سیاست اور سرکاری حلقوں میں بھی اس کا اثر محسوس کیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

انھوں نے اپنے ملک میں الحاد و بے دینی کی ہر لہر کا مقابلہ کیا اور حکومت کی ایسی پالیسی کی مذمت اور مخالفت کی جو مسلمانوں کے حق میں مضر تھی، اپنی پوری زندگی میں وہ "موقع پرستی" اور ناجائز فائدہ حاصل کرنے سے پاک اور بے داغ رہے، ان کے مخالفین بھی ان کو اس معاملے میں مطعون نہیں کر سکے۔

تبلیغ ودعوت اور اشاعتِ دین سے ان کو خاص طور پر دلچسپی تھی اور برما کے دور افتادہ قبائلی علاقوں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ کی کوشش کرتے رہتے تھے، مسلمانوں کے دینی مسائل، دینی تعلیم اور ملک میں اس کے مراکز کے قیام، مبلغین کی روانگی اور ان کے دوروں کا انتظام سب کی نگرانی اور دیکھ بھال مولانا ہی کے ذمے تھی، خود بھی اپنے محترم رفیق مولانا محمد داؤد صاحب مفتی اعظم برما کے ساتھ ملک میں دورے کرتے، اس سے مسلمانوں میں دینی روح اور اسلامی حمیت بیدار ہوتی۔

مرحوم ایک وسیع النظر اور فراخ دل عالم تھے، تمام دینی اداروں اور دینی کاموں کی تائید اور مدد کرتے، ۱۳۸۰ھ میں ندوۃ العلماء کا جو ایک وفد رنگون گیا تھا، مولانا نے اس کی بڑی رہنمائی اور ہمت افزائی فرمائی اور اس کے مقاصد سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

آخر زمانے میں برما کی تبلیغی جماعت سے جو نظام الدین دہلی کے اصول اور نہج پر کام کرتی ہے بڑی دلچسپی لینے لگے تھے اور اکثر اس کی سرپرستی فرماتے تھے، غرض یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں جس کام سے انھیں فائدے کی توقع ہوتی وہ اس کی حمایت وتائید سے دریغ نہ فرماتے تھے، ان کے یہاں تنگ خیالی اور گروہی عصبیت نہ تھی جس کے بہت سے علماء شکار ہیں، ان کو کسی دوسرے ادارے کی خدمات کے اعتراف میں کبھی تامل نہ ہوتا۔

وہ کفر کی آغوش سے نکل کر اسلام کی آغوش میں آئے تھے اس طرح ان کی پوری زندگی ایک عطیہ خداوندی تھا، اس کا ایک عجیب واقعہ ہے جو انھوں نے مجھ سے خود بیان کیا۔

انھوں نے سنایا کہ میرے والد نے ایک برمی خاتون سے جو اسلام سے مشرف ہو چکیں تھیں شادی کر لی تھی، میری ماں مسلمان تھیں، نانہال والے بودھ مذہب پر قائم

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، والد کا انتقال میری صغرسنی ہی میں ہوگیا اوراس کے کچھ عرصے کے بعد والدہ بھی انتقال کر گئیں، والدین کے انتقال کے بعد ماموں نے جو بدھ مذہب کے پیرو تھے مجھے اپنی پرورش میں لے لیا، انھوں نے منت مانی تھی کہ اپنا ایک لڑکا وہ پگوڈا کو دے دیں گے، اوراس کو بودھ مذہب کا عالم اور پھونگی بنائیں گے، لیکن چونکہ ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس لیے انھوں نے اپنے بھانجے کو اپنا لڑکا سمجھا اور ایک پگوڈا میں مجھے داخل کردیا، میں نے پگوڈا میں ایک عرصہ گزارا، اس پوری مدت میں بدھ مذہب کے شعائر ورسوم کے مطابق میری پرورش ہوتی رہی، بدھ مذہب کے پھونگیوں کا یہ شیوہ ہے کہ وہ روزانہ ایک وقت نکال کر لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور لوگ جو کچھ دے دیتے ہیں، اسی سے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، یہ ایک وظیفہ یا فریضہ ہے جو ہر پھونگی کو ادا کرنا پڑتا ہے، یہی کام مجھے بھی کرنا پڑا، لیکن میری سلیم فطرت نے اس سے بغاوت کردی اور بدھ مذہب ورہبانیت کے اس عجیب وغریب طریقے سے میرے دل میں سخت نفرت اور کراہت پیدا ہوگئی، میں نے اس ظلمت میں زندگی گزارنے سے انکار کردیا، اللہ کی مہربانی ہوئی کہ اس کے بعد ہی میں بیمار ہوگیا، میرے پیر میں درد ہونے لگا، راہبوں نے علاج کی غرض سے مجھے ماموں کے پاس بھیج دیا، اور تاکید کی کہ صحت یابی کے بعد جلد واپس آجائیں، گھر آنے کے بعد میں نے پگوڈا جانے سے انکار کردیا اور دھمکی دی کہ اگر زیادہ اصرار سے کام لیا گیا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔

یہ خبر ایک سربرآوردہ اور باخدا مسلمان تاجر حاجی محمد یوسف صاحب تک پہنچی، حاجی صاحب ایک صاحب دل اور ولی صفت انسان تھے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے بیعت اور اجازت حاصل تھی، انھوں نے عدالت میں بچے کی حقیقت اور ولایت کا دعویٰ اس بنیاد پر دائر کردیا کہ اس کے باپ مسلمان تھے اور چونکہ میرے والد (احمد گجراتی صاحب مرحوم) ان کے دوست اور مخلص ساتھی تھے، اس لیے وہ غیر مسلم کے مقابلے میں اس کے ولی ہیں، کیونکہ ایک مسلمان بچے کا ولی کوئی غیر مسلم نہیں ہوسکتا، یہ مقدمہ مختلف عدالتوں میں چلتا رہا، لیکن بالآخر حاجی صاحب کے حق میں فیصلہ ہوا اور وہ مقدمہ جیت گئے، حاجی

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب نے مجھے فوراً مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور بھیج دیا جو اپنی روحانی اور دینی فضا میں خاص شہرت رکھتا ہے اور حاجی صاحب کے اس مدرسے سے قدیم روابط بھی تھے۔

مولانا ابراہیم صاحب مظاہر العلوم میں داخل ہو گئے اور بہت انہماک اور توجہ سے وہاں انھوں نے کئی سال گزار کر وہاں کے فاضل اور دین دار اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے ۱۹۳۵ء میں فراغت حاصل کی، اور اپنے وطن برما آ کر وہ دینی منصب سنبھال لیا جو گویا ان کا منتظر تھا، انھوں نے اپنی پوری صلاحیت اخلاص و استقلال کے ساتھ مسلمانانِ برما کی رہنمائی کی اور ربع صدی کی پوری مدت پوری سرگرمی، اور انہماک کے ساتھ گزار کر ۱۹۶۴ء کو پچاس سال کی عمر میں اپنے رب سے جا ملے، اخبارات میں لکھا ہے کہ ان کے جنازے میں اتنا بڑا ازدہام تھا کہ اچھے اچھے معمر لوگوں کا بیان ہے کہ ایسا ازدہام اس سے پہلے کسی نامور مسلمان کے جنازے میں رنگون جیسے مصروف شہر میں دیکھنے میں نہیں آیا، مسلمانانِ برما نے تعزیتی جلسوں، تعزیتی تاروں، اور قرآن خوانی اور ایصال ثواب کے ذریعے ملت کے بے لوث خادم اور اپنے اس محبوب قائد کے ساتھ اپنی گہری عقیدت اور محبت کا اظہار کیا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجے بلند فرمائے اور ان کو اپنے مقامِ رضا میں جگہ دے۔

جمعیۃ العلماء برما اپنی موجودہ حیثیت و وسعت میں، روزنامہ "دورِ جدید" اور ایک ادارہ جو مولانا نے ان بوڑھے اور ضعیف مسلمانوں کے لیے قائم کیا تھا جو معذور ہو جائیں ان کی یادگار ہیں، پسماندگان میں اہلیہ اور ایک بچہ ہے جس کے لیے مولانا نے وصیت فرمائی ہے کہ اس کو دینی تعلیم دلائی جائے۔

ان کے رفیق قدیم مولانا محمود مفتی اعظم برما جمعیۃ العلماء کے صدر اور دورِ جدید کے سرپرست اور نگراں قرار پائے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی عمر میں برکت دے اور وہ عرصۂ دراز تک اس نازک دور میں مسلمانانِ برما کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکیں۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

حاجی احمد غریب صاحبؒ

بمبئی کو ہندوستان میں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ حجاج کی گزرگاہ اور ہندوستانیوں کے لیے مکہ کا پہلا دروازہ ہے، کوئی اور معاشی، مادّی، تمدنی اور سیاسی ضرورت نہ ہو جب بھی جس ہندوستانی مسلمان کی قسمت یاوری کرتی ہے اور اس کے نصیب جاگتے ہیں وہ اسی دروازہ سے مکہ میں داخل ہوتا ہے۔

حاجی احمد غریب مرحوم کی شہر بمبئی میں مختلف حیثیتیں تھیں، وہ ایک ملی کارکن دردمند مسلمان، باوجاہت وصاحب ورسوخ تاجر، کسی اسلامی انجمن کے سرپرست اور کسی کے رکن وسرگرم ممبر، اس لیے ان سے کسی نہ کسی اچھی تقریب سے ملاقات وتعارف ہو جایا کرتا تھا، لیکن ان کی سب سے نمایاں، روشن حیثیت یہ تھی کہ وہ انجمن خدام النبی کے روح رواں، اور سرپرست وذمہ دار تھے، اس لیے جن لوگوں کو اللہ حج کی دولت نصیب کرتا تھا اس کا کسی نہ کسی طرح سے ان سے واسطہ پڑتا تھا اور وہ کچھ نہ کچھ ان کی اعانت یا رہنمائی سے فائدہ اٹھالیتا تھا، ان کو حجاج کی خدمت سے عشق تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی دینی ذہانت وفراست سے اپنی آخرت کے لیے دنیا میں اس بے لوث خدمت کا انتخاب کیا تھا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا یہ انتخاب بالکل صحیح تھا اور ان کی اس دینی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میری ان سے پہلی ملاقات کہاں اور کس تقریب سے ہوئی لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد سے یعنی تقسیم کے بعد ہی بمبئی بکثرت آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا، غالباً ۱۹۵۰ء میں ان سے باقاعدہ تعارف وشناسائی ہوئی، جب میں مرشدنا مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

عبدالقادر صاحبؒ کی ہم کابی میں سفر حج پر جا رہا تھا، یہ تعارف تعلق میں تبدیل ہوا اور یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا رہا، یہاں تک کہ بمبئی اور احمد بھائی (ہم لوگ آخر میں ان کو ان کے میمن بھائیوں کی طرح اسی طرح خطاب کرنے لگے تھے) لازم ملزوم و مرادف ہو گئے، یہ ممکن نہ تھا کہ بمبئی کا تصور آئے اور احمد بھائی کی تصویر آنکھ کے سامنے نہ آئے، انھوں نے اپنی طبیعت کی شگفتگی، ہروقت کی زندہ دلی، حاضر دماغی، اپنے قلب و دماغ کی وسعت، اپنی اس ذہانت سے (جس کی نظیر میں نے تجار طبقے میں کم دیکھی ہے) اور دینی و اسلامی کاموں سے اپنی یکساں اور بے پایاں دلچسپی سے ہم لوگوں کو بہت جلد اپنا گرویدہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خاص صفت دی تھی جس کو کسی ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، اس کے لیے سوانح نگاری و مرقع کشی کی قدیم زبان میں ''سبک روحی'' کا لفظ آتا ہے اور اس کے مقابلہ میں قدیم سیرت نگار ''گراں جانی'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اگر کسی شخص کے کسی وقت آنے سے آپ نہ گھبرائیں، کسی محفلِ علم و ادب، کسی دینی مجلس، کسی بزمِ احباب میں آپ اس کو مخل بار خاطر نہ سمجھیں، کسی گفتگو میں اس کے حصہ لینے کو آپ دخل در معقولات نہ تصور کریں، اس کے دیر تک بیٹھنے سے آپ نہ اکتائیں تو اس خوش قسمت انسان کو ''سبک روح'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صفت احمد بھائی کو دی تھی، اس کو شخصی مناسبت کہیے یا انفرادی واقعہ، اپنا احساس و تجربہ یہی ہے اور میرے خیال میں اس احساس میں بہت لوگ شریک ہیں، اور ان کا تعلق مختلف طبقوں سے ہے، طبقہ علماء سے بھی سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں سے بھی، ملی خادموں سے بھی، ادباء، شعراء سے بھی۔

۱۹۵۴ء میں جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بمبئی میں تعلیمی کنونشن بلایا تو انتظام و میزبانی کی ساری ذمہ داری احمد بھائی نے اپنے سرلی اور انھوں نے اپنے چند مخلص رفقاء اور خدام النبی کے کارکنوں کو ساتھ لے کر کنونشن کا اتنا مکمل اور کامیاب انتظام کیا اور ان مہمانوں کی جن کی بڑی تعداد علماء کبار، اساتذۂ مدارس اور ماہرینِ تعلیم کی تھی اس سلیقہ مندی اور اس خوب صورتی سے انتظام کیا کہ بہت کم جلسوں اور اجتماعات میں دیکھنے میں آیا۔ ہر چیز

www.abulhasanalinadwi.org

معیاری تھی اور ہر پہلو سے نفاست وذہانت کا اظہار ہوتا تھا، انھوں نے اس کنونشن سے اپنی انتظامی اہلیت، اپنی مقبولیت، ہردلعزیزی، اپنی حاضر دماغی اور نکتہ رسی کا ایسا ثبوت دیا جس سے کنونشن کے موقر، شرکاء اور معزز مہمان کم وبیش سبھی متاثر تھے۔

احمد بھائی سے تعلق برابر بڑھتا گیا، میں دیرآشنا اور کم آمیز واقع ہوا ہوں، خصوصاً اہلِ ثروت اور ذی وجاہت لوگوں سے میری کم آمیزی کمزوری کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، لیکن انھوں نے اپنے اخلاق، اپنی وسیع ثقافت، اپنی شائستگی، ذہانت سے اس سب سے زیادہ اس صفت سے جس کو میں نے ''سبک روحی'' کے لفظ سے ادا کیا ہے، مجھے اتنا مانوس کرلیا کہ میں بمبئی میں کوئی چھوٹا بڑا کام ان کے مشورے اور مدد کے بغیر نہ کرتا۔ میرا سب سے زیادہ انہیں کے پاس جی لگتا، کہیں سے آتا جاتا ان کی دوکان پر کچھ دیر ٹھہرنا معمول بن گیا، پریشانی اور فکر کی حالت میں انہیں کی باتوں سے تسکین حاصل ہوتی، ان کو بھی اس کا خاص ملکہ تھا، روتوں کو ہنسا دینا اور مغموم اور افسردہ کو مسرور وشگفتہ بنا دینا ان کا خاص وصف تھا۔

وہ قلب کے مریض تھے اور نوجوانی میں ان کو کسی ڈاکٹر نے آگاہی دیدی تھی کہ تم قلب کے مریض ہو اور اس مرض کا اچانک حملہ ہوسکتا ہے اور جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے، لیکن وہ ہر وقت مسرور ومطمئن رہتے تھے، ان کا پُر از اعتماد اور مسکراتا ہوا چہرہ روشن آنکھیں جن سے ذہانت ٹپکتی، پیشانی جس سے بلند ہمتی اور بلند نظری کا اظہار ہوتا، ان کی قوت ایمانی، ان کی روح کی توانائی کی دلیل تھی، متنوع بلکہ بیک وقت متضاد کاموں کے کرنے کا ان کو عجیب ملکہ عطا فرمایا تھا، ہر کام میں وہ حاضر الحواس اور متوازن دماغ رہتے تھے، مستعدی، فرض شناسی اور محنت ان کا مزاج بن گئی تھی، کسلمندی اور مایوسی سے ان کو بہت کم مناسبت تھی، وہ ایک مسلمان تاجر کا قابلِ تقلید نمونہ تھے، تاجر طبقے سے نسلی وموروثی اور عملی تعلق رکھنے کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ وہ ہمیشہ بمبئی کے ماحول میں رہے اور دینی وعلمی مرکزوں میں ان کو رہنا کیا، جانے کا بھی کم اتفاق ہوا، ان کے اندر ادبی ذوق اور علم وادب سے فطری مناسبت تھی، گجراتی وار دو دونوں کے صاحب قلم تھے، انھوں نے پچھلے

www.abulhasanalinadwi.org

سال مجھے حرم شریف سے ایک مفصل خط لکھا تھا جس میں رمضان المبارک میں حرم مکی میں رمضان کی رونقوں، عبادت کی سرگرمیوں اور حرم کے دینی مناظر کی دل فریبی کا نقشہ کھینچا تھا وہ ایک ادبی نمونہ تھا جو افسوس ہے کہ محفوظ نہ رہا، اب بمبئی ہندوستان کا سب سے زیادہ گلزار وبارونق شہر ہونے کے باوجود ان کے بغیر سونی سونی نظر آتی ہے، ان کے نقل مکانی کے بعد بھی ان کی دوکان کے سامنے سے گزرنا دل پر چوٹ لگاتا تھا، اوراب انتقال کے بعد تو دل کے یہ داغ اور ہرے ہوجاتے ہیں، اب اس کے سوا کیا لکھوں کہ ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

احمد بھائی کے انتقال کی خبر بجلی بن کر گری، رہ رہ کر ان کا خیال آتا ہے، اپنی دوسری خوبیوں اور عام خدمات کے علاوہ میرے ساتھ ان کا بہت خصوصی تعلق تھا، میں ان کی عنایتوں کا بہت ممنون ہوں، افسوس کہ اس دنیا میں اب ان سے ملنے کی امید نہ رہی، اس خبر سے بہت ہی صدمہ ہوا، یہاں ان کے جتنے واقف موجود تھے سبھی کو ملال ہے، اتفاق سے مولوی معین اللہ صاحب اور عزیزی محمد رابع بھی یہاں موجود تھے ان کو بھی بڑا افسوس ہوا، ہم سب جب کہیں باہر سے آتے جاتے تو ان کی عنایتیں اوران کی محبت ہم سب کے لیے بڑی سہولت اور تقویت کا باعث تھی، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

محمد اسد صاحبؒ (سابق لیوپولڈ ویس)

محمد اسد صاحب معاصر مغربی دنیا کے بارے میں اپنے تاثرات ومشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ایک دنیا جہاں اضطراب اورابال ہو، یہ تھی ہماری دنیا، حددرجہ تباہی وخونریزی جس کی مثال ملنی مشکل ہے، اجتماعی روایات میں رسہ کشی، فکری مذاہب میں تصادم، زندگی کے نئے نئے طریقوں اور فیشن کے لیے ہر جگہ ایک سخت کش مکش، یہ ہیں ہمارے دور کے خصائص اور اوصاف۔

جنگ عظیم کے دھویں کے ہولناک بادلوں اور تباہ کاریوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جنگوں تک جن کا کوئی شمار ہی نہیں، انقلاب اور جوابی انقلاب، اقتصادی اور معاشی پریشانیاں جو اس زمانے کی تمام دشواریوں اور پریشانیوں سے بڑھ چڑھ کر تھیں، ان تمام ہولناک واقعات نے یہ حقیقت ظاہر کردی تھی کہ فنی، صنعتی اور مادی ترقیات پر مغرب کے ساری زور آزمائی موجودہ انتشار اور بدنظمی میں ذرا بھی کمی نہیں کرسکتی''۔

دوسری جگہ مغرب کے روحانی خلا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''بیسویں صدی کے ابتدائی سال اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ ان میں نمایاں طور پر ایک روحانی خلا (Spritual Vacuum) پایا جاتا تھا، وہ ساری اخلاقی اور روحانی قدریں جن سے یورپ صدیوں سے آشنا تھا، اب کسی خاص اور متعین شکل پر باقی نہیں رہ گئی تھیں، یہ ان ہولناک واقعات کا نتیجہ تھا جو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان پیش آئے، بظاہر اس کی کوئی توقع بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ اقدار کا کوئی نیا مجموعہ ان قدروں کی

www.abulhasanalinadwi.org

جگہ لے سکے"۔

یہ تھی وہ دنیا جس میں محمد اسد نے لیوپولڈ ویس Leo Pold Weiss کے نام سے اور آسٹریا میں ایک یہودی ربی خاندان کے چشم و چراغ کی حیثیت سے آنکھ کھولی اور جسمانی و ذہنی نشوونما حاصل کیا، یہودی عالموں اور دینی پیشواؤں کے خاندان کے ماحول جہاں نسلی غرور اور احساس برتری بچہ بچہ کی گھٹی میں پڑا ہوا ہوتا ہے فلسفہ اور تاریخ وادبیات کا وسیع اور گہرا مطالعہ، فنون لطیفہ کا فطری ذوق، جرمنی کی بحرانی اور رواں دواں زندگی، یورپ کا صنعتی و سائنسی عروج، صحافت کی مشغولیت ہر چیز اس نوجوان کو اس سمندر میں گم ہوجانے اور اپنے کو زمانے کے بہتے ہوئے دھارے کے حوالے کر دینے کی دعوت دیتی تھی، اس کا موروثی منصب پیشوائی، اس کی غیر معمولی صلاحیتیں، اس کی صحافتی کامیابی، اس کا ادبی ذوق، ہر چیز اس کے کامیاب وشاندار مستقبل کی ضامن تھی، اور تہذیب جدید کے اس شاہ راہِ عام سے اس کے ہٹنے اور اس نظام فکر و عمل سے اس کے باغی ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے لیوپولڈ ویس کو ایک بڑی دولت سے نوازا تھا، وہ دولت جوان خوش نصیب افراد کو ملا کرتی ہے جو اپنے زمانے کے ظلمات میں چشمۂ حیواں دریافت کرتے ہیں اور رسم و رواج کے آزر کدہ میں ابراہیمی فطرت لے کر پیدا ہوا کرتے ہیں، یعنی بے چینی و بے اطمینانی، نئی چیز کی تلاش انھوں نے اپنی نوعمری اور نوجوانی کے دور کے جو تاثرات قلم بند کیے ہیں ان سے ان کے عقلی بلوغ، سلامتِ فطرت، ذہانت اور اس مبارک بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے بعد سے جب تک وہ یورپ میں رہے اور جب انھوں نے مشرق میں عرب ممالک اور ایران وافغانستان کا سفر کیا وہ غیر شعوری طور پر ایک مسلمان کی طرح نہ صرف دماغ سے بلکہ اس کے جذبات کے ساتھ سوچتے رہے، انھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، مگر اس کی توانائی و قوت حیات اور اس کے دوبارہ عروج وارتقاء کی

www.abulhasanalinadwi.org

صلاحیتوں پر ان کو بہت سے نسلی مسلمانوں سے زیادہ یقین تھا، سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ یورپ کے عام مفکرین وفضلاء کے (جو مسلمانوں کے زوال کو اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں) برخلاف مسلمانوں کے تنزل اور پستی کو اسلامی تعلیمات وشریعت سے انحراف وغفلت کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔

بالآخر وہ وقت آ گیا کہ ان کو اس تضاد کا احساس ہوا جو ان کی ذہنی کیفیت اور ان کی زندگی کے رویے میں تھا اور ان کو یہ انکشاف ہوا کہ اسلام ان کے دل ودماغ میں گھر کر چکا ہے۔

ان کا اسلام کا مطالعہ جاری رہا، اور ان کا قلبی لگاؤ اور دماغی اطمینان بڑھتا رہا اور اسلام کے ساتھ ان کی گرویدگی میں اضافہ واستحکام ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کو اسلام ایک ایسی صحیح التناسب عمارت کی طرح نظر آنے لگا جس کو کسی کامل الفن معمار اور مہندس نے تعمیر کیا تھا اور جس کی ہر اینٹ اور ہر پتھر اپنی صحیح جگہ پر تھا اور جس میں نہ کوئی چیز کم تھی نہ زائد، نہ بے محل۔

اب کسی اور چیز کا انتظار باقی نہ تھا، لیوپولڈ ویس نے برلن میں اپنے ایک مسلمان دوست کے پاس جا کر کلمۂ شہادت پڑھا اور اب وہ ''محمد اسد'' کے نام سے اس امت اور اس عالم کا ایک جزء بن گئے جس کی اس معجز نظام کلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری نبوت اور تعلیم نے بنیاد ڈالی تھی اور جو ان کو پہلے سے عزیز ومانوس تھا۔

محمد اسد نے اپنے وجود اور دلچسپیوں کو اس امت کے وجود اور دلچسپیوں اور اس عالم کے مسائل وافکار میں اس طرح ضم کر دیا جیسے ایک خاندان کا فرد اپنے وجود اور شخصیت اور صلاحیتوں کو اس خاندان کے وجود، دلچسپیوں اور مسائل میں ضم کر دیتا ہے، انھوں نے ذوق وشوق کے ساتھ حج وزیارت کا سفر کر کے اس دین کے ساتھ اپنا روحانی ارتباط اور وابستگی مستحکم کی، جزیرۃ العرب میں ایک مسلمان کی حیثیت سے قیام کر کے عربی زبان اور دینیات، اور اسلامی معاشرے سے اپنی واقفیت اور تعلق کو بڑھایا اور اس معاشرے اور اس کے ذمہ دار افراد سے اتنا گہرا تعلق اور ان کا ایسا اعتماد حاصل کیا کہ سلطان ابن سعود

www.abulhasanalinadwi.org

کے معتمد اور امام سنوسی کے قاصد کی حیثیت سے نازک مہمیں انجام دیں، ہندوستان کے قیام میں انھوں نے (Islam At the Cross Roads) کے نام سے ایک ایسی پُر مغز اور فاضلانہ کتاب لکھی جس سے ہندوستان اور عالم اسلام کے علمی و دینی حلقوں میں ایک ذہنی جنبش پیدا ہوگئی، انھوں نے پہلی مرتبہ معذرت آمیز اور نیاز مندانہ طرز تحریر چھوڑ کر مغربی تہذیب پر پُر اعتماد طریقے پر بھرپور تنقید کی، اور ثابت کیا کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کی بنیادوں اور نقطۂ آغاز میں اختلاف ہے اور ان دونوں کا اتحاد ممکن نہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے ''سنت و حدیث'' کی ....طاقتور وکالت کی اور اسلامی نظامِ زندگی میں ان کی اہمیت اور ضرورت ثابت کی، پھر جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے، علامہ اقبال کی رفاقت و رہنمائی میں فکر اسلامی کی تعمیر نو کا کام بھی کیا، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عرفات Arafat کے نام سے ایک انگریزی رسالہ اور صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے کا عظیم الشان کام بھی شروع کیا جو بدقسمتی سے ناتمام رہ گیا۔

راقم سطور کی ملاقات ان سے پہلی مرتبہ مکہ معظمہ اور دوسری بار دمشق اور لبنان میں ہوئی جہاں وہ اپنی اس شہرہ آفاق کتاب (The Road to Mecca) کا عربی ترجمہ اپنی نگرانی میں کرا رہے تھے، جب یہ ترجمہ شائع ہوا تو انھوں نے ازراہِ کرم اس کا ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا، میں اس کتاب کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا، انھوں نے اپنے ذہنی سفر و ہجرت کی داستان اور قبول اسلام کی کہانی بڑے نفسیاتی اور ادبی انداز سے سنائی تھی، انھوں نے اس موضوع کو توڑ کر اس کے اجزا کے صحرائے عرب کے پُر خطر سفروں، عرب کے اجتماعی و معاشرتی زندگی کے تجربات، عرب قبائل اور ان کے سرداروں اور سلطان ابن سعود اور ان کے خاندان کے امراء کے دلچسپ حالات میں اس طرح تقسیم اور پیوست کر دیا تھا کہ ایک مغربی ان کو اسی شوق اور دلچسپی اور لذت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس شوق و دلچسپی اور لذت کے ساتھ وہ سندباد جہازی کے سفرنامے یا مشرق کے کسی دلچسپ اور پُر از معلومات رودادِ سفر کو پڑھتا ہے، گویا انھوں نے ایک خشک اور شاید تلخ موضوع کو شکر کے غلافوں میں لپیٹ کر

www.abulhasanalinadwi.org

پیش کیا ہے۔

لیکن جب مجھے ایک سفر کی فرصت میں کتاب کے عربی ترجمہ "الطریق الی مکۃ" کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا تو میں مصنف کی نفسیات شناسی، بالغ نظری، اور حکمت ودعوت کا قائل ہو گیا کہ انھوں نے اسلام کی دعوت ایسے حکیمانہ انداز میں دی ہے کہ یہ کتاب مغرب کے باشندوں اور ہندوستان کے غیر مسلموں کے لیے اسلام اور اسلامی تہذیب کو سمجھنے کے لیے ایک اچھی تقریب اور تمہید بن گئی ہے، اس میں ناول کا لطف اور کہانی کی دل آویزی بھی ہے اور علم وفلسفہ کی سنجیدگی اور معلومات کا ذخیرہ بھی، سادگی بھی ہے، پُرکاری بھی، تفریح کا سامان بھی ہے اور زندگی کی رہبری اور انقلاب انگیزی کی صلاحیت بھی، اسی بناء پر اس نے امریکہ اور یورپ میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور انگریزی کے علاوہ (جس میں اصل کتاب ہے) یورپ کی چار زبانوں جرمن، سویدی (Swedish) ولندیزی اور فرنچ میں کتاب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

مجھے اس سفر میں خیال آیا کہ اگر اس کتاب میں مصنف کے حالات ومشاہدات وتاثرات اور واقعات زندگی (جو کتاب میں نہایت غیر مرتب اور منتشر طریقے پر بیان کیے گئے ہیں) انتخاب کر کے ان کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے تو وہ محمد اسد صاحب کی مرتب سوانح اور سفرنامہ اور ان کے قبول اسلام کی ایک مکمل تاریخ بن جائے گی، اور افادیت کے اضافہ کے ساتھ اس کی دل آویزی اور دلچسپی بھی قائم رہے گی، میں نے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی جانب سے اس کے ترجمہ اور انتخاب کی اجازت مانگی جو انھوں نے از راہ کرم خود بھی منظور فرمائی اور ناشر کی طرف سے بھی اجازت بھیج دی اور اس کے اردو ترجمہ وطباعت کے حقوق مجلس کو عطا کیے۔

راقم کی آخری ملاقات غالباً ۱۹۶۴ء-۱۹۶۵ء میں جنیوا میں ہوئی، جہاں اسلامک سینٹر کے جس کا میں شروع سے رکن چلا آ رہا تھا، شرکت کے لیے گیا ہوا تھا، محمد اسد صاحب خود ہی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی

www.abulhasanalinadwi.org

میں ترجمہ عنایت فرمایا جو انھوں نے قریبی زمانے میں تیار کیا تھا، راقم نے اس کے بعض تفصیلی حواشی اور نوٹس سے قدرے اختلاف کرتے ہوئے ترجمے کو اپنی صحت اور زبان کی خوبی میں بہتیرے انگریزی تراجم سے بہتر پایا۔

اس کے بعد مرحوم نے حکومت مراکش کے ایک ساحلی مقام پر مستقل سکونت اختیار کر لی اور افسوس ہے کہ پھر اس کے بعد ان سے خط وکتابت یا کسی قسم کا علمی، تحریری رابطہ قائم نہیں ہو سکا اور ان کے حالات ومشاغل وسرگرمیوں سے بالکل بے خبری رہی، اس میں اپنی ہی کوتاہی کو دخل تھا، جس کا اعتراف بھی ہے اور افسوس بھی، لیکن اسی کے ساتھ اسلامی عربی وانگریزی مسلم صحافت اور اسلامی، علمی حلقوں کی بھی ذمہ داری ہے، جنھوں نے کبھی ان سے رابطہ قائم نہیں کیا اور نہ ان کے حالات، علمی ودینی مشاغل اور تازہ فکر ومطالعے کے نتائج سے عالم اسلام اور عالم عربی کو مطلع کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ بالآخر فروری ۱۹۹۲ء میں ان کا حادثۂ ارتحال پیش آیا، اور مارچ کے آخر میں ہندوستان کے ایک دو اردو اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ "غالباً فروری کے تیسرے ہفتہ میں ان کا اسپین میں انتقال ہو گیا اور وہیں کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

□□□

چند خورد سال لیکن باکمال رفیق و عزیز

- سید احمد الحسنیؒ
- مولانا ابوالعرفان ندویؒ
- عزیزی مولوی محمد ثانی حسنیؒ
- مولوی معین اللہ ندویؒ
- مولوی سید محمد مرتضیٰ مظاہریؒ
- مولوی عبدالنور (نورِ عظیم) ندویؒ

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

سید احمد الحسنیؒ

مجاہدِ اعظم، مجددِ وقت، داعی الی اللہ اور مصلح کبیر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں (جن میں راقم کی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' (۱-۲) اور نامور ادیب و مصنف مولانا غلام رسول مہر، مدیر ''انقلاب'' لاہور کی بلند پایہ تصنیف ''سید احمد شہیدؒ'' (۱،۲،۳،۴) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) ان کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ حضرتؒ کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، دو صاحبزادیاں تھیں، جن میں سے ایک کا عقد جن کا نام بی بی سارہ تھا، آپ کے حقیقی بھتیجے سید محمد اسماعیل، فرزند برادر حقیقی مولانا سید محمد اسحاق سے ہوا تھا، ان کے ایک فرزند جو حضرت سید صاحب کے نواسے اور برادر اکبر مولانا سید محمد اسحاق کے پوتے تھے، ان کا نام بھی سید اسحاق تھا، بالاکوٹ کے واقعہ شہادت کے بعد جو ۲۴/ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں پیش آیا، حضرت سید صاحب کے اہلِ خانہ اور افراد خاندان اس مدّتِ جہاد تک پیر جو گوٹھ سندھ میں مقیم تھے، یہ قصبہ حیدرآباد اور شکارپور کے درمیان واقع ہے، یہاں نسباً سادات اور نسبتاً قادری شیوخ کا ایک مقتدر و محترم خاندان آباد تھا، جن میں دو بھائی ممتاز و مشہور ہیں، ایک سید صبغت اللہ جو سندھیوں کی زبان میں پیر پگاڑو کے لقب سے، دوسرے سید محمد یٰسین جو پیر جھنڈا کے لقب سے مشہور تھے، اور جن کا کتب خانہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں مشہور ہے، اسی عالی نسب و بلند نسبت خاندانِ سادات کی دعوت و نصرت کی بنا پر آپ نے اپنے گھر والوں کو مدّتِ جہاد تک کے لیے یہاں چھوڑا تھا، نواب وزیرالدولہ مرحوم والی ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کے اصرارِ بلیغ بلکہ خوشامد پر یہ افرادِ خاندان ٹونک منتقل ہوئے، نواب صاحب

www.abulhasanalinadwi.org

نے حضرت سید صاحب کے نواسے اور اہلیہ صاحبہ کے لیے ولی عہد ریاست کے بعد سب سے بڑی جاگیر پیش کی اور جو زیادہ سے زیادہ احترام اور بزرگداشت ہوسکتی ہے، اس کا ان افراد خاندان سے معاملہ کیا، خود دروازے پر خادمانہ حاضر ہوتے اور کہتے کہ غلام حاضر ہے، کوئی خدمت؟ کوئی کام ہے؟ آخر تک انھوں نے اور بڑی حد تک ان کے جانشینوں نے محبت وعقیدت اور تعظیم واحترام کا یہ معاملہ قائم رکھا۔

اِن افراد خاندان کے ساتھ جو سید صاحب سے قریبی نسبت رکھتے تھے، جماعت مجاہدین کے بچے کھچے افراد اور ان کے متوسلین بھی بالاکوٹ کی شہادت گاہ یا سندھ سے یا یورپ کے بعض حصوں سے ٹونک منتقل ہوگئے تھے، اور ان کی وجہ سے شہر کا وہ محلّہ جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی "قافلہ" کہلاتا تھا، اور وہ صحتِ عقائد، پابندیٔ فرائض، اسلامی اخوت ومساوات، صلہ رحمی، تواضع وسادگی، دینی حمیت اور شوقِ جہاد میں امتیاز خاص رکھتا تھا۔

برادرِ عزیز سید احمد الحسنی کی ولادت محلّہ قافلہ ٹونک ہی میں ۱۳۳۴ھ، ۱۹۱۶ء میں ہوئی، کسی نے اس مصرعے سے تاریخ نکالی ؎

یہ سنا مخلوق سے پیدا ہوا فیروز بخت

اور کسی نے یہ شعر کہا ؎

جمعہ کو انتیسویں ذی الحجہ کی شب کو ایک دم
سید احمد، فخر عالم نجم دیں، پیدا ہوا

سادات رائے بریلی کی یہ شاخ اور مجاہدین بالاکوٹ کے یہ بقیۃ السیف ٹونک میں سالہا سال سے عزت وفراغت کی زندگی گزار رہے تھے، اور خاص طور پر حضرت سید صاحب کے اخلاف اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ سکونت پذیر تھے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں تحریک خلافت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی، قافلہ والوں کی ہمدردی اور جذبات قدرتاً اس تحریک کے ساتھ تھے، والیٔ ریاست نواب ابراہیم علی خاں کو قافلہ والوں سے اندیشہ اور بدگمانی پیدا کرائی گئی اور انھوں نے ان کے ریاست سے فوری اخراج کے احکام

www.abulhasanalinadwi.org

جاری کردیئے، جاگیریں اور جائدادیں ضبط کرلیں، سادات قافلہ نہایت بے سروسامانی کے ساتھ اس طرح کہ جو کپڑے بدن پر تھے وہ لے کر اپنے قدیم وطن رائے بریلی آگئے، یہاں کے اعزہ نے ان کو اپنے گھروں میں ٹھہرایا، انہیں میں عم محترم سید محمد اسماعیل بھی تھے، جو حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسہ سید محمد اسحاق مرحوم کے فرزند اور ان کی جاگیر واملاک کے تنہا وارث تھے، یک جدی ہونے اور دوسری قرابتوں کے ساتھ ان سے ہمارے گھر کا ایک قریبی رشتہ یہ تھا کہ ان کی والدہ محترمہ راقم کے حقیقی دادا مولوی حکیم سید فخر الدین خیالی مرحوم کی حقیقی چچازاد بہن تھیں، اس طرح وہ ہمارے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے پھوپھی زاد بھائی ہوتے تھے، اس قرابت قریبہ اور خصوصی تعلق اور سب سے بڑھ کر حضرت سید صاحبؒ سے والد صاحب مرحوم کو جو عقیدت خاص تھی، والد صاحب کی درخواست پر وہ ہمارے ہی گھر میں فروکش ہوئے، اور جب تک مستقل مکان تعمیر نہیں ہوا، وہیں قیام پذیر رہے، ہم بھائی بہن ان کو چچا میاں کہتے تھے۔

میری عربی تعلیم کا استاد کبیر شیخ خلیل بن محمد الیمانی (استاد لکھنؤ یونیورسٹی) کے یہاں آغاز ہوا تو عزیزی احمد بھی زیادہ تر لکھنؤ میں ہمارے مکان پر رہنے لگے، اور غالباً عرب صاحب ہی کے یہاں ان کی بھی عربی تعلیم کا آغاز ہوا، پھر ہم دونوں مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ انہیں کے حجرہ واقع دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کی سرپرستی اور نگرانی میں رہنے لگے اور احمد مرحوم نے دارالعلوم میں عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونک کے رہنے والے تھے، اور قافلہ کے خاندان سادات سے ان کے قدیم اور عزیزانہ ومخلصانہ روابط تھے، وہ عم محترم سید محمد اسماعیل اور مولانا سید طلحہ اور ان کے بھائیوں سے خصوصی ربط وتعلق رکھتے تھے، جب ان میں سے کوئی آجاتا تو دیر رات تک ٹونک کا تذکرہ اور اخراج کے واقعات موضوع گفتگو رہتے، قدرتاً اور طبعاً ہم دونوں بھائیوں کو ان کی بزرگانہ شفقت وسرپرستی کا حصہ وافر ملا، یہ یاد نہیں کہ احمد مرحوم نے منتظم طریقے پر دارالعلوم میں کس درجہ تک تعلیم پائی غالباً خلیل عرب

www.abulhasanalinadwi.org

سے بھی استفادہ کیا، عربی زبان سے ان کو خاص مناسبت پیدا ہوگئی تھی۔

لیکن ان کے جوہر کھلنے اور عربی زبان میں اہلِ زبان کی طرح روانی اور قدرت حاصل ہونے کی تقریب اور اس کا آغاز اس وقت ہوا جب عربی زبان، اس کے ادبیات اور صرف ونحو کے فاضلِ یگانہ اور اس میں سند و حجت کا درجہ رکھنے والے عرب فاضل علامہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں صدر شعبۂ عربی کے عہدے پر فائز ہوئے، ان کا عربی زبان اور اس کے متعلق فنون ومقدمات میں وہ بلند پایہ مرتبہ تھا کہ علامہ سید رشید رضا مرحوم مدیر "المنار" اور امیر البیان امیر شکیب ارسلان کے درمیان جب کسی عربی لفظ یا ترکیب پر اختلاف رائے ہوتا تو علامہ تقی الدین الہلالی ہی کو حکم بناتے اور ان کے فیصلے کو تسلیم کرتے۔

یوں تو دارالعلوم کے سینیر طلباء مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور اس راقم سطور نے اپنی عربی استعداد و ذوق میں ان سے گراں بہا فائدہ اٹھایا، لیکن ان سے سب سے بڑا فائدہ برادر عزیز احمد الحسنی نے اٹھایا جو اپنی کم عمری کی وجہ سے ان کے گھر میں بے تکلف آتے جاتے تھے، اور ان کے کاموں میں معاونت کرتے تھے، احمد مرحوم کی صرف ونحو کی تعلیم تو اپنے فاضل ماموں مولانا سید طلحہ صاحب سے ہوئی جو صرف ونحو میں ایک ماہر معلم بلکہ امام کا درجہ رکھتے تھے، لیکن عربی زبان پر قدرت اور روانی ہلالی صاحب کی محبت اور شفقت کے زیرِ سایہ ہوئی، ہلالی صاحب کے ان خطوط میں جو راقم کے نام ہیں، ان کا بڑی شفقت کے ساتھ تذکرہ ہے، اور یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ انھوں نے ان کی صحبت اور رفاقت اور معاونت سے بیش قیمت فائدہ اٹھایا ہوگا (۱) اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسا فائدہ اٹھایا کہ شاید عربی زبان پر یہ قدرت، گفتگو میں روانی اور طلاقت لسانی ہندوستان کے برصغیر میں چند ہی آدمیوں کو حاصل ہوئی ہو، اسلوبِ تحریر، وسعتِ مطالعہ اور اِنشا پردازی میں بہت سے افراد ان سے بڑھے ہوئے ہوں گے لیکن اہلِ زبان کی

---

(۱) ملاحظہ ہو، نامورانِ عالمِ اسلامی و دنیائے ادب کے مشاہیر کے ان خطوط کا مجموعہ جو لکھنؤ اور قاہرہ (مصر) سے رسائل الاعلام کے نام سے شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰ (مطبوعہ لکھنؤ) وصفحہ ۲۶ (مطبوعہ قاہرہ)۔

www.abulhasanalinadwi.org

طرح بے تکلف گفتگو اور اظہارِ خیال پر قدرت کم ہی لوگوں کو حاصل ہوگی، اس سلسلے میں ایک لطیفہ کا ذکر بے محل اور نامناسب نہ ہوگا۔

احمد مرحوم اپنی عربی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی درجوں میں عربی بول چال اور ابتدائی عربی کتابوں کی تدریس پر مامور ہوئے، اس زمانے میں شہر لکھنؤ کے مشہور حاذق طبیب شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب مرحوم نے (جن کو مختلف زبانوں سے فطری ذوق اور ان میں گفتگو کرنے کا ملکہ اور قدرت حاصل تھی، جن میں عربی فارسی، انگریزی، اردو چار زبانیں شامل تھیں) اپنے مکان واقع کٹرہ ابوتراب خاں واقع یحییٰ گنج لکھنؤ میں عربی میں تقریر کے لیے ایک مجلس قائم کی جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب کے اساتذہ اونچے درجہ کے طلبہ، فرنگی محل کے علماء اور بعض شیعہ مجتہدین اور فضلاء کو بھی دعوت دی جس میں مولانا سید علی نقی مجتہد مدیر رسالہ "الادیب" عربی (جو بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے استاد اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے صدر مقرر ہوئے) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، عربی میں برجستہ تقریریں ہوئیں، عربی زبان کے خاص ماحول اور عرب اساتذہ کے فیض تدریس اور النادی العربی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وجہ سے جب دارالعلوم کے چند ممتاز طلبہ اور اساتذہ نے عربی میں تقریریں کیں تو پھر ان کے سامنے کسی کا رنگ نہیں جما اور ان کا تفوق نمایاں طریقے پر ظاہر ہوا، شرکائے مجلس میں ایک صاحب کو جو غالباً مولانا سید علی نقی کے ساتھ آئے تھے، یہ بات بڑی گراں گزری، انھوں نے دیکھا کہ راقم کے پہلو میں اس کے ایک عزیز بیٹھے ہوئے ہیں، جو اس کے چھوٹے بھائی معلوم ہوتے ہیں، احمد مرحوم کو جہاں تک گفتگو اور مشق وروانی کا تعلق ہے عربی میں کمال حاصل تھا، لیکن وہ مقرر نہیں تھے، اور یہ کسی قدر ہمارے خاندان کی خصوصیت ہے کہ اس میں عوامی مقرر کم اور اہلِ قلم اور مصنف زیادہ گزرے ہیں، انھوں نے جب احمد سے تقریر کی فرمائش کی تو انھوں نے معذرت کی اور ہم لوگوں نے بھی کہا کہ جلسہ ختم ہوگیا، اب کسی نئی تقریر کی ضرورت نہیں، انھوں نے یہ سمجھ کر کہ

www.abulhasanalinadwi.org

احمد تقریر پر قادر نہیں ہیں، اوران کے تقریر نہ کرسکنے سے اس فرق کی کچھ تلافی ہوسکے گی جو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انتساب رکھنے والے اساتذہ اورطلبہ کی قادرالکلامی اورطلاقت لسانی سے پیدا ہوگیا ہے، ان کا اصرار بڑھتا گیا اوراحمد کا انکار، یہاں تک کہ ہم لوگ باہر نکل کر نخاس روڈ پر آگئے جہاں سے ہم کو سواریوں پر اپنے اپنے ٹھکانے جانا تھا، ان صاحب نے وہاں بہ شدّت کہا کہ ہم ان کی تقریر سنے بغیر جا ہی نہیں سکتے، مجبوراً ہم لوگ واپس آئے راقم نے احمد سے کہا کہ پھر اللہ کا نام لے کر کچھ کہہ ہی دو، انھوں نے ایسی برجستہ اورزوردار تقریر کی کہ ساری محفل پر اس کا جادو چل گیا اور پچھلی تقریروں سے بھی وہ بازی لے گئی، اوروہ صاحب جنھوں نے ان کی ذلت اور ہماری سبکی کا سامان کیا تھا، خود خفیف اورشرمندہ ہوئے۔

اسی ذیل میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب وہ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے شفیق ماموں اوراستاد مولانا سید طلحہ صاحب حسنی کی خدمت میں رہنے اورمزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور گئے اوران کی عربی زبان پر قدرت کا وہاں کے بعض اہلِ علم وذوق کو علم ہوا تو انھوں نے ایک عام جلسے کا انتظام کیا جس کی صدارت کے لیے اس وقت کے مسلمانوں کے نامور سیاسی قائد اورادیب خطیب وشاعر مولانا ظفرعلی خاں مدیر "زمیندار" کا انتخاب کیا اورایک اشتہار شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ "کون کہتا ہے کہ اس زمانے میں ابوالفضل اورفیضی جیسے لوگ نہیں ہیں، لوگ آئیں اورایک ہندوستانی نژاد کی عربی پر قدرت اورروانی اورطلاقت لسانی دیکھیں" راقم کو اس کے کچھ دن بعد ہی لاہور جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت تک غالباً یہ اشتہارات دیواروں پر چسپاں تھے، اوراس مجلس کا چرچا تھا، احمد مرحوم نے عربی میں تقریر کی اور عربوں کے خصوصی اخلاق اورمزاج کے تذکرے میں استشہاداً برجستہ عربی اشعار پڑھے، غالباً اپنی صدارتی تقریر میں مولانا ظفرعلی خاں نے ان کی مہارت لسانی اورقدرت بیانی کی دادوی، یہ ایک ایسا شرف وامتیاز تھا جو صغیرالسن اورجواں سال عربی دانوں کو مشکل سے حاصل ہوا ہوگا۔

www.abulhasanalinadwi.org

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مدرسی کے ساتھ بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلیؒ) کے تعارف اور سفارش پر ڈاکٹر محمود اللہ جنگ (پارلیمنٹری سکریٹری پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ یو پی) نے ان کو اپنے بچوں کا دینی و تعلیمی ٹیوٹر مقرر کیا اور وہ غالباً کئی سال تک یہ فرض انجام دیتے رہے، ۳۱-۱۹۳۲ء میں وہ لاہور میں تھے، راقم نے جب حضرت مولانا احمد علیؒ سے تفسیر قرآن کا درس لینا شروع کیا تو وہ بھی شریک درس تھے، پھر وہ لکھنؤ آگئے اور حسب سابق دارالعلوم میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس عرصے میں (غالباً ۱۹۳۲ء میں) سادات قافلہ کے اخراج کا حکم منسوخ ہوا، اور عم محترم سید محمد اسماعیل اور دوسرے افراد خاندان جو ایک طرح سے ہجرت کی زندگی گزار رہے تھے، اپنے قدیم مسکن محلہ قافلہ ٹونک واپس ہوئے، ان کو جاگیریں اور جائدادیں تو واپس نہیں ہوئیں مگر وہ اپنے ثانوی وطن مالوف اور عالی شان مکانات میں دوبارہ سکونت پذیر ہوگئے، اس وقت سے سید احمد الحسنی و برادران زیادہ تر ٹونک رہنے لگے، احمد مرحوم نے لاہور ٹھہر کر اپنی انگریزی کی تعلیم جاری کی، اسی عرصے میں ۴۲-۱۹۴۳ء میں ان کا شملہ کے ریڈیو اسٹیشن پر تقرر ہوا، جہاں وہ عربی تقریروں اور ممالک عربیہ کے ریڈیو اسٹیشن کے ضروری اقتباسات انگریزی میں پیش کرتے، اسی کے ساتھ کچھ انگریزوں نے ان سے عربی پڑھنا شروع کی۔

اسی زمانے میں ۱۹۴۳ء میں وہ کسی ضرورت سے دہلی آئے، یہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی جماعت تبلیغ کی آخری علالت کا وقت تھا، اور ضعف انتہا کو پہنچا ہوا تھا، میں ان کو حضرت کی زیارت کے لیے حضرت کے حجرے میں لے گیا، حضرت اس وقت کچھ گفتگو نہیں فرما سکتے تھے، حضرت کی اس طویل و شدید بیماری کی وجہ سے متعدد اہل تعلق اور بزرگان دین اور اپنے وقت کے کبار علماء و مشائخ نظام الدین بنگلہ والی مسجد (تبلیغی مرکز) میں مقیم تھے، جن میں ”حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری“، ”شیخ الحدیث

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی'' اور ''مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، راقم احمد کو ان کی خدمت میں لے کر گیا اور ان کا اس طرح تعارف کرایا کہ یہ حضرت ''سید احمد شہیدؒ'' سے سب سے زیادہ نسبی نسبت و تعلق رکھتے ہیں، اور حضرت کے حقیقی نواسے کے پوتے ہیں، ان حضرات نے سلسلۂ دیوبند کے دوسرے بزرگوں اور مشائخ کی طرح اس پر بڑی مسرّت کا اظہار کیا اور بڑی شفقت و کسی قدر احترام واکرام کے ساتھ ملے، دوپہر کا کھانا بھی ہم سب نے ساتھ کھایا، کھانے کے بعد جب احمد رخصت ہوئے تو میں نے معذرتاً عرض کیا کہ ہمارے یہ بھائی عرصے سے ایک غیر دینی ماحول میں رہتے ہیں، اور انگریزوں کو پڑھاتے ہیں، اس کا ان کی صورت ووضع پر کچھ اثر ہے، ان حضرات نے فرطِ تعلق ومحبت میں مجھے اس سے کچھ زیادہ کہنے کی اجازت نہیں دی اور ایسا اشارہ کیا کہ میں خاموش ہو گیا، اس سے اندازہ ہوا کہ ان اکابر اور شیوخ کا حضرت سید صاحب اور ان سے نسبت و تعلق رکھنے والوں کے ساتھ کیسا تعلق اور اس کا کتنا لحاظ واحترام ہے، الحمد للہ بعد میں انھوں نے دینی ترقی کی جس کے آثار چہرہ ووضع وہیئت پر نمودار ہوئے۔

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد یا اس کے کچھ پیشتر احمد لاہور چلے گئے اور لاہور اور کراچی میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کی اور عربی میں ایم اے کیا، کراچی یونیورسٹی میں زمانۂ تعلیم میں علامہ عبدالعزیز میمن سے بھی ان کا رابطہ رہا جو مولانا سید طلحہ صاحب کے ساتھ عرصے تک اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کا کام کرنے کی وجہ سے ان سے خاندانی طور پر واقف تھے، تعلیم کی تکمیل کر لینے کے بعد وہ پاکستانی وزارت خارجہ اور اس کے سفارت خانہ میں ملازم ہو گئے، اور ترجمان اور کلچرل اٹیچی کا کام کرنے لگے، اس سلسلے میں وہ عرصہ تک قاہرہ کے پاکستانی سفارت خانے میں، پھر جدہ کے پاکستانی سفارت خانے میں کام کرتے رہے، ۱۹۵۷ء میں سابق سفیر پاکستان متعینہ سعودی عرب خواجہ شہاب الدین کے ہمراہ ان کے ترجمان کی حیثیت سے شاہ فیصل مرحوم سے ریاض

www.abulhasanalinadwi.org

میں ملے، اس وقت شاہ شہید اپنے ملک کے با اختیار وزیر اعظم و وزیر خارجہ تھے، اس کے بعد طائف اور جدہ میں بھی سفیر پاکستان کے ہمراہ شاہ شہید سے کئی بار ملاقات اور ترجمانی کا شرف حاصل ہو، اپریل ۱۹۶۶ء میں شاہ شہید پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تو ایوب خاں مرحوم سابق صدر پاکستان سے گفتگو کے موقع پر بھی انھیں نے ترجمانی کا فرض انجام دیا، لاہور، پشاور اور کراچی کے استقبالیہ میں وہی ترجمان رہتے تھے، جب شاہ مرحوم اس پاکستانی دورے میں عوام کو خطاب کرتے تھے، تو ان کے ساتھ اردو میں ان کو ترجمانی کا شرف حاصل ہوتا تھا، مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ شاہ مرحوم نے ان کی کامیاب ترجمانی پر اظہار مسرت کے طور پر کوئی ہدیہ یا انعام بھی دیا تھا، پاکستانی وزارت خارجہ کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا تعلق سعودی سفارت خانہ واقع اسلام آباد سے ہوگیا تھا، جہاں وہ ثقافتی امور اور تعلقات عامہ کے ذمہ دار تھے، اور وفات کے قریب تک وہ یہی خدمت انجام دیتے رہے، تمنا تھی کہ وہ اپنے خاندان کے وطن قدیم رائے بریلی آئیں اور سب اعزہ و افراد خاندان ان سے ملنے کی مسرت حاصل کریں، لکھنؤ بھی آئیں جہاں انھوں نے طویل عرصے تک قیام کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کو ترقی یافتہ اور وسعت پذیر شکل میں دیکھیں، اور سب اہلِ تعلق اور حضرت سید صاحب سے عقیدت اور نسبت رکھنے والے اعزہ اور احباب ملیں، موقع ہو تو ٹونک بھی جائیں، جہاں ان کے خاندان کی ایک شاخ نے سو برس کے قریب قیام کیا اور ان کی تین پشتیں گزریں، لیکن انھوں نے سفر ہند کے بجائے سفر آخرت اختیار کیا اور یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

یہاں پر ان کے حقیقی برادر صغیر سید ابراہیم حسنی کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس سے مرحوم کی فطری استعداد اور ممتاز صلاحیت پر مزید روشنی پڑتی ہے، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

www.abulhasanalinadwi.org

''۱۹۴۶ء میں ٹونک کی جامع مسجد میں مدرسۂ فرقانیہ کی یوم تاسیس کے موقع پر حضرت مولانا حیدرحسن خاں صاحب مرحوم نے بھیا مرحوم سے عربی میں سپاسنامہ لکھنے کی تاکید کی، سپاسنامہ نواب سعادت علی خاں، والی ریاست کی خدمت میں پیش کرنا تھا، بھیا نے میرے سامنے رات کے وقت اسے لکھا اور دوسرے دن مولانا مرحوم کی خدمت میں لے گئے، مولانا نے بہت پسند کیا، اور والد مرحوم سے بھی اس کا ذکر کیا، والد مرحوم بہت خوش ہوئے، اس کی اعلیٰ کتابت کرائی گئی، اور وصلی بنا کر فریم میں جڑوا دیا گیا، مقررہ تاریخ ووقت پر جلسہ شروع ہوا، نواب صاحب تشریف لائے، ریاست کے تمام عمائدین بھی شریک تھے، والد مرحوم مولانا مرحوم کے قریب جا کر بیٹھے، اور مرصع کرسی پر نواب صاحب تشریف فرما ہوئے، بھیا اور میں ایک طرف بیٹھ گئے، تلاوت کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی، مولانا نے بھیا سے سپاسنامہ پڑھنے کے لیے کہا، بھیا نے اونچی آواز میں شاندار طریقے سے اس سپاسنامہ کو پڑھا، مفتیان شرع شریف حیران رہ گئے، ان میں سے کسی نے یا عمائدین میں سے کسی نے کہا کسی سے لکھوا کر لایا ہے، اس نے خود نہیں لکھا، نواب صاحب ذرا دور تھے سن نہیں سکے، کسی نے کہا اس کا اردو میں ترجمہ ہوجاتا تو بہت اچھا ہوتا، ایک آواز آئی اب ترجمہ نہیں کر سکے گا، مولانا مرحوم نے بھیا سے کہا ''احمد اس کا ترجمہ بھی کردو!'' بھیا نے شاندار الفاظ میں اس کا اردو ترجمہ بھی کردیا، ہر طرف سے تحسین ومرحبا کی صدائیں سنائی دیں، حاسدین کے چہرے اتر گئے، اور گردنیں جھکا کر وہ جلسے سے روانہ ہوگئے، والد مرحوم اور مولانا مرحوم سرخرو ہوئے، اور مسرت وشادمانی سے ہمکنار ہوئے، نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے اور مدرسے کے لیے ایک گرانقدر عطیہ کا اعلان کیا''۔

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

www.abulhasanalinadwi.org

''۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا، لاہور میں علمائے ازہر کا ایک وفد آیا، اس کے لیڈر شیخ ابراہیم الجبالی تھے، غالباً جامعہ ازہر کے ہزار سالہ جشن کے سلسلے میں وہ وفد آیا تھا، لاہور کے مشہور ہوٹل فلیٹز میں قیام کیا، ایک دن ماموں میاں مرحوم (مولانا سید طلحہ صاحب) نے ہم دونوں بھائیوں سے کہا کہ علمائے ازہر کا وفد آیا ہے، اور فلیٹز میں قیام ہے، ان سے ملاقات کے لیے آج عصر کا وقت طے ہوا ہے، تم دونوں میرے ساتھ چلنا، چنانچہ ہم تینوں تانگے پر روانہ ہوئے، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لان میں کرسیاں بچھی ہوئی ہیں، اور وفد کے ارکان ہمارا انتظار کر رہے ہیں، مولانا ظفر علی خاں وفد سے ملاقات کر کے جا چکے تھے، سلام مسنون کے بعد باتیں شروع ہوئیں، پہلے ماموں میاں بولے، پھر بھیا، بھیا کی عربی سن کر وہ ذرا حیران ہوئے اور کہا یہ تو عرب معلوم ہوتے ہیں یا ممالک عربیہ میں عرصۂ دراز تک رہے ہیں، یہاں تو کوئی بھی ایسی فصیح عربی نہیں بولتا، ماموں میاں نے کہا، یہ میرا بھانجا ہے، اور ابھی تک کسی بلاد عربیہ میں انھیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، اگرچہ ان کی خواہش بہت ہے، وہ یہ سن کر مزید حیران وششدر ہوئے جیسے انھیں یقین نہیں آرہا تھا''۔

۱۶/دسمبر ۱۹۸۹ء کو ان کی وفات کا حادثہ اچانک لاہور میں پیش آیا، ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں سید ابراہیم حسنی اور سید اسحاق حسنی نے فوری طور پر تار کے ذریعے راقم کو اس کی اطلاع دی، ہمارے تعلق وتأثر کو جاننے والے اعزہ اور احباب نے خانگی حادثہ کے قرب کی وجہ سے اس تار کو چھپا دیا، اور دو تین دن بعد ہمارے حوالے کیا، اس اچانک اور اندوہ ناک خبر نے جو دل ودماغ پر بجلی بن کر گری، اور غم بالائے غم کا کام کیا، یہ خبر اس لیے بھی صاعقہ اثر تھی کہ چند ہی دن پہلے راقم نے ان کو بڑے اصرار اور قلبی تقاضے کے ساتھ گھر کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے لکھنؤ

www.abulhasanalinadwi.org

آنے کی دعوت دی تھی، وہ خود بھی عرصے سے ہندوستان آنے اور اپنے عزیزوں اور اہلِ خاندان سے ملنے کا اشتیاق وارادہ ظاہر کرتے تھے، اور ہم لوگ بھی ان کی آمد کے بے چینی کے ساتھ متمنی ومشتاق تھے(۱) ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

□□□

(۱) ''کاروانِ زندگی'' حصہ چہارم ص ۱۶۵!

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ابوالعرفان ندویؒ

جو قلم برسوں سے بزرگ و نامور معاصرین کے بارے میں اپنے مشاہدات و تاثرات و تجربات و تعلقات کے قلمبند کرنے اوران کو تحریری شکل میں پیش کرنے کا عادی رہا ہے، اور جس نے صرف چند ہی خورد سال عزیزوں کے بارہ میں ''سینہ کے داغ'' کے عنوان سے اپنی قلبی جراحتوں کا اظہار کیا ہے، آج وہ اپنے ایک عزیز، باوفا رفیق کار اور ممتاز ندوی فاضل، وسیع النظر، وسیع المطالعہ عالم ''مولانا ابوالعرفان ندوی'' (جن کو پہلی مرتبہ قلم مرحوم لکھنے پر مجبور ہو رہا ہے) کے بارے میں اپنے تاثرات و تجربات کے پیش کرنے پر مجبور پا رہا ہے۔

جونپور جو ''مولانا ابوالعرفان ندوی'' کا وطن تھا، اس سے ہمارے خاندان کے دیرینہ تعلقات چلے آرہے ہیں، یہ شہر حضرت سید احمد شہیدؒ کے دو ممتاز اور نامور خلفاء کا مولد و مسکن تھا، ایک مرشدِ بنگال حضرت مولانا کرامت علی جون پوری (ساکن ملاّ ٹولہ جون پور) دوسرے ماحیِ بدعت و ناشرِ سنّت حضرت مولانا سخاوت علی جونپوری (ساکن محلّہ قضیانہ جون پور) مولانا سخاوت علی جونپوریؒ کے صاحبزادے مولانا محمد مکّی جونپوری (دفین جنت المعلی مکہ معظمہ) اوران کے نامور صاحبزادے.....مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) دونوں میرے حقیقی جدِّ مادری حضرت سید شاہ ضیاء النبی حسنیؒ رائے بریلوی سے بیعت واسترشاد کا تعلق رکھتے تھے، مولانا ابوالعرفان صاحب کے والد مولانا دین محمد صاحب مسلک واعتقاد، محبت وعقیدت اور علمی وورہی

www.abulhasanalinadwi.org

استفادے میں اسی خاندان کے خوشہ چیں اور اسی ماحول کے پروردہ اور ساختہ پرداختہ تھے، اور سکونت و قیام کے لحاظ سے بھی اسی محلہ اور ماحول سے تعلق رکھتے تھے، مولانا دین محمد صاحب نے میرے نانا صاحب کی زیارت بھی کی تھی، اور غالباً مولانا سید محمد امین صاحب نصیرآبادی سے کچھ پڑھا بھی تھا۔

مولانا ابوالعرفان صاحب ان تعلقات وخصوصیات سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان بزرگوں کی محبت وعقیدت سے سرشار اور ان کے مسلک کے شدت سے نہ صرف پابند بلکہ داعی ووکیل تھے، انھوں نے مولانا ابوبکر صاحبؒ کے قیامِ جون پور کا زمانہ اپنے بچپن میں دیکھا تھا، اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان کی مقبولیت ومرکزیت، ان کے بلند اخلاق، کنبہ پروری، مہمان نوازی اور ان کی وسیع اور مختلف الجہات ثقافت اور مجالس کا تذکرہ اس ذوق وشغف کے ساتھ کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مناظر اب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں، مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری کی دل آویز شخصیت اور ان کی وسیع اور جامع ثقافت نے (جس کا نمونہ اس دورِ آخر میں ہندوستان کی صرف چند نادرۂ روزگار شخصیتیں ہی تھیں) مولانا ابوالعرفان صاحب کے ذہن کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں بنیادی حصہ لیا تھا، اور ان کے لیے ان کی حیثیت ایک نمونہ اور معیار (Ideal) انسان اور عالم کی تھی۔

اس تاریخی پس منظر اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مجالس سے استفادے اور وسیع اور متنوع مطالعے نے ان کو ندوۃ العلماء کی تعلیم وثقافت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بنا دیا تھا، اس لیے کہ ان دونوں مسلکوں اور ثقافتوں میں کئی مابہ الاشتراک اجزا وعناصر ہیں، مثلاً خاندان ولی اللّٰہی اور جماعت مجاہدین، (جس کے قائد ورہنما حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ تھے) کا عقیدہ ومسلک، تاریخ وادب کا ذوق اور وسیع مطالعہ، علم کلام او عقائد کے بارے میں عمیق ووسیع مطالعہ اور مسلک سلف

www.abulhasanalinadwi.org

کی حمایت اور تائید، سنجیدہ اور باوقار علم مجلسی، جدید تحریکات ورجحانات سے واقفیت اوران کے بارے میں ناقدانہ نظر اور منصفانہ محاکمہ، اس کوندوی ثقافت ومزاج بھی کہا جاسکتا ہے، جس کے معاصر علماء اور اساتذۂ مدارس اور فضلاء جدید میں مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی ایک ممتاز نمائندہ اور نمونہ کی حیثیت رکھتے تھے، اور اسی بنا پر ہندوستان کی مختلف جامعات (یونیورسٹیوں) اور مجامع علمیہ (اکیڈمیوں) میں منعقد ہونے والے مذاکرات ومجالس علمی میں ندوہ کی نمایندگی اور بحث ومذاکرہ میں حصہ لینے کے لیے بالعموم انہیں کا انتخاب کیا جاتا تھا، اور وہ اپنی متوازن اور پراز معلومات تقریروں اور سنجیدہ بحث ومذاکرہ کے تابندہ نقوش چھوڑ کر آتے تھے، اور ہر جگہ ان کا علمی وزن اور فکری توازن واعتدال محسوس کیا جاتا تھا۔

انھوں نے دارالعلوم میں بحیثیت طالب علم آنے سے پہلے اپنے فاضل والد ماجد سے اور الٰہ آباد کے بعض اساتذۂ معقولات سے منطق وفلسفے کی کتابیں بھی پڑھی تھیں، اور ایک مختصر عرصے کے لیے دارالعلوم دیوبند بھی رہے تھے، اس لیے ان کی معقولات پر بھی نظر تھی، اور وہ قدیم کلامی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بھی واقف تھے، پھر شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات وتحقیقات کے مطالعے اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی مجالس ''سیرۃ النبی'' علامہ شبلیؒ کی تصنیفات اور دارالمصنفین کی مطبوعات اور لٹریچر کے مطالعے سے ان کے ذہن میں مزید وسعت، اعتدال، جامعیت اور جدید ذہن کے سمجھنے اور مطمئن کرنے کی بہتر صلاحیت پیدا ہوگئی تھی، اسی بنا پر وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بڑے ذوق وشوق اور اطمینان واعتماد کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور یہ کتاب تدریسی طور پر زیادہ تر انہیں سے متعلق رہتی تھی۔

جہاں تک ہندوستان کی اسلامی (سیاسی، تہذیبی، علمی اور تصنیفی) تاریخ، طبقاتِ

www.abulhasanalinadwi.org

علماء ان کے مراتب وخصوصیات سے واقفیت اور نصاب تعلیم کے ارتقاء وتنزل اور عہد بہ عہد تبدیلیوں سے واقفیت کا تعلق ہے معاصر اور متوسط العمر علماء میں شاید ان کے مرتبے کا کوئی عالم دور دور نہ پایا جاتا ہو، اسی بنا پر جب والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا تصنیف "الثقافة الاسلامیه فی الھند" کے (جس کو بڑے اہتمام سے دمشق (شام) کی مؤقر ترین علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" نے جس کا جدید نام "مجمع اللغة العربیه" ہے۔ ۱۹۵۸ء میں شائع کیا) اردو ترجمے کے لیے مولانا ابوالعرفان ندوی ہی پر نظر پڑی، اور اس کو "ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون" کے نام سے دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا، افسوس ہے کہ اپنی تدریسی مصروفیات اور مخصوص افتادِ طبع کی بنا پر وہ اپنے فکر ومطالعے کے شایانِ شان کوئی بڑا اور مستقل تصنیفی کام نہ کرسکے جو صحیح طور پر ان کی علمی یادگار اور ان کے وسیع ومتنوع مطالعے کا نمونہ ہو۔

مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں قدیم علماء کے اصول "یک در گیر ومحکم گیر" پر عمل کیا، سوائے اس قلیل مدت کے جب انھوں نے شیر کشمیر شیخ عبداللہ مرحوم وزیر اعلیٰ کشمیر کے اصرار پر سری نگر کشمیر کے ایک مرکزی عربی مدرسے کی سربراہی قبول کی اور اس سلسلے میں وہ کچھ عرصے تک سری نگر میں مقیم رہے، انھوں نے ایسی حالت میں کہ ان کے کثیر التعداد شاگردوں نے سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک کی جامعات اور مختلف مرکزوں اور شعبوں سے وابستگی پیدا کی، انھوں نے کبھی اشارۃً بھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں تدریس وخدمت علمی میں زندگی گزار دی، ان کو رفیق محترم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم) کا اعتماد و رہنمائی حاصل رہی اور وہ ان کے بعد کچھ عرصے تک منصب اہتمام پر بھی فائز رہے، اس کے بعد انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں تدریس ومطالعے ہی میں محدود کردیں، لیکن ندوۃ العلماء کی نظامت اور دارالعلوم کا شعبۂ اہتمام اہم مواقع پر ان کے تجربہ وخلوص

www.abulhasanalinadwi.org

اور رائے صائب سے فائدہ اٹھاتا رہا۔

کئی سال سے ان کو ذیابیطس کی شکایت تھی، اور اس نے ان کی صحت کو خاصا متاثر کیا تھا، اس کے باوجود وہ ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد ہونے والے سیمناروں اور علمی مجالس میں شرکت کے لیے سفر کرتے تھے۔

کچھ عرصے سے ان کو قلب کی شکایت لاحق ہوگئی تھی، لیکن اس کو عام طور پر ذیابیطس ہی کے اثرات پر محمول کیا جاتا رہا، ایک رات قلب کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ بستر سے زمین پر آرہے، لیکن اس کی بھی صحیح تشخیص نہیں ہوسکی، بعد میں وہ مستقل قلب کے مریض ہوگئے، مگر اپنی شگفتگیٔ طبع اور زندہ دلی کی بنا پر نہ ضروری احتیاط کرسکے، نہ کسی کو اس کی نزاکت اور شدّت محسوس ہوئی، ماہرین خصوصی کے معائنے کے بعد بھی کسی ایسے فوری خطرے کا احساس نہیں ہونے پایا، جس کی بنا پر وہ مکمل آرام واحتیاط کرتے، تقدیری بات کہ ۱۱/ نومبر ۱۹۸۸ء کو راقم سطور کو رابطۂ عالم اسلامی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ معظمہ کے قصد سے عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی رفاقت میں لکھنؤ سے روانہ ہونا پڑا، اس وقت فوری حادثہ کے پیش آنے کا کوئی وسوسہ اور خیال بھی نہیں تھا، ۱۷/ نومبر کو جب حجاز میں عصر کا وقت تھا، اور لکھنؤ میں مغرب ہوچکی تھی، عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی سے ٹیلی فون پر بات ہوئی، میں نے مولانا ابوالعرفان صاحب کی خیریت دریافت کی، انھوں نے کہا کہ پہلے سے بہتر ہیں، میں نے کہا کہ سلام کہہ دیجیے اور کہہ دیجیے کہ میں ان کے لیے دعا کررہا ہوں، یہ پیغام ان کو پہنچا اور وہ خوش ہوئے، معلوم ہوا کہ رات کو ۱۰-۱۱ بجے تک وہ اپنے قریبی پڑوسیوں اور دارالعلوم میں پاس کے رہنے والے اساتذہ سے باتیں کرتے رہے، اسی دوران میں ان کو قلبی تکلیف محسوس ہوئی اور اسی وقت ان کو اسپتال لے جایا گیا، یہ بھی معلوم ہوا کہ محبی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی نے اس دن دیکھ کر مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا، اور ان کو خطرے کا احساس ہوگیا تھا، لیکن اس پر عمل نہیں ہوسکا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسپتال میں فوری تدبیریں کی گئیں، لیکن وقت مقرر آچکا تھا، کچھ کارگر نہ ہوئیں، اورانھوں نے جہانِ فانی سے دارالبقاء کا سفر اختیار کیا، اگلے ہی روز ۱۸رنومبر کی صبح کو علی الصباح یہ غمناک اطلاع ٹیلی فون کے ذریعہ مکہ معظمہ پہنچ گئی، مجھے قصداً ذرا دیر سے اطلاع کی گئی، میں ہاتھ ملتارہ گیا کہ چند ہی دن پہلے اُن سے رخصت ہوکر آیا تھا، اور یہ واقعہ میری غیر موجودگی میں پیش آیا کہ میں جنازہ میں شرکت بھی نہ کرسکوں گا۔

وکان امراللّٰہ قدراً مقدوراً۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید مگر نہ از دلِ ما

□□□

عزیزی مولوی سید محمد ثانی حسنیؒ

راقم سطور کو اپنی زندگی میں جو چند عظیم مجاہدے اور امتحانات پیش آئے ہیں ان میں اپنے بعض جواں مرگ عزیزوں اور لخت ہائے جگر کے حادثۂ وفات اور ان کی زندگی پر آنکھوں کی راہ سے نہیں (کہ وہ تو ایک غیر اختیاری عمل ہے) قلم کے ذریعے حروف ونقوش کی شکل میں خون کے آنسو بہانا اور ان کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کرنا ہے، جو لوگ (اللہ تعالیٰ سب دوستوں کو محفوظ رکھے) اس ابتلا سے گزر چکے اور ان کو تحریری شکل میں یہ زہرہ گداز فرض انجام دینا پڑا ہے وہی اس کی تلخی اور جاں گدازی سے واقف ہو سکتے ہیں۔

اس بات کے سارے آثار وقرائن موجود تھے کہ عزیزی محمد ثانی مرحوم میرے حادثۂ وفات پر جو ایک نہ ایک دن پیش آنے والا ہے، اپنے نقوش وتاثرات لکھیں گے اور وہ ان کے غیر معمولی تعلق، سفر وحضر کی طویل رفاقت، جزئیاتِ زندگی، مزاجی خصوصیات اور حوادث وسوانح سے اس واقفیت کی بنا پر جو خود افراد خاندان اور قریبی عزیزوں میں کسی کو حاصل نہیں، سب سے زیادہ قابل اعتماد تاریخی دستاویز ہوگی، اور وہی حقیر زندگی کا آئینہ کہ ان عزیزوں اور بزرگوں سے قطع نظر جن کے واقعاتِ زندگی اور حالات وکمالات کے وہ چشم دید گواہ تھے، خاندان کی تاریخ، بزرگوں کی وفیات اور خاندانی انساب سے ان سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا، اور مجھے اپنے علمی وتاریخی کاموں میں بالخصوص سیرت سید احمد شہیدؒ اور حیات عبدالحیؒ کے سلسلے میں ان سے بار بار رجوع کرنا اور مدد لینا پڑتا تھا، اور ہر مرتبہ ان کی وسیع معلومات، تاریخی شعور اور تحقیقی ذوق پر حیرت ہوتی تھی، لیکن خدا کی قدرت اور اس کی شانِ استغنا ہے کہ ان سارے آثار وقرائن اور عمر کے اس تفاوت کے باوجود جو بارہ

www.abulhasanalinadwi.org

سال سے کم نہ تھا(۱)، آج مجھے ان کے بارے میں لکھنا پڑ رہا ہے، اور اس موقع پر بے اختیار قدیم عرب شاعر اور اپنے ہم نام ابوالحسن التہامی کا وہ مصرعہ یاد آرہا ہے جو اس کے ولدوز قصیدے میں آیا ہے، جو اس نے اپنے جواں مرگ بیٹے کے مرثیے میں کہا ہے، اور اس کا شمار عربی کے مؤثر ترین مرثیوں میں ہوتا ہے، قصیدہ کا مطلع ہے ؎

حکم المنية فی البرّية جار ما هذه الدنيا بدار قرار

(موت کا قانون پوری مخلوق پر جاری وساری ہے، حقیقت میں یہ دنیا بقا اور استقرار کی جگہ نہیں ہے)

اس قصیدے میں وہ اپنے لخت جگر کو خطاب کر کے کہتا ہے ع

فسبقتنی وأبوك فی المضمار

(ہم تم دونوں ایک ہی میدان کے راہی تھے، تم نے پیش قدمی کی اور منزل پر پہنچ گئے اور تمھارا باپ ابھی سرگرمِ سفر ہے)

عزیزم مرحوم اپنے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے، ان کے دادا صاحب عم محترم مولوی سید خلیل الدین صاحب کو جو خاندان کے سب سے باوجاہت اور صاحبِ املاک فرد تھے، اور جن کو قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور نام نامی سے ایسی عقیدت اور ربط قلبی تھا کہ وہ اپنے سب پوتوں کے نام اسی نام نامی پر رکھنا چاہتے تھے، ان کے سب سے بڑے پوتے۔ جو سید محمود حسن کے نام سے مشہور ہوئے اور عین عنفوانِ شباب میں ان کا انتقال ہوگیا۔ کا اصلی نام بھی محمد تھا، اس لیے اس دوسرے پوتے کا نام انھوں نے امتیاز کے لیے محمد ثانی رکھا، ان کی ولادت پر ان کی والدہ نے (جو میری حقیقی بڑی بہن ہیں بارک اللہ فی حیاتہا) خواب میں میرے والد صاحب کو جن کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد یہ بچہ تولّد ہوا تھا دیکھا کہ وہ بچہ کو گود میں لیے ہوئے تھیں، والد صاحب نے اس کے ایک پاؤں

(۱) عزیز مرحوم کی ولادت دسمبر ۱۹۲۵ء میں ہوئی جب میری عمر بارہ سال کی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کے تلوے پر ''مبارک قدم'' لکھ دیا، بچپن ہی سے رشد وصلاحیت اور غیر معمولی سنجیدگی اور متانت کے آثار نمایاں تھے، مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ۱۹۳۴ء میں میرے ساتھ جب ان کی عمر ۹ سال تھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اسی کمرہ میں اپنے بڑے بھائی سید محمود حسن مرحوم کے ساتھ رہنے لگے جس میں میرا اور مولانا مسعود عالم ندوی کا قیام تھا، اور اس طرح وہ ''عربی رسالہ ''الضیاء'' کا دفتر اور عربی زبان وادب کا ذوق رکھنے والے اساتذہ اور ہونہار طلبہ کا مرکز بن گیا، جہاں ہر وقت علمی وادبی گفتگو ہوتی تھی، کتابوں اور شخصیتوں پر تبصرے اور عالم اسلام کے حالات پر اظہارِ خیال اور اظہارِ تاثر ہوتا تھا، مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم ان کی سنجیدگی اور شائستگی اور میرے اور برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء کے تعلق کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کا بہت پاس ولحاظ رکھتے تھے، ان کی ابھی باقاعدہ عربی تعلیم شروع نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۳۳ء میں مؤتمر اسلامی فلسطین کا ایک موقّر وفد جس کی قیادت زعیم فلسطین اور مجاہد اسلام الحاج سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین فرمارہے تھے، اور اس کے رکن رکین استاد محمد علی علوبہ باشا (سابق وزیر اوقات مصر اور وہاں کی ایک مشہور سیاسی پارٹی حزب الاحرار الدستوریین کے صدر ولیڈر) تھے، مفتی صاحب اور علوبہ باشا نے ندوۃ العلماء کو بھی اپنے قدوم سے نوازا اور ان کے اعزاز واستقبال میں ایک بڑا جلسہ ندوہ کے وسیع ہال میں ہوا، استقبالیہ اور جوابی تقریروں کے بعد یہ حضرات فارغ ہوکر جب چلنے لگے تو انھوں نے مجھ سے (جو ان کی آمد اور جلسے کے سلسلے میں پیش پیش تھا) کمسن بچوں کو جو جلسے میں تماشائی کی حیثیت سے شریک تھے، دیکھ کر پوچھا کہ کیا یہ عربی سمجھتے ہیں؟ میں نے ہمت کرکے کہہ دیا کہ ہاں، ان کے سامنے ایک کمسن بچہ۔ جس کی عمر اس وقت آٹھ نو سال کی تھی۔ پڑ گیا، انھوں نے اسی سے عربی میں فرمایا: ''ما اسمك؟'' خلاف توقع اس بچہ نے جس نے ابھی عربی شروع نہیں کی تھی برجستہ جواب دیا: ''اسمی محمد الثانی'' وہ بڑے خوش ہوئے، انھوں نے اس کو یاد رکھا اور بعض موقعوں پر اس کا ذکر کیا، یہ ان کی زندگی میں پہلا اہم واقعہ تھا، جس پر فارسی کا یہ

www.abulhasanalinadwi.org

شعر پڑھا جاسکتا ہے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

جب وہ عربی پڑھنے کے قابل ہوئے تو دارالعلوم میں باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، یہ وہ ابتدائی دور تھا جس میں ہمارے استاد ڈاکٹر علامہ تقی الدین الہلالی ندوہ میں رونق افروز اور مصروفِ افادہ تھے، کچھ عرصہ وہ دارالعلوم کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر ہمارے محلے کی مسجد میں رضا کارانہ طریقہ پر بچوں کو عربی سکھانے کا کلاس جاری کیے ہوئے تھے، اس میں مرحوم بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ شریک ہوتے تھے، ہلالی صاحب کی تربیت میں ایک نوعمر مدنی شریف زادہ عطیہ نامی تھے، وہ عمر کی مناسبت اور مزاج کی شگفتگی کی وجہ سے ہمارے خاندان کے بچوں سے بہت جلد مانوس ہو گئے، وہ رائے بریلی بھی آتے اور چھٹیوں میں طویل قیام کرتے، محمد ثانی مرحوم نے ان سے بھی استفادہ کیا، ان کے علاوہ علامہ ہلالی کے چھوٹے بھائی شیخ محمد العربی المراکشی ہمارے رفیق کار اور ہم عمر دوست تھے، وہ بھی رائے بریلی آتے اور دنوں قیام کرتے، محمد ثانی مرحوم نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا، اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ اُن پر شفقت کرتے تھے۔

اس زمانے میں ہمارے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم اے استاد اورینٹل کالج لاہور محمد ثانی مرحوم کی سلامتِ طبع، بے نفسی اور سعادت مندی دیکھ کر ان پر بہت شفیق ہو گئے، وہ اکثر ان کو اپنے ساتھ رکھتے اور شہر میں آنے جانے میں اپنے ساتھ لے جاتے، ان کی صحبت اور شفقتِ خصوصی سے مرحوم کو بڑا علمی فائدہ پہنچا اور ذہنی نشو ونما، علمی مناسبت اور معلوماتِ عامہ میں بیش بہا اضافہ ہوا کہ مولانا سید طلحہ صاحب ایک زندہ اور متکلم دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تھے، اور تاریخ، تراجم وسوانح اور طبقاتِ رجال پر تو ان کو ایسا عبور تھا کہ ہندوستان میں چند ہی آدمی مشکل سے اُن کے ہمسر ہوں گے، ان کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو ایک وسیع اسلامی ثقافت کا حصہ ملتا تھا، جس میں تاریخ بھی داخل تھی، حدیث بھی،

www.abulhasanalinadwi.org

تصوف بھی، ادب بھی، شعروشاعری کا ذوق بھی اور صحت منداور مہذب تنقید بھی، اسلاف اور علمائے متقدمین کا احترام، ان کی مرتبہ شناسی بھی، اور فلسفہ واعتزال اور قدیم ترقی پسند اور متجددانہ سطحی وخام خیالات وافکار سے بیزاری بھی، خودراقم الحروف کو بھی ان کی تعلیم اوراس سے زیادہ ان کی مجالس سے وہ فائدہ پہنچا جو سو، پچاس کتابوں کے پڑھنے سے بھی مشکل سے حاصل ہوتا، مولانا طلحہ صاحب محمد ثانی مرحوم کی نیک مزاجی اور سلیم الطبعی سے خاص طور پر متاثر تھے، بعد میں بھی بڑے معنی خیز انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ علی نے تو کتابوں کے مطالعے، قصد وارادے اور غور وفکر سے اپنی اصلاح کی اور اپنے اندر صلاح پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن محمد ثانی کو پیدائشی طریقے پر بلاارادہ ومحنت یہ بات حاصل ہے، مولانا طلحہ صاحب نے اسی زمانے میں جب محمد ثانی کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی، ابھی ابتدائی درجوں میں پڑھتے تھے، خاص طور پر تین چیزوں میں ان کو تیار کیا، ایک فرائض علم المیراث اور سہام (ترکہ کے حصے) نکالنا، دوسرے ضروری نحوی وصرفی مسائل، تیسرے مشاہیر اسلام کے سنینِ وفات، اس میں انھوں نے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا کہ مماثل سنین میں جن لوگوں کی وفات ہوئی اس کو یاد کراتے تھے، مثلاً امام غزالیؒ کا سنہ وفات ۵۰۵ھ، امام رازیؒ کا سنہ وفات ۶۰۶ھ وقس علی ذالک، اس طرح اس نوعمری میں ان کے اندر تاریخی شعور بیدار ہوا اور سوانح لکھنے کا وہ سلیقہ جس کا پورے طور پر اظہار ''سوانح مولانا محمد یوسفؒ'' اور ''حیات خلیل'' میں ہوا۔

غالبًا وہ دارالعلوم کے چھٹے ساتویں درجے میں پڑھتے تھے کہ مولانا سید طلحہ صاحب نے جن کا قیام لاہور میں تھا، لاہور کی دعوت دی جس کو ہم سب کے مربی مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم نے اس شرط پر قبول کرلیا کہ وہ ان کو کوئی مشرقی امتحان (مولوی، عالم، فاضل وغیرہ کا) نہیں دلائیں گے جس کی اس زمانے میں ایک ہوا چلی ہوئی تھی، اوراس کے ذریعے سے لوگ انگریزی کے امتحانات دے کر سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوتے تھے، بھائی صاحب مرحوم اصولاً اس لائن کو غلط اور دینی وعلمی

www.abulhasanalinadwi.org

صلاحیتوں کے ضیاع کا مرادف سمجھتے تھے، محمد ثانی مرحوم لاہور گئے، اور اس ابتلاء سے نہیں بچ سکے، مولانا سید طلحہ صاحب کے ایماء سے جن کے مدِ نظر اس میں بہت سے فوائد تھے، انھوں نے مولوی عالم کا امتحان دیا، اس میں آسانی سے کامیاب ہو گئے، لاہور کے قیام میں مولانا سید طلحہ صاحب کی وساطت سے بڑی بڑی شخصیتوں سے ملے، جن میں سر شیخ عبدالقادر صاحب کا خاص طور پر ذکر کرتے تھے، حضرت مولانا احمد علی صاحب کی مجالس اور مواعظ سے بھی فیض یاب ہوئے اور لاہور سے جو اس وقت سب سے بڑا ثقافتی مرکز تھا، انھوں نے علمی، ادبی فائدہ اٹھایا۔

وہ جب لاہور سے واپس ہوئے تو خدا نے میرے دل میں یہ خیال ڈالا کہ یہ کچھ عرصے کسی بزرگ کی صحبت میں رہیں اور فنِ حدیث کو باقاعدہ کسی کامل الفن محدث سے حاصل کریں تاکہ ان کے دینی ملکات صحیح طور پر نشو و نما حاصل کریں اور خاندان میں جو عرصے سے کسی روحانی شخصیت سے محروم ہے، ایک ایسے فرد کا اضافہ ہو جس سے خاندان کا فیض دوبارہ جاری ہو، اس سلسلے میں قدرتاً میری نظر مخدومنا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب پر پڑی جن سے ۱۹۴۰ء سے ہم سب کا عقیدت اور محبت کا تعلق قائم ہو چکا تھا، بھائی صاحب مرحوم نے بھی اس کو پسند کیا اور میں نے ایک خط کے ساتھ ان کو سہارنپور روانہ کر دیا، جس میں میں نے لکھا کہ مجھے امید ہے کہ حضرت، محمد ثانی پر خاص نظر شفقت فرمائیں گے اور ان کو استفادہ اور استفاضہ کا پورا موقع دیں گے، حضرت شیخ کا اس کے جواب میں خط آیا جس میں انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور لکھا کہ مولوی صاحب! میں تمہیں ایک تجربے کی بات بتاؤں کہ یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے، عزیز موصوف کے اختیار میں ہے کہ وہ مجھے متوجہ کر لیں اور پورا فائدہ اٹھائیں، الحمدللہ یہ بات اسی طرح ہوئی کہ محمد ثانی مرحوم نے بہت جلد حضرت شیخ کے یہاں ایسا قرب و اختصاص پیدا کر لیا جو بہت سے برسوں سے رہنے والے طلبہ کو حاصل نہیں تھا، اس کا اظہار حضرت شیخ کے ان گرامی ناموں سے ہوتا ہے جو کثیر تعداد میں راقم کے پاس محفوظ ہیں، اور اس زمانے کے

www.abulhasanalinadwi.org

لکھے ہوئے ہیں، انھوں نے باقاعدہ دورے کی جماعت میں داخلہ لیا اور مظاہر العلوم کے مکمل طالب علم بن گئے، اور کامیابی کے ساتھ امتحان پاس کیا اور سند لی۔

حضرت شیخ کے ماسوا مظاہر العلوم کے صدر مدرس عالم ربانی اور شیخ کامل مولانا اسعد اللہ صاحب کی بھی ان پر خاص نظرِ عنایت تھی، انھوں نے یا ان کے رفیقِ درس عزیز گرامی مولوی سید محمد مرتضیٰ نقوی ناظرِ کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب طلبہ کی کسی شکایت پر دار الاقامہ تشریف لائے، وہاں لڑکوں نے کچھ بلند آواز سے بولنا شروع کیا، محمد ثانی سو رہے تھے، مولانا نے فرمایا کہ آہستہ بات کرو، سید صاحب سو رہے ہیں، میں نے خود بھی دیکھا کہ بعد میں بھی وہ عزیز مرحوم سے بہت خصوصیت اور شفقت کے ساتھ ملتے تھے۔

مظاہر العلوم کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ لکھنؤ آ گئے اور انھوں نے وہیں اپنے ماموں صاحب کے مطب کی عمارت کے ایک کونے میں مکتبۂ اسلام کے نام سے ایک چھوٹا سا مکتبہ قائم کر لیا، اور اس سے دینی کتابوں، خاص طور پر اپنے خاندان کے بزرگوں کی دینی و اصلاحی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا، ان کے اس کام سے حضرت شیخ بھی بہت مسرور تھے، جن کا ذوق بھی یہی تھا اور اسی غرض کے لیے انھوں نے اپنے والد صاحب کی یادگار کتب خانہ یحیوی کو قائم رکھا تھا۔

مکتبہ اور اشاعت کے اس کام کے علاوہ انھوں نے مرکز نظام الدین کی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ لینا شروع کیا، اور ان کو بہت جلد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کا قرب اور اعتماد حاصل ہو گیا، وہ اکثر ان کے میوات کے سفروں میں ساتھ ہوتے تھے، لکھنؤ کے کام میں بھی جس کا اس وقت مرکز ندوۃ العلماء کی مسجد اور بعد میں کچہری روڈ کا مرکز تھا، شرکت اور رفاقت جاری رکھی، اور اس میں ان کے اس دعوت کے اصول و مزاج کو اخذ کر لینے کی وجہ سے بہت جلد خصوصی مقام حاصل ہو گیا اور اکثر میری اور مولانا منظور صاحب کی نیابت کرنے لگے۔

۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں جب حجاز میں تبلیغی کام کو (جو کئی سال سے جاری تھا) اہل عرب اور علمی وادبی حلقوں میں متعارف کرانے کے لیے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف سے میرے حجاز جانے کا ایما ہوا اور حضرت شیخؒ کی طرف سے اس کی تائید، تو میں نے اپنے ساتھ والدہ محترمہ اور اہلیہ کو بھی ساتھ لینے کا قصد کیا کہ وہ بھی میرے ساتھ حج کی سعادت سے مشرف ہو جائیں، بعد میں ہمشیرہ مرحومہ سیدہ امۃ اللہ تسنیمؒ مصنفہ "زادِ سفر" بھی اس قافلہ میں شامل ہو گئیں، حضرت شیخؒ نے اپنی خداداد فراست اور ذہانت (جس میں ان کو اپنے اقران وا ماثل میں امتیاز حاصل تھا) یہ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے گھر والوں کے ساتھ جا رہے ہو، مستورات کا ساتھ ہے، تمھیں وہاں ان کی موجودگی میں دعوت کے کام کے لیے یکسوئی اور فراغِ خاطر حاصل نہیں ہوگا، اور اگر تم نے اس کے لیے اپنے کو فارغ کر لیا تو رفقائے سفر کو تکلیف اور پریشانی ہوگی، اس لیے تم اپنے ساتھ، رفیق ومعاون کے طور پر محمد ثانی کو لے جاؤ، اس عرصے میں حضرت شیخؒ کو عزیز مرحوم سے خاصی مناسبت ہو گئی تھی، اور وہ ان کی فطری خصوصیات سے، ایک صاحبِ نظر اور تجربہ کار، شیخ ومربی کی حیثیت سے باخبر تھے، حضرت شیخؒ کا یہ مشورہ نہایت صائب اور بڑی دقیق النظری پر مبنی تھا۔

ہمارا مختصر قافلہ ۲۶ / رجون ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوا اور جنوری ۱۹۴۸ء کی آخری تاریخوں میں ہندوستان واپس ہوا، مسافت اور مدت دونوں کے لحاظ سے یہ طویل وقفہ اور اس کی شب وروز کی رفاقت، قریب ترین اور عزیز ترین رفقاء کی بھی مزاجی ناہمواریوں، اور باطنی کمزوریوں سے واقف ہونے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے، حضرت عمرؓ کے حالات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے ان سے اپنے کسی دوست کی تعریف کی، انھوں نے فرمایا کہ کبھی تم سے اس کا معاملہ پڑا؟ اس نے کہا کہ نہیں، فرمایا کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ کہا نہیں، فرمایا کہ پھر تمھارا یہ تاثر اور فیصلہ قابل اعتبار نہیں، اس سفر میں مرحوم کی جو سب سے بڑی صفت دیکھنے میں آئی وہ ان کی بے نفسی اور حُبِّ جاہ سے عدم مناسبت تھی، انھوں نے اس پورے سفر میں اپنی رفاقت کا مقصد، اپنے بزرگ شرکائے قافلہ کی خدمت واعانت

www.abulhasanalinadwi.org

قرار دیا، اور اپنے کو کسی اعزاز اور امتیاز کا مستحق نہیں سمجھا، بازار سے سودا لانا، مستورات کو جن میں سے ایک ان کی حقیقی نانی، ایک حقیقی خالہ اور ایک ممانی تھیں، مسجد نبوی اور حرم شریف میں لے جانا، عورتوں کے حصے میں ان کو بٹھانا، مواجہ شریف پر سلام پیش کروانا، جس کی دقتوں سے وہ لوگ واقف ہیں جنھوں نے اپنی مستورات کے ساتھ کبھی حج کیا ہے، خاص طور پر مکہ معظمہ میں حج سے پہلے، پہلے ہمارا قیام رباط ٹونک محلہ شامیہ میں تھا، جس کا حرم شریف سے خاصا فاصلہ ہے، لیکن وہاں بھی اس کی پابندی کرتے رہے، اور کبھی ان کی پیشانی پر ادنیٰ شکن نہیں آئی، بلکہ وہ سمجھتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوگنا سعادت کا موقع دیا (حج و زیارت اور بزرگوں کی خدمت)۔

اپنی اس مصروفیت کے ساتھ وہ میرے ساتھ اہم مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے، خاص طور پر امام حرم اور خطیب اوّل شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کی بعدِ عصر کی مجلس میں جو حرم شریف ہی کے ایک بالائی حصے میں ہوتی تھی شرکت کرتے تھے، ان کے علاوہ دوسرے علمائے مکہ علامہ سید علوی مالکی، شیخ محمد العربی المغربی، شیخ حسن مشّاط، سید امین الکتبی کی علمی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے، ایک دوبار وہ ملک عبدالعزیز ابن سعود کے بھائی امیر مساعد کی مجلس میں بھی میرے ساتھ گئے، حج کے بعد ہم لوگ باب ابراہیم پر مدرسہ فخریہ کے مکان پر منتقل ہوگئے اور بُعدِ مسافت کی وہ زحمت جاتی رہی، لیکن طواف و عمرے کی ذمہ داری پھر بھی عزیز مرحوم ہی کی تھی۔

مدینہ طیبہ کے قیام میں مجھے خیال آیا کہ ''زادالمعاد'' کا انتخاب کروں، اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس میں سیرت کے واقعات کے ساتھ فقہی، نحوی، کلامی اور لغوی مباحث مخلوط ہیں، میرا عرصے سے خیال تھا کہ سیرت کے واقعات کو الگ کرلوں، پھر کبھی موقع ہوا تو فقہی مسائل اور محدثانہ تحقیقات کو مرتب کرلیا جائے گا، مدینہ طیبہ کے قیام کو سیرت کے موضوع سے خاص مناسبت ہے، میں نے بنام خدا یہ کام شروع کردیا اور ''خیر الزاد'' کے نام سے ایک انتخاب مرتب کرنے کا آغاز ہوگیا، معمول یہ تھا کہ ریاض الجنہ میں ہم دونوں بیٹھ

جاتے، میں بولتا اور محمد ثانی مرحوم لکھتے، جب غزوۂ اُحد کے بیان کی باری آئی تو خیال ہوا کہ یہ حصہ اُحد ہی میں مرتب کیا جائے، جبل اُحد کے قریب شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے برادرِ اصغر مولانا سید محمود صاحب کا ایک مکان تھا، جو قصر ابیض کہلاتا تھا، مولانا ہی نے ہم لوگوں کو مدرسہ علوم شرعیہ کے ایک مکان میں جگہ دی تھی، ہم نے ان سے ان کے قصر ابیض میں ایک رات گزارنے کی اجازت لی، جو انھوں نے بخوشی منظور کی اور ہم اپنے سب گھر والوں کے ساتھ شام ہی کو وہاں چلے گئے، کھانا پکانے کا سامان بھی ساتھ لے گئے، میں نے ''زادالمعاد'' سے اُحد کا بیان سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک کے قریب ترکوں کی بنائی ہوئی جو مسجد تھی، اس میں لکھنا شروع کیا، اس حصے کو پورا کرنے کے بعد ہم لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، جہاں تک یاد ہے، مرحوم نے اپنے لیے شہادت کی دعا کی، اور اندازہ ہے کہ وہ قبول ہوئی، مرحوم نے اپنے مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانے میں بقیع شریف آنے جانے کا بڑا معمول رکھا، وہ وہاں کے آسودگانِ خاک پا کی قبور، ان کے جائے وقوع کی ترتیب سے ایسے واقف ہوگئے تھے کہ ان کو اس کا حافظ کہا جاسکتا ہے، مرحوم نے اسی سفر میں سفرنامہ بھی لکھنے کا معمول رکھا جو بڑا موثر اور پُر از معلومات ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوسکا۔

پہلے سفر حجاز ۱۹۴۷ء سے ہندوستان واپسی کے بعد اللہ تعالیٰ کو ان کی تواضع، حرمین شریفین کا ادب اور وہاں کے قیام سے فائدہ اٹھانے اور وقت کو کام میں لگانے کی حرص معلوم ہوتا ہے ایسی قبول ہوئی کہ ایک حج گزرنے کے بعد پھر ۱۹۴۹ء میں ان کو وہاں دوبارہ حاضری کا موقع دیا اور غیب سے انتظام فرمایا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے حج کا قصد فرمایا، ان کو اپنے کسی عزیز کی طرف سے حج بدل کرانے کی پیش کش ہوئی، اس کے لیے انھوں نے عزیزی محمد ثانی مرحوم کا انتخاب کیا کہ وہ فریضۂ حج سے فارغ بھی ہوچکے تھے، اس سفر اور فریضہ کی ذمہ داریوں اور نزاکتوں سے واقف بھی تھے، اور مولانا ان کے صلاح وصلاحیت سے متاثر بھی، اس سفر میں انھوں

www.abulhasanalinadwi.org

نے نہ صرف حج بدل کی خدمت انجام دی بلکہ مولانا کو ان سے مدد و سہولت بھی حاصل ہوئی، جس سے مولانا اخیر تک متاثر اور اس کے معترف رہے، اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے جو مرحوم کی وفات پر "الفرقان" میں لکھا ہے۔

اس ۱۹۴۹ء کے بعد سے ۱۹۸۰ء تک ان کو وہاں دوبارہ حاضری کا موقع نہیں ملا، ان کے دونوں بھائی عزیزان محمد رابع اور محمد واضح سلمہما اکثر میری معیت میں میرے معاون اور رفیق کے طور پر متعدد بار وہاں حاضر ہوئے، انھوں نے ایک موقع پر اپنے عزیز بھائی محمد رابع کو مخاطب کر کے کچھ شوقیہ اور دعائیہ اشعار بھی کہے اور ان کو حجاز بھیجے، جس سے ان کے دلی جذبے کا اظہار ہوتا ہے، میں اس توفیق پر ہمیشہ خدا کا شکر ادا کروں گا کہ ۱۹۸۰ء میں جب مجھے رابطہ کی ایک مجلس "المجمع الفقهي" میں شرکت کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا تو میں نے اپنے رفیق کے طور پر (جس کو ساتھ لینے کی رابطہ ہمیشہ اجازت دیتا ہے اور انتظام کرتا ہے) محمد ثانی مرحوم کا انتخاب کیا، اس انتخاب میں برادر عزیز سید حسن عسکری طارق کی تحریک کو بھی دخل تھا، اور اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ حضرت شیخ کی علالت نازک مرحلے سے گزر رہی تھی، خیال ہوا کہ وہ عمرہ بھی کر لیں گے، مدینہ طیبہ حاضری بھی ہو جائے گی، اور حضرت شیخ کی خدمت میں ان کو کچھ دن رہنے کا موقع بھی مل جائے گا، طارق صاحب بھی ہندوستان سے اس سفر میں ساتھ تھے، مکہ معظمہ میں قیام، حرم شریف کے سامنے اور باب الہجرہ اور باب العتیق کے بالمقابل فندق الفتح میں تھا، جس کی وجہ سے حرم شریف میں حاضری کی بڑی سہولت تھی، مرحوم نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور تقریباً تمام مرحوم بزرگوں اور خاندان کے اسلاف و مشائخ کی طرف سے طواف کیے، جن کی تعداد روزانہ ایسی ہوتی تھی کہ کوئی جفاکش، عالی ہمت ہی اس کو پورا کر سکتا تھا، شیخ کی علالت کے خیال اور ان سے ملنے کے شوق میں ہم لوگوں نے مکہ معظمہ کا قیام مختصر رکھا، مدینہ طیبہ میں غالباً جامعہ اسلامیہ کی کمیٹی بھی تھی، جس میں مجھے شرکت بھی کرنی تھی، ہم لوگ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، عرصۂ دراز سے میرا قیام شارع ابی ذر، باب التمار

www.abulhasanalinadwi.org

کے سامنے بستان نورولی میں رہتا ہے، وہاں سے مسجد نبوی کا فاصلہ ہے، میں اپنی کمزوری کی بنا پر پانچوں وقت موٹر سے جایا کرتا تھا، لیکن جہاں تک یاد آتا ہے، وہ موٹر پر بیٹھ کر وہاں جانے سے امکانی حد تک بچتے تھے، اور ہمیشہ پیدل حاضری دیتے تھے، فجر کی نماز کے بعد وہ پابندی سے حضرت شیخ کی مجلسِ ذکر میں حاضری دیتے اور شریک رہتے، حضرت شیخ بھی ان کے آنے سے بہت مسرور ہوئے اور حسبِ معمول بڑی شفقت فرمائی، اس کے بعد ان کا حضرت شیخ سے ملنا نہ ہوا۔

ہندوستان واپسی کے بعد انھوں نے حضرت شیخ سے اپنا تعلق قائم رکھا بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ اور ترقی ہوتی رہی اور شیخ کو ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کا بھی علم ہوا جس کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات پر ان کی سوانح لکھنے کا نازک اور دشوار کام ان کے سپرد کیا، جو لوگ اس دعوت کے مزاج اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے وہبی کمالات وجذبات، دعوت کی وسعت وعالمگیری سے واقف ہیں وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ کام کتنا وسیع اور عظیم تھا، انھوں نے یہ سوانح تھوڑی مدت میں مرتب کرلی جو آٹھ سو چار صفحات میں آئی، کہا جاسکتا ہے کہ کسی معاصر تحریک ودعوت کی تاریخ، اس کے اثرات وفتوحات اور معاصرین میں سے کسی داعی کی سوانح اتنی تفصیل سے اُردو میں مرتب نہیں ہوئی ہوگی، اس کتاب کی تالیف سے ان کے شیخ ومرشد کو (جن کو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے غیر معمولی تعلق تھا) جو خوشنودی اور خنک چشمی اور ان کی جو دعائیں حاصل ہوئی ہوں گی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، ان کی سعادت مندی تھی کہ انھوں نے اس کتاب میں حضرت شیخ کے حالات کا حصہ بجائے خود لکھنے کے مجھ سے لکھوایا، وہ اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے، اور اس نازک ذمہ داری کو قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے، اس زمانے میں ان کی نظر خاصی کمزور ہوچکی تھی، اور وہ زیادہ لکھنے پڑھنے کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے، لیکن انھوں نے اس کی بالکل پروانہیں کی، یہ کام پورے طور پر ان کے دل ودماغ اور اعصاب پر مستولی ہوگیا، اور اس وقت تک انھوں نے قلم نہیں رکھا جب تک پورا

www.abulhasanalinadwi.org

نہ ہو گیا، یہ سوانح ہندوستان اور پاکستان میں بار بار چھپی اور اس کی حیثیت صرف ایک تاریخی دستاویز کی نہیں ہے، بلکہ ایک شوق انگیز اور حوصلہ خیز دعوتی کتاب کی بھی ہے، انھوں نے اتنا ہی اپنی سعادت مندی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ جب مولانا محمد یوسف صاحب کے فرزند گرامی مولوی محمد ہارون مرحوم نے عین عنفوان شباب میں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کو بالخصوص حضرت شیخ کو (جو ان کے حقیقی نانا تھے) داغ مفارقت دیا، اور ان کو حضرت شیخ کے قلبی تقاضے کا علم ہوا تو انھوں نے ان کی بھی ایک مختصر سوانح لکھی، ان دونوں کتابوں کے بعد حضرت شیخ نے اس سے بھی بڑا کام ان کے سپرد کیا کہ اپنے مربی و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی از سر نو سوانح کی ترتیب کا نازک و دشوار کام ان کے سپرد کیا، نازک اس لیے کہ حضرت کے خلیفہ اور مرید باختصاص مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کے قلم سے (جو ایک کہنہ مشق مصنف، بلند پایہ عالم تھے) مستقل سوانح ''تذکرۃ الخلیل'' کے نام سے موجود ہے، لیکن ہر زمانے کی ایک زبان اور اسلوب ہوتا ہے، حضرت شیخ کا ایما ہوا کہ نو عمری اور اس بات کی موجودگی میں کہ انھوں نے حضرت کی زیارت ہی نہیں کی نہ ان کا زمانہ پایا، سوانح ترتیب دی، انھوں نے اس کام کو بھی ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور ''حیات خلیل'' کے نام سے کتاب کی تکمیل سے فراغت پائی کہ حضرت شیخ نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور بڑی دعائیں دیں، ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''بعد سلام مسنون! تمھاری تالیف ''حیات خلیل'' کا مسودہ مدینہ پاک میں پہنچ کر موجب مسرت ہوا تھا، میں اس کو سن سن کر وہاں سے ہی واپس کرتا رہا، اللہ تعالیٰ تمھاری اس محنت کو قبول فرما کر دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے، ماشاء اللہ تم نے بڑی محنت و کاوش سے حالات تحقیق کے بعد جمع کیے''۔
>
> (مکتوب مورخہ ۲۱ر رجب ۱۳۹۶ھ) از سہارن پور ''حیات خلیل''

اس سعادت مندی اور اطاعت شعاری اور اپنے تصنیفی علمی مشاغل کے ساتھ وہ اپنے سلسلۂ اذکار و اشغال میں بھی برابر مشغول رہے، اور کثرت سے سہارن پور حاضری

www.abulhasanalinadwi.org

دیتے رہے، جب تک مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری حیات رہے، وہ رائے پور بھی حاضری دیتے اور کئی کئی روز قیام کرتے، حضرت نہ صرف میرے تعلق اور نسبت کی بنا پر بلکہ ان کی صلاحیت وسلامت روی اور استعداد کی بنا پر اُن پر خصوصی توجہ اور شفقت فرماتے تھے، اس سب کا نتیجہ قدرتاً یہ نکلا کہ حضرت شیخ نے سہارن پور کے ایک رمضان کے قیام میں ان کو اجازت مرحمت فرمائی، حضرت شیخ کے ان کے بارے میں تأثرات وتعلق کا خاص اندازہ ایک تعزیتی مکتوب سے ہوسکتا ہے جو میری مرتب کی ہوئی سوانح حضرت شیخ الحدیث کے صفحہ ۱۷۰-۱۷۴ پر دیکھا جاسکتا ہے، اس میں ارشاد فرماتے ہیں ''اس وقت رہ رہ کر عزیز مرحوم کی خوبیاں اور باتیں یاد آرہی ہیں، اور آپ کا بھی خیال بار بار آرہا ہے کہ آپ پر کیا گزری ہوگی''۔

اللہ تعالیٰ نے عزیز مرحوم کو جو بھی محاسن اور صلاحیتیں اور اکتسابی کمالات عطا فرمائے تھے، ان میں سے ایک صلاحیت وکمال کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جس سے کم سے کم مجھ راقم السطور کو کوئی حصہ نہیں ملا، وہ ان کی طبیعت کی موزونیت اور شعرگوئی وسخن سنجی کی قابلیت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بہت آسان کردی تھی، ان کی صورت وسیرت دیکھ کر ہی ان کی خاموشی اور قناعت کو سامنے رکھ کر کوئی آسانی سے مان نہیں سکتا کہ یہ ان کا کلام ہے، میں خود بھی بارہا تصویر حیرت بن گیا کہ انھوں نے بہت جلد ایک نظم لکھ دی، مثال کے طور پر ان کا نعتیہ کلام جو علاحدہ سے بھی شائع ہوگیا ہے، اور وداعِ رمضان کی وہ نظم پڑھی جائے جو انھوں نے اپنے شیخ کے سہارن پور میں رمضان گزارنے کے موقع پر کہی تھی، یہ نظم جو مولانا معین الدین صاحب نے بلند آواز سے پڑھی (میں بھی اس وقت حاضر تھا) تو ایک سماں بندھ گیا اور شیخ پر ایک اثر معلوم ہوتا تھا، نظم کا مطلع ہے ؎

رحمت حق آئی قسمت ور چلے　　　سجدہ ریزی کو خدا کے گھر چلے

اس نظم کے تین شعر سنتے چلیے ؎

نور سمٹا چاندنی پھیلی پڑی　　　سر چھپانے کو مہ واختر چلے

www.abulhasanalinadwi.org

ماہ رحمت کے شب وروز وسحر　　ہر طرف تم نور برسا کر چلے
تم سے ملتی تھی دلوں کو تازگی　　تم چلے ارمان سارے مر چلے

آخری دو شعر جن میں انھوں نے خواجہ میر دردؔ کے مشہور شعر کو شامل کیا ہے، جب پڑھے گئے تو آنکھیں اشکبار تھیں۔

اور بھی کچھ اور بھی کچھ اور بھی　　جانے کب دربند ساقی کر چلے
ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ایک زمانے میں عزیزان مولوی اسحاق جلیس ندوی مدیر تعمیر حیات اور عزیز القدر محمد میاں مرحوم نے مشورہ کیا کہ ندوہ کا کوئی ترانہ ہونا چاہئے جو اس کی تقریبات اور جلسوں میں پڑھا جائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ترانہ کے بعد جو مجاز ردولوی کا کہا ہوا ہے، مشکل سے توقع کی جاسکتی تھی کہ کوئی برجستہ اور پر اثر ترانہ کسی عربی مدرسے کا کہا جاسکتا ہے، مرحوم نے ترانہ نظم کیا اور ایسا نظم کیا کہ اس کے بعد اس کی تقلید کی بہت کوشش کی گئی لیکن میرے علم کی حد تک کسی ادارہ یا مدرسہ کا ترانہ ابھی تک ایسا برجستہ اور پُر اثر نہیں سنا گیا۔

ان کی طبیعت کی موزونیت اتنی وسیع اور کامل تھی کہ وہ عربی میں بھی شعر کہہ لیتے تھے، عربی لکھ بھی لیتے تھے، اور آل انڈیا ریڈیو سے ان کی متعدد تقریریں بھی نشر ہوئیں۔

مرحوم کا ایک خاص وصف ان کی جامعیت بھی تھی، عام طور سے علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والوں کو زمین و جائداد کے انتظام اور تعمیرات وغیرہ کاموں سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، لیکن مرحوم اپنی ساری علمی اور تحریری مشغولیتوں کے ساتھ ایک اچھے منتظم اور کاموں کے نگراں تھے، تعمیر کے کام سے بھی ان کو بڑی مناسبت تھی، اور ان کی ہدایت اور منصوبے کے مطابق بعض اچھی تعمیرات ہوئیں، ان کے دونوں بھائی (سلمہما اللہ تعالیٰ) عزیزان مولوی محمد رابع ندوی اور مولوی محمد واضح ندوی تعلیم و مطالعہ اور تحریر و تصنیف میں مشغول رہتے تھے، زمینوں کا انتظام، آب پاشی کا انصرام، باغات کی فصلوں کی فروخت کا سارا کام وہ تنہا انجام دیتے تھے، اور ان کے کارپرداز اور ملازمین عام طور سے خوش رہتے تھے۔

ان کی زندگی کا آخری کارنامہ اور یادگار موضع تینڈوا (حال امین نگر) میں جو ہم لوگوں کے قدیم آبائی وطن نصیر آباد کے جوار میں ہے، اور ہمارے خاندانی بزرگوں اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے کے مشائخ اور مصلحین بالخصوص یادگار سلف حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی کی کوششوں کے اثرات ابھی تک وہاں موجود ہیں لیکن ان میں انحطاط کے آثار شروع ہو چکے ہیں، مدرسہ فلاح المسلمین کا قیام ہے، جو ۲/دسمبر ۱۹۶۶ء کو عمل میں آیا، جس کا ندوۃ العلماء سے الحاق ہے، وہ اس کے بانی اور ناظم اول تھے، ان کا اس سے شغف اور تعلق روز بروز بڑھتا جارہا تھا، یہاں تک کہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو اس سے اولاد کا سا تعلق پیدا ہو گیا تھا، وہ دن رات اس کی ترقی وتوسیع کی فکر میں رہتے تھے، اور غالباً سوتے میں خواب بھی اس کا دیکھتے ہوں گے، عمارتوں کی تکمیل طلبہ کی اخلاقی تربیت، اساتذہ کے تعلقات کی استواری، قرب وجوار میں تبلیغ واصلاح کی کوششیں، ہر وقت ان کے مدِ نظر رہتی تھیں، اس کے سالانہ جلسے بڑے ذوق وشوق سے کرتے تھے، اور اس میں ندوہ کے اساتذہ اور باہر کے علماء کو بھی بلاتے تھے، ان کی زندگی میں اس کی مسجد کی تکمیل ہو گئی، اور متعدد پختہ عمارتیں بھی بن گئیں، لیکن وہ اس کو ایک دارالعلوم اور مرکزِ دعوت وارشاد بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے(۱) کہ وہ اس خوابِ زندگی سے بیدار ہو کر اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے کہ:۔

"الناس نیام فإذا ماتوا انتبهوا"

ان کی دینی خدمات میں سے ایک رسالہ "رضوان" کا اجراء بھی ہے، جو انھوں نے اپنی محترم خالہ صاحبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیمؒ عرف عائشہ بی کی شرکت ومعاونت میں ۱۹۵۶ء میں جاری کیا وہ خود بھی صاحب علم تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو طبیعت کی موزونیت اور شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت بھی عطا فرمائی تھی، جس کا شاہد ان کا نعتیہ کلام اور

(۱) الحمد للہ اب بھی اس کی ترقی وتوسیع کا کام جاری ہے، اور وہ ان کے برادر اصغر مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی استاد دارالعلوم ومدیر "الرائد" کی نظامت اور مولوی عبد الباری ندوی کے اہتمام اور مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی فکر ودلچسپی وسرپرستی سے ترقی کر رہا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔

www.abulhasanalinadwi.org

مناجاتوں کا مجموعہ ''کلید باب کرم'' ہے اور یہ مضمون ان کے مستقل تعارف کا متحمل نہیں، یہ رسالہ ابھی تک الحمد للہ جاری ہے، اور اب انہیں کے گھر کے چشم و چراغ عزیزی مولوی سید حمزہ حسنی سلمہٗ اور ان کی عزیز بہنوں کی معاونت میں چل رہا ہے۔

ابھی اس خدمت علم و دین، تصنیف و تالیف اور فلاح مسلمین کا کام مختلف شکلوں میں جاری تھا، اور امید تھی کہ وہ اپنے آبائے کرام کی عمر طبعی کو (جو ماشاء اللہ اچھی عمریں پا کر دنیا سے رخصت ہوئے) پہنچیں گے اور اپنے ہی کاموں کو نہیں بلکہ اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے کاموں کی بھی تکمیل کریں گے، کہ خود اپنے شیخ کی زندگی میں (جو خود چراغ سحری ہو رہے تھے) حضرت شاہ علم اللہؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان کا یہ روشن چراغ جس سے اسی قرب و جوار ہی میں نہیں دور دور روشنی پہنچنے کی امید تھی، قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق ایک تکلیف دہ علالت کے بعد جس میں ان کے درجات بلند ہوئے ہوں گے اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کے مطابق درجۂ شہادت عطا فرمایا ہو، موت کے جھونکے سے بجھ کر رہ گیا۔

. انتقال کے وقت ان کی عمر کل ۵۷ سال تھی، اس بارے میں ان کو اپنے دادیہالی بزرگوں کے بجائے جنھوں نے طویل عمروں میں وفات پائی، ان کو اپنے باکمال نامور نانا مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ سے مماثلت رہی جنھوں نے عیسوی حساب سے ۵۳ سال کی عمر میں اور ہجری حساب سے ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی، لیکن اس عمر میں انھوں نے وہ کام کیا جو ایک آدمی نہیں اکیڈمی کرتی ہے۔

وللہ ما أخذ وللہ ما أعطی و کل شیء عندہ بأجل مسمی.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولوی معین اللہ صاحب ندویؒ

راقم سطور کو درجنوں یا بیسیوں تعزیتی مضامین اور "پرانی یادیں" لکھنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن عزیز القدر و عزیز القلب مولوی معین اللہ صاحب ندوی مرحوم کے بارے میں جن کی ابھی چند ہفتے ہوئے وفات ہوئی ہے، اپنے تاثرات، تجربات واحساسات ومشاہدات لکھنے میں بڑی صعوبت و کشمکش محسوس ہورہی ہے کہ ان کا کس طرح احاطہ کیا جائے، اور ان کی طویل رفاقت یکجائی اور ہم سفری، وحدتِ فکر و تعاون کو ایک مضمون میں سمیٹا جائے، جس میں صداقت بیانی اور دل کی ترجمانی بھی ہو، پھر بھی دل کے تقاضے اور ان کا حق سمجھتے ہوئے اور قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے یہ مضمون لکھوایا جارہا ہے۔

سنہ تو یاد نہیں مگر درجنوں برس پہلے ایک دن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں تھا جہاں سالانہ امتحان ہورہا تھا کہ باہر کھلنے والی کھڑکی سے دو شریف صورت لڑکوں کو دیکھا جو دارالعلوم میں داخلے کے لیے آئے ہیں، بعد میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں اندور کے ایک شریف صدیقی خاندان کے لڑکے اور دو بھائی ہیں، بڑے کا نام معین اللہ ہے اور چھوٹے کا نام نوراللہ، یہ دونوں دارالعلوم میں داخل ہوئے، نوراللہ مرحوم تو عنفوانِ شباب ہی میں راہی ملک بقا ہوئے، مولوی معین اللہ صاحب نے دارالعلوم میں تعلیم مکمل کی، ابتدائی درجوں سے ہی راقم کو ان کو پڑھانے کا شرف حاصل ہوا، انھیں کے زمانۂ طالب علمی میں عربی زبان وادب کے منتخب دل آویز نمونوں کا مجموعہ راقم کا مرتب کیا ہوا "مختارات من أدب العرب" شائع ہوا، اور راقم ہی نے پڑھایا، اور درجوں میں بھی تعلیم کا شرف حاصل ہوا، اور انھوں نے کامیابی امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسی زمانے میں راقم کا ربط و تعلق دہلی کے تبلیغی مرکز نظام الدین سے قائم ہوا، اور اس کے بانی و داعی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے عقیدت و وابستگی پیدا ہوئی، اس تعلق اور سفروں میں اور تبلیغی جدوجہد میں سب سے پہلا بڑا حصہ مولوی معین اللہ صاحب مرحوم ہی کا تھا، مولانا کی بھی نظر شفقت و عنایت ان پر تھی، پھر جب لکھنؤ میں دارالعلوم اس کا مرکز بن گیا اور یہاں سے پیدل تبلیغی سفر اور دورے شروع ہوئے تو سب سے زیادہ رفاقت انھیں کی رہتی تھی، اور وہ میلوں پیدل جاتے تھے، ایک زمانے میں جماعت کا شب میں قیام دارالعلوم ہی کی مسجد میں رہتا تھا، اس کی بھی ذمہ داری اور انتظام زیادہ تر انھیں کے ہاتھ میں رہتا تھا، دہلی وہ بارہا راقم کے ساتھ گئے، اور مرکز میں قیام کیا، پھر دوسرے قریب و بعید کے شہروں اور مرکزوں کے دورے میں وہ ہم سفر اور معاون خاص ہوتے تھے، اسی سلسلے اور زمانے میں فخرِ زمانہ اور مرشدِ دوراں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ (مقیم سہارن پور) اور مرشدِ یگانہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بھی عقیدت و نیاز کا تعلق قائم ہوا، اور وہ حضرات بھی خصوصی شفقت فرمانے لگے، اسی زمانے میں بہت سے اضلاع اور شہروں کا دورہ رہا، اور ان کی رفاقت و مشارکت رہی۔

کچھ زمانے کے بعد جب حجاز میں تبلیغی کام شروع ہوا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہاں کے اہل علم و اہل دین اور خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں کے سامنے یہ نمونہ آئے اور وہ اس کام میں خود حصہ لیں تو راقم نے دارالعلوم کے چند فضلاء اور نوجوانوں کو مکہ معظمہ میں کچھ طویل قیام کرنے پر آمادہ کیا اور اس کا انتظام کیا، ان میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا قیام کبھی مدرسہ صولتیہ کے احاطے میں، کبھی رباط بھوپال، رباط ٹونک میں رہا، وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تبلیغی دورے کرتے تھے اور دور دور تک پیدل جاتے آتے تھے، اس کا ایک مقصد عربی زبان کی مشق اور ترقی بھی تھی، اس زمانے قیام میں انھوں نے بہت دورے اور گشت کیے اور اس کا فائدہ ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

حجاز کے اس زمانۂ قیام میں راقم کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ مصر کا سفر کرے جو پورے عالم عربی اور ایک بڑے حصہ اسلامی پر اپنی فکر وثقافت، اشاعت وصحافت اور ممتاز ترین ادبائے عرب کا مرکز ہونے کی وجہ سے اثر انداز بلکہ قائد ورہنما بنا ہوا ہے، چنانچہ برادر محترم ومربی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کی تائید ومدد سے وہاں کے سفر کا عزم کرلیا گیا تھا، اور اپنی رفاقت کے لیے مولوی معین اللہ ندوی مرحوم اور مولوی عبدالرشید صاحب اعظمی ندوی کا انتخاب کیا گیا، اور ۱۳؍ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱؍جنوری ۱۹۵۰ء کو بحری جہاز سے قاہرہ کے لیے روانگی ہوئی، وہاں ایک دینی انجمن کے جو حجاز کی مدد کے لیے قائم ہوا تھا دفتر میں ہم لوگوں کا قیام ہوا، اور وہاں زمین ہی پر ہم لوگوں کے بستر پاس پاس بچھے ہوئے تھے، قاہرہ کے قیام میں تمام نامور علمی مرکزوں جامع الازہر، جامعۃ القاہرہ اور کالجوں ادبی محفلوں میں جانا ہوا، اور مصر کے تقریباً تمام نامور ادیبوں، اہل قلم، مفکرین اور مصنفین سے ملنا ہوا۔

ان تمام ملاقاتوں میں اور استقبالیہ جلسوں اور ادبی محفلوں میں مرحوم ساتھ رہتے تھے، اس عرصے میں مصر ہی کے نہیں، عالم عربی کے چوٹی کے ادیبوں، خطیبوں اور مصنفین سے ملاقات ہوئی، جن کا تفصیل سے ''مذکرات'' (ا) میں ذکر ہے، یہ قیام ۲۰؍رمضان ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵؍جون ۱۹۵۱ء تک تقریباً پانچ مہینہ رہا، راقم سطور تو مصر سے شام اور شرق اردن، عمان وغیرہ چلا گیا اور مولوی معین اللہ صاحب اور مولوی عبدالرشید وغیرہ حجاز واپس گئے۔

حجاز ومصر کے سفر کے علاوہ عزیز مرحوم ایک بار راقم کے ساتھ بطور رفیق کے لندن بھی گئے، اور وہاں سے جنیوا (سوئزرلینڈ) کے بھی سفر میں رفیق رہے، جہاں مرکز اسلامی کے جلسے میں شرکت کرنی تھی، جس کے ڈاکٹر سعید رمضان مرحوم بانی اور جنرل سکریٹری تھے۔

(ا) کتاب کا پورا نام "مذکرات سائح في الشرق العربي" ہے جو اردو میں شرق اوسط کی ڈائری کے نام سے شائع ہو چکی ہے، ترجمہ مولانا شمس الحق ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے)

www.abulhasanalinadwi.org

ان سفروں کے علاوہ جو بہر حال محدود پیمانے پر اور عارضی طور پر پیش آتے تھے، مرحوم کی اصل رفاقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت وانتظام کے سلسلے میں ہوئی، پہلے دارالعلوم کے شعبۂ تعمیر وترقی کے ناظر اور بعد میں وہ ندوۃ العلماء کے نائب ناظم منتخب ہوئے، اور دارالعلوم کا پورا نظم ونسق انھوں نے سنبھالا، انھیں کے زمانے میں ندوۃ العلماء نے بڑی ترقی اور وسعت اختیار کی، جس وقت وہ نائب ناظم ہوئے اس وقت دارالعلوم کی مرکزی عمارت، ایک منزلہ شبلی دارالاقامہ اور مسجد کے علاوہ اور کوئی عمارت نہیں تھی، اگر کچھ تھا تو بعض اساتذہ یا مطبخ کے لیے کھپریل کا مکان، اس وقت دارالعلوم میں جو کچھ تعمیری کام نظر آرہا ہے سب انھیں کا کارنامہ ہے، سوائے چند اسٹاف کوارٹرس، مسجد کی آخری توسیع اور شبلی کتب خانہ کی اوپری دو منزلوں کے کہ یہ دو چیزیں ان کی علالت اور قیام اندور کے وقفے میں تعمیر ہوئیں، کئی ہوسٹل تعمیر ہوئے، جن میں رواق سلیمانی، رواق عبدالحی، اور رواق اطہر قابل ذکر ہیں، انھیں کی ہدایت اور اشارے سے سفراء اور دارالعلوم کے فضلاء ہندوستان کے باہر گئے اور انھوں نے اس کے لیے اعانتیں جمع کیں، دارالعلوم کے انتظامیہ اور شعبوں میں بھی وسعت اور ترقی پیدا ہوئی۔

مرحوم نے راقم کے ساتھ برما، کویت، اور پاکستان کا بھی ایک سفر کیا، پاکستان میں وہاں کے متعدد مرکزی اور تاریخی مقامات کو بھی دیکھا اور وہاں کی بعض اہم شخصیتوں سے ملاقات بھی کی۔

آخر میں اپنی ضعف وعلالت کی بنا پر وہ دارالعلوم میں گوشہ گیر اور پھر اپنے وطن اندور میں اقامت گزیں ہوگئے، اپنی ضعف وعلالت کے باوجود انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے عالمی پیمانے پر کئی جلسوں میں شرکت کی، ردّ قادیانیت کے عظیم ووسیع اجلاس (منعقدہ ۱۲، ۱۳؍ نومبر ۱۹۹۷ء) میں وہ اپنے چلنے پھرنے کی معذوری کے ساتھ شریک ہوئے، اور اندور میں قیام کرنے کے ساتھ وہ قلبی وذہنی اور جذباتی وشعوری طور پر، جسمانی طور پر دور اور شعوری وفکری طور پر قریب بلکہ شریک ودخیل بھی تھے،

یہاں تک وہ ایک جسمانی صدمے اور بعض اعضاء کے مجروح ہونے کی وجہ سے مستقل طور پر صاحب فراش اور معذور ہوگئے، اور یہ زمانہ انھوں نے بڑے صبر واستقامت، فرائض کی پابندی اور اپنے قائم کیے ہوئے مدرسۃ الفلاح کی فکر ونگرانی میں گزارا، یہاں تک کہ ۲۳/اگست ۱۹۹۹ء کو صبح صادق سے قبل وفات کا حادثہ پیش آیا، اور وہ اپنے خالق ورازق ومربی وموفق سے جاملے۔

"رحمه الله تعالیٰ رحمة الأبرار ورفع درجاته رب العالمين".

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب نقوی مظاہریؒ

۲؍نومبر ۱۹۹۵ء کو ۵ بجے صبح رفیق عزیز وقدیم مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی واقع دارالعلوم ندوۃ العلماء پر برین ہمبرج (Brain Haemorrhage) کا حملہ ہوا اور ۳؍۴؍نومبر کی درمیانی شب میں ساڑھے بارہ بجے میڈیکل کالج میں انتقال ہوا، ۴؍نومبر کو بعد نماز ظہر ۲ بجے راقم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار سے متجاوز ہوگی، ڈالی گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

مولوی مرتضیٰ صاحب سے تعلق بالکل ایک خاندان کے عزیز فرد اور مخلص ومحب رفیق کا تھا، ان کا تعلق اور سلسلۂ خاندانی حضرت مولانا سید جعفر علی صاحب نقوی خلیفۂ خاص حضرت سید احمد شہیدؒ سے تھا جو سید صاحب کے معتمد خصوصی اور مرکز مجاہدین سرحد میں آپ کے کاتب خاص بھی تھے، وہ اور ان کے محترم والد اور بھائی اور سارا خاندان حضرت سید صاحب کا فدائی، عقائد، جذبۂ جہاد، ردّ شرک وبدعت اور اشاعت ودعوت دین میں سید صاحب کا پورے طور پر ہم نوا، سرگرم کار، اور مبلغ وداعی تھا، بالاکوٹ کے اخیر معرکہ سے (ارادہ وحکمت خداوندی کے ماتحت) زندہ اور سلامت واپس آنے کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دین کی تعلیم، عقیدہ صحیحہ کی اشاعت وتبلیغ، ردّ شرک وبدعت اور تزکیہ واصلاح کے لیے جا بجا مدارس قائم کیے جو یوپی کے مشرقی کنارے سے لے کر نیپال کی سرحد اور دوسری طرف بہار کے صوبے تک پھیلے ہوئے تھے جن سے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی اصلاح اور صدہا ہزار نئی نسل کے افراد کی تعلیم وتربیت کا انتظام ہوا اور ان علاقوں میں ایک

www.abulhasanalinadwi.org

دینی فضاء قائم ہوئی جن میں عقائد واعمال کی صحت کے ساتھ مجاہدانہ جذبات بھی تھے۔

مولوی سید محمد مرتضٰی صاحب نے اپنے وطن مجھوا میر ضلع بستی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا رخ کیا، جو اس وقت مشائخ کبار اور اساتذۂ کاملین کا مرکز تھا، جن میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ، مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوری (سہارنپوری) اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری کا نام لینا کافی ہے، جن کے وجود سے اور مدرسے کی قدیم روایات، اس کے بانی کے اخلاص، روحانیت اور تاریخ توارث اور عملی نمونوں کی بنا پر ایک دینی وروحانی، مؤدبانہ اور باوقار، احترام وسکینت اور علمی اشتغال ویکسوئی کی فضا طاری تھی، حسن اتفاق کہ ان کے مظاہر علوم میں تعلیم کے زمانے میں راقم کے عزیز القدر بھانجے مولوی سید محمد ثانی حسنی بانی مکتبۂ اسلام اور مدیر "رضوان" اور مصنف تصانیف کثیرہ بھی حضرت شیخ کے حلقۂ تدریس حدیث میں شریک تھے، راقم کا جب کبھی حضرت شیخ کی ملاقات وزیارت یا رائے پور حاضری کے لیے سہارنپور جانا ہوتا تو دونوں عزیزوں سے اکثر ملاقات ہوتی اور ایک مشترکہ یگانگت اور کشش محسوس ہوتی، اسی زمانے میں مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب (بانی مدرسہ عربیہ اسلامیہ واقع ہتھورا ضلع باندہ) بھی (جن سے ایک قدیم مخلصانہ وعزیزانہ تعلق ہے) مدرسے ہی میں زیر تعلیم تھے۔

مولوی سید محمد مرتضٰی صاحب نے مظاہر علوم سے فارغ ہونے کے بعد قدیم روحانی وخاندانی تعلقات کی بنا پر راقم سے ربط وتعلق قائم رکھا اور اس کے نتیجے میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حلقۂ تدریس میں شامل ہوگئے، بعد میں وہ مولوی انور صاحب ندوی ناظر کتب خانہ کے انتقال کے بعد کتب خانہ کے مہتمم بنا دیے گئے، کتب خانے نے ان کے عہد اہتمام میں کمّاً وکیفاً بڑی ترقی کی، بالآخر اس کے لیے ایک مستقل شاندار عمارت احاطۂ دارالعلوم میں تعمیر ہوئی جس کا نام کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی رکھا گیا، مولوی مرتضٰی صاحب کے عہدِ اہتمام میں اس میں جدید مطبوعات اور اس کے ساتھ قدیم کتابی ذخیروں اور بعض کتب خانوں کا (جن کو ان کے وارثوں نے حفاظت اور استفادۂ عام کے

www.abulhasanalinadwi.org

لیے کتب خانۂ ندوۃ العلماء کو وقف کردیا) بڑا نمایاں اضافہ ہو، اور کتابوں کی تعداد ایک لاکھ پچیس تیس ہزار تک پہنچ گئی، کمیت کے اس اضافے کے ساتھ مطالعے اور استفادے کی کیفیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی، اور اب یہ کتب خانہ کماً و کیفاً برصغیر ہند کے ممتاز ترین دینی و علمی کتب خانوں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔

"ضابطہ" کے اس تعلق کے علاوہ مولانا کا اس ناچیز اور اس کے خاندان کے افراد سے گہرے "رابطہ" اور محبت واخلاص کا بھی تعلق رہا ہے، اکثر سفروں میں معیت و رفاقت رہتی اور اس سے بڑی مدد ملتی، راقم نے جب وسط جولائی کے بعد ۱۹۶۴ء میں اپنی بائیں آنکھ کے کٹریکٹ کا آپریشن بمبئی میں میجر ایرانی سے کرانے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے بمبئی کا سفر اور چند روز قیام کا فیصلہ کیا، جہاں اس وقت تک زیادہ لوگوں سے گہرے تعلقات وتعارف نہ تھا، تو قریب ترین عزیزوں اور قدیم رفیقوں کی موجودگی میں مولانا مرتضیٰ صاحب ہی نے اس سلسلے میں رفاقت اور معاونت کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہو گئے، بمبئی میں جہاں دو ہفتے کے قریب قیام رہا وہی رفیق ومعاون اور تیماردار اور غمخوار رہے، پھر انھیں کی رفاقت ومعیت میں لکھنؤ کا سفر ہوا اور وطن واپسی ہوئی۔

ندوۃ العلماء کے سلسلے میں مولانا کے دورے بھی ہوتے، اس میں خاص طور پر بمبئی اور گجرات کا حصہ ہوتا، احمد آباد کے اجلاس (منعقدہ ۷-۸/اکتوبر ۱۹۹۵ء) کی کامیابی کا بڑا سہرا انھیں کے سر تھا جنھوں نے دارالعلوم کے چند رفقاء کے ساتھ اور کبھی انفرادی طور پر اس کے لیے زمین تیار اور فضا ہموار کرنے کی مخلصانہ اور پرجوش سعی کی اور بالآخر وہ اجلاس ظاہراً وباطناً بورڈ کے کامیاب ترین اجلاسوں میں یا اس کا کامیاب ترین اجلاس تھا۔

ذیل میں وہ تقریر نقل کی جاتی ہے، جو راقم نے ان کی وفات پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کی تھی:-

---

(۱) یہ تقریر صدیقی ٹرسٹ کراچی سے "وقت کی سب سے نایاب جنس مردان کار اور مخلص عاملین" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

میرے رفقاء کار اور عزیزو!

آپ کو معلوم ہے کہ کئی تنظیموں سے وابستگی اور اداروں سے تعلق کی بنیاد پر مجھے مختلف موضوعات پر تقریریں کرنی پڑتی ہیں۔لیکن میں آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ سب سے مشکل موضوع تعزیت کا موضوع ہے، اس کا تعلق انسان کے تعلقات سے ہے، قلب سے ہے، دماغ ہی نہیں قلب سے بھی ہے، اور خاص طور پر تعزیت بھی ایک ایسی شخصیت کی جس سے عزیزانہ، روحانی اور خاندانی تعلق ہو، اور تعلق بھی ایک دو برس، دس بیس برس کا نہیں بلکہ دوڈھائی سو برس کا ہو۔

آپ میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا مرتضیٰ صاحب (اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے) ان کا تعلق مولانا سید جعفر علی صاحب نقوی بستوی کے خاندان سے تھا، وہ ان کے احفاد میں تھے۔

مولانا سید جعفر صاحب نقوی حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خاص رفقاء، رفقائے دعوت اور رفقائے جہاد میں سے تھے، وہ جب سرحد میں گئے جہاں حضرت سید صاحب کا قیام تھا تو سید صاحب نے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا اور بڑی گرمجوشی سے ملے اور وہاں جانے سے پہلے بھائیوں میں ایک مقابلہ سا تھا کہ کون جائے، پھر معاملہ والدین پر چھوڑا گیا۔مولانا سید جعفر علی صاحب کا انتخاب ہوا اور اس کے لیے وہ جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔جب سید صاحب کی قیام گاہ کے قریب پہنچے تو سید صاحب نے باہر نکل کر ان کا استقبال فرمایا اور بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور پھر ہمارے خاندان کی، رائے بریلی کی خیریت پوچھی، انھوں نے خیریت بتائی اور فرمایا آپ خود گئے تھے یا معلوم ہوا۔کہا معلوم ہوا، پھر وہاں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معتمد خاص رہے اور حالات میں آتا ہے کہ ایک شعبہ غالباً خط وکتابت کا شعبہ حضرت سید صاحب نے مولانا سید جعفر علی صاحب کے سپرد فرمایا۔

پھر انھوں نے حضرت کی شہادت کے بعد ٹونک کا سفر بھی کیا جہاں حضرت سید

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص متعلقین تھے۔اور اہل خاندان کا بڑا حصہ وہاں موجود تھا۔اور کتاب لکھی "منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء" جو ہمارے کتب خانے کی زینت ہے اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے معتمد ترین مآخذ میں سے ہے۔

سید صاحب کے حالات میں دو کتابیں ہیں جو سب سے زیادہ معتبر ہیں اور گویا معاصرین اور رفقاء کی ہیں۔ایک منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء مولانا سید جعفر علی صاحب کی اور دوسری وقائع احمدی شیخ محمد علی کی جو نواب وزیر الدولہ والی ریاست ٹونک نے لکھوائی تھی۔نواب صاحب نے سید صاحب کے ان رفقاء میدان جہاد سے جو زندہ سلامت واپس آئے تھے یہ درخواست کی کہ آپ لوگ روزانہ بیٹھ کر حضرت کے حالات اور ان کے بارے میں معلومات بیان کریں، املاء کرایا کریں اور ایک جماعت لکھنے والوں کی مقرر کی جو اس کو لکھے۔وقائع احمدی کچھ تو ہمارے تعلق کی وجہ سے اور پھر مولانا مرتضیٰ صاحب کی دلچسپی اور ان کی وابستگی کی وجہ سے وہ بھی کتب خانہ میں آگئی جو ہمارے خاندان میں محفوظ تھی (۱) اور بالکل گھر کی چیز سمجھی جاتی تھی، یہ تعلق اتنا مستحکم ہے کہ جن لوگوں کو اس کا تجربہ نہیں ہوا وہ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ سید صاحب سے بیعت، دعوت اور مقصد کا تعلق رکھنے والوں کو سید صاحب کی ذات سے، سید صاحب کے خاندان سے کیا تعلق ہو، اس کا اندازہ کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس نے تجربہ نہیں کیا اور ان لوگوں کو دیکھا نہیں جن لوگوں کو سید صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور ان کے دامن سے وابستہ ہونے کا موقع ملا، ان کی حالت یہ تھی کہ وہ شمع کے پروانے بن گئے۔اور وہ اخیر وقت تک بالکل دم آخر تک بلکہ آخری سانس تک ان کا دم بھرتے رہے اور اس پر فخر کرتے رہے اور اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے رہے اور مولانا سید جعفر علی صاحب نے قیام مدارس اور تصحیح عقائد اور اصلاح رسوم واخلاق کا بڑے پیمانے پر کام بھی کیا جس کے اثرات ان کے

(۱) خوشی کی بات ہے کہ کتب خانہ ندوۃ العلماء کے اسی نسخے کا عکس کتاب کے شایان شان طباعت کے اعلیٰ معیار پر حضرت سید شاہ نفیس الحسینی صاحب لاہوری (متوفی ۵ر فروری ۲۰۰۸ء) نے شائع کیا اور اہم جگہوں پر پہنچانے کا نظم بھی کیا، والحمد للہ علیٰ ذلک۔(ناشر)

علاقے وبستی سے لے کر نیپال کی ترائی تک بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا مرتضیٰ صاحب سے ہمارا تعلق اس وقت ہوا جب وہ مظاہر علوم میں پڑھتے تھے اور ہمارے عزیز بھانجے مولوی محمد ثانی مرحوم جو مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد رابع کے بڑے بھائی تھے) غالباً ان کے ہم سبق تھے یا ہم زمانہ تھے، بہر حال ہم نے دونوں کو ساتھ دیکھا اور دونوں میں روحانی اور خاندانی تعلق کی بنا پر......اخوت اور ایک عقیدتمندانہ تعلق پیدا ہو گیا تھا، اور اس تعلق کو انھوں نے قائم رکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع عطا فرمایا اور اس کی توفیق دی کہ وہ یہاں آ کر اپنی زندگی اس ادارہ کے لیے وقف کر دیں۔ وہ یہاں آئے، ابتدا میں مدرس رہے پھر کتب خانے کے لیے ان کا انتخاب ہوا اور وہ اس کے ذمہ دار بنے اور جیسا کہ مولوی محمد رابع نے بھی بیان کیا اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں، شہادت دیتے ہیں کہ کتب خانے سے انھیں تعلق کتب خانے کا نہیں گھرانے جیسا تھا۔ ایک عزیز امانت کا تعلق تھا کہ وہ اس کو ہر طرح سے ترقی دینا چاہتے تھے، اور اس میں قیمتی چیزیں اور بیش قیمت مسودات اور نایاب کتابیں جو کہ ہندوستان میں عام طور پر نہیں ملتیں، ان کو مہیا کرنے میں ان کا خاص دخل تھا۔ کتب خانے نے جو ترقی ان کے دور میں کی وہ اس سے پہلے اس کو نصیب نہیں ہوئی، انھیں کے زمانے میں یہ عمارت بنی۔

جب انھوں نے کتب خانہ کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت سے اگر آپ مقابلہ کریں کمیت کے لحاظ سے بھی اور کیفیت کے لحاظ سے بھی تو آپ کو بہت بڑا فرق معلوم ہوگا کہ پہلے کتب خانے کی وسعت کیا تھی۔ اس میں کتابوں کی تعداد کیا تھی اور اب تعداد کیا ہے اور صرف تعداد ہی نہیں بلکہ وہ بنیادی کتابیں جن کا کتب خانہ میں ہونا بہت ضروری تھا اور بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ ہندوستان میں ان کا بس نام ہی نام تھا کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا، یا ان کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے تھے تحقیق کے ساتھ اور تحشیہ کے ساتھ اور تعلیق کے ساتھ اس کو کتب خانہ کے لیے مہیا کرنا اور حفاظت سے رکھنا تا کہ اساتذہ اور مدرسین پھر

طلباء ان سے فائدہ اٹھائیں۔

کسی کتب خانہ یا کسی ذخیرۂ کتب کے لیے سب سے زیادہ بیش قیمت اور سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہاں اہم کتابیں جو مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں، وہ وہاں مہیا ہوں اس سے بڑھ کر کتب خانے کے لیے جگہ کا ہونا اور اس کے لیے بڑی عمارت کا ہونا اور نہ روشنی کا انتظام اور نہ ہوا کا انتظام کوئی چیز اتنی اہم نہیں، جتنی یہ بات، اور یہ وہی کرسکتا ہے جس کو اللہ نے علم بھی دیا ہو اور ہمدردی بھی دی ہو اور امانت کا احساس بھی دیا ہو۔ ذمہ داری کا احساس دیا ہو تو مولانا مرتضی صاحب نے کتب خانے کو گویا مالا مال کر دیا اور چونکہ مجھے ذمہ دارانہ حیثیت سے بھی ایک تعلق تھا اس لیے معلومات ہوتی رہتی تھی کہ اب انھوں نے فلاں جگہ سے کتابیں منگوائی ہیں، حجاز سے اپنے فرزند(۱) (اللہ ان کے علم وعمر میں برکت دے) یا دیگر احباب اور ندوہ کے فضلاء کے ذریعے کتابیں مہیا کیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر تواضع، سادگی اور دوسری خاندانی خصوصیات عالی نسبی کی اور موروثی خصوصیات، اس طرح دین کی خدمت کا ایک شوق اور صحیح مقصد کے لیے محنت اور جفاکشی کی خصوصیات ان کے اندر پیدا کر دی تھیں۔

ابھی گجرات میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا بارہواں اجلاس منعقد ہوا جو بورڈ کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ کامیاب اور پر ازدحام اجلاس تھا، اس میں بڑا حصہ اور دخل مولانا مرتضی صاحب کی کوشش کا تھا، دو تین مرتبہ انھوں نے گجرات کا سفر کیا اور گجرات کے لوگ اس بات کی شہادت دیتے ہیں، (میں نے خود اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے تھے) کہ اس جلسے کی کامیابی میں مولانا مرتضی صاحب کا بڑا دخل ہے۔ وہ خود بار بار گئے اور جو لوگ مفید ہو سکتے تھے جیسے مولوی عبدالقادر گجراتی، مولوی سلمان حسینی ندوی اور مولوی خالد غازی پوری (اساتذۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء) ان لوگوں

---

(۱) یعنی مولانا سید مرتضی ندوی جن کی ریاض (سعودی عرب) میں تعلیمی مشغولیت تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کو خاص طور پر وہ وہاں لے گئے، اور ان کا دورہ کرایا، زمین تیار کی اور پھر اجلاس منعقد ہوا، میں خود اس میں شریک تھا اور اس کے بعد گجرات کا ایک دورہ بھی کیا۔ وہ چونکہ دار العلوم کے کام سے گجرات جایا کرتے تھے اس لیے وہاں سے بہت واقف تھے، وہاں کے مدارس اور وہاں کے اشخاص و افراد سے کہ کون کس حیثیت اور مقام کا ہے اور وہاں کے لوگوں کو اس سے کتنا تعلق اور اس پر کتنا اعتماد ہے اور وہ کتنا موثر ہو سکتا ہے، یہ بات وہی جان سکتا ہے جو کچھ دن رہے اور اللہ نے اسے شعور، سلیقہ اور تجربہ اور پھر اس کی فکر بھی عطا کی ہو۔

انھوں نے بعض مدارس اور اداروں سے وعدہ بھی کیا تھا لیکن جب یہ دیکھا کہ وقت تنگ ہے اور میری صحت بھی متحمل نہیں تو انھوں نے ایک دو کو حذف کیا لیکن ان کے مفاد اور کچھ دینی مفاد اور کچھ مسلم پرسنل لا بورڈ کے مفاد میں اور کچھ اس تعلق کی بنا پر جو ہم سے رکھتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ خواہ تھوڑی دیر کے لیے جایا جائے لیکن بعض مدرسوں اور مراکز میں ضرور جایا جائے، چنانچہ پانچ چھ مراکز جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ کاروان زندگی کی چھٹی جلد میں آئے گا کہ وہ کہاں کہاں لے گئے۔ کہیں بنیادیں رکھوائیں، کہیں خطاب کروایا، کہیں رات گزاری، اس کے بعد سورت آئے، اور پھر سورت میں انھیں کے مشورے اور ان کی دلچسپی کی بنا پر اور عقیدت کی بنا پر مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری کی خدمت میں حاضری ہوئی اور وہ بڑی قیمتی ملاقات تھی، پھر وہ ہمارے ساتھ بمبئی آئے اور بمبئی سے پھر ان کی واپسی لکھنؤ ہوئی۔

ان کی محنت اور کوشش کا پورا پورا احساس مولانا نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو ہے، ان کا ٹیلی فون بھی آیا، ان کو پورا پورا احساس واعتراف تھا کہ جلسے کی کامیابی میں مولانا مرتضی صاحب کا بڑا حصہ تھا۔

سب سے بڑی نایاب چیز جو ہے وہ اس وقت مردان کار کی، عاملین اور مخلصین کی، سب کچھ مہیا ہو سکتا ہے۔ آپ انجمن بنائیں چاہیں تو پانچ سو ممبر ہو جائیں آپ چاہیں

www.abulhasanalinadwi.org

تو ہزار دو ہزار اور چند ہزار اس کے ممبر ہو جائیں۔ سیاسی جماعتوں کو دیکھ لیجئے اور بھی بہت سے کلب ہیں، اور بہت ساری آرگنائزیشن ہیں کہ ان کو ممبر حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں، لیکن کسی ادارے کو، کسی دینی مقصد کو، کسی منصوبے کو کسی مخلصانہ اور داعیانہ منصوبے کو اپنے فکر کے آدمی مل جائیں جن کو اس کی دھن لگی ہو، اور ان کے دل و دماغ پر یہ چیز سوار، پیوست ہو جائے وہ بالکل ایک عنقا چیز بن چکے ہیں کہ جیسے عنقا کا ملنا ضرب المثل بن گیا ہے۔ اسی طرح ایسے لوگوں کا ملنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عنقا کی صورت میں ہمیں ایک مخلص مرد کار، مرد کامل عطا کیا تھا۔ اللہ کی چیز تھی اس نے دی تھی اس نے اٹھالی۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے، قادر ہے اور حقیقی مالک وہی ہے، بہر حال اس کا فیصلہ ہر چیز سے قیمتی ہے۔

ہمارے چھوٹے سے علمی و دینی خاندان کا ایک عزیز فرد، ایک رکن، ایک وقیع رکن ہم سے جدا ہو گیا۔ ہم اس پر اپنے سے خود تعزیت کرتے ہیں آپ سے بھی تعزیت کرتے ہیں اور ایک طرح سے ہم دینی کاموں سے اور دینی اداروں سے تعزیت کرتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں اور آپ سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ آپ ان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور انھیں ایصال ثواب بھی کریں اور ان کو یہاں سے جانے کے بعد بھی یاد رکھیں جب کبھی یاد آجائیں دعا کر لیا کریں اور ایصال ثواب کر دیا کریں کہ یہی ایک مسلمان کا تحفہ دوسرے کے لیے ہے، اس سے بڑھ کر نہ تعزیت ہے اور نہ شاعری ہے اور نہ کسی اور طرح سے اس کا اعتراف ہے اور ان کا شکریہ ہے، سب سے قیمتی چیز یہی ہے کہ آپ ان کے لیے دعا کریں، اور ایصال ثواب کریں، اس سے خود آپ کو بھی فائدہ ہوگا۔ اللہ آپ کو اس کی توفیق دے گا تو آپ کی توفیق میں اضافہ کرے گا۔ اور آپ سے کام بھی لے گا۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

مولوی عبدالنور (نور عظیم) ندویؒ

افسوس اور حسرت کے ساتھ اپنے خوردسال عزیزوں اور رفقائے کار کی فہرست میں جو داغ مفارقت دے گئے، عزیز فاضل و گرامی قدر مولوی عبدالنور ندوی (جن کو عام طور پر نور عظیم ندوی صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) اضافہ کرنا پڑ رہا ہے، جنھوں نے ایک طویل اور شدید علالت کے بعد ۳۱ رجنوری ۱۹۹۳ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔

کسی بڑی تعلیم گاہ اور مدرسہ و جامعہ میں جس میں سیکڑوں کی تعداد میں قریب و بعید مقامات کے اور متفاوت السن و مختلف الاستعداد طلبہ تعلیم پاتے ہوں اور درجنوں کی تعداد میں اساتذہ تعلیم دیتے ہوں، کسی طالب علم یا استاد سے اختصاص و مناسبت، ترجیحی سلوک واعتماد، اور علمی، تحریری و تحقیقی یا دعوتی و تحریکی کاموں میں رفیق و شریک بنانے اور اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس پر اعتماد و اطمینان کے اظہار کی وجہ کچھ خصوصیات وامتیازات ہوتے ہیں، ان خصوصیات وامتیازات میں (علمی تجربہ اور ایک مدت تک تربیتی و تدریسی کام کرنے کی بنا پر کہا جاتا ہے) سعادت، تعلق خاص، امتیازی ذہانت واستعداد، بقدر ضرورت محنت و جفاکشی، اور آخر میں ترجمانی و نمائندگی کی امتیازی صلاحیت ہوتی ہے، کسی جانب داری یا خاطر داری کے بغیر (جس کو آج کل عربی میں ''مجاملت'' کے بلیغ لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کہا جاتا ہے کہ مولوی نور عظیم صاحب ندوی مرحوم میں یہ خصوصیات اس دور میں بھی (اپنے سن و درجۂ علمی کے مطابق) پائی جاتی تھیں، جب وہ دارالعلوم کے طالب علم تھے، (اور یہ ۱۹۵۹ء-۱۹۶۴ء کا زمانہ ہے) لیکن یہ امتیازی وصف اس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا جب وہ ۱۹۶۸ء کے بعد دارالعلوم میں مدرّس ہو کر آئے، اس وقت وہ یہاں کے علمی و تحریری کاموں میں ایک شریک و معاون کی حیثیت سے نمایاں ہوئے،

www.abulhasanalinadwi.org

۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ دار العلوم احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے میں مدرس رہے، اور وہاں کے ترجمان پندرہ روزہ "الہدیٰ" کے مدیر اور محرر خصوصی تھے، اس زمانے میں بھی وہ اپنے تعلق خاص کی بنا پر اپنی قدیم درس گاہ (دار العلوم ندوۃ العلماء) اور اس کے ذمہ داروں اور ترجمانوں کے مقالات وخیالات کی وقتاً فوقتاً اشاعت کرتے رہے، راقم سطور کی کتاب "النبوة والانبياء في ضوء القرآن" کا (جو ان خطبات اور محاضرات کا مجموعہ ہے، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ میں اس کے ذمہ داروں کی خواہش اور فرمائش پر وہاں پڑھے گئے) قسط وار ترجمہ "الہدیٰ" میں شائع کرنا شروع کیا(۱)، ان کی اس ترجمانی کی صلاحیت اور ذہنی وسعت وفراخ دلی کا ذکر آ گیا ہے تو اتنا اور اضافہ کر دیا جاتا ہے کہ راقم کی متعدد اہم ترین کتابوں کے بعض ابواب اور اہم مضامین کا ترجمہ ان کی ممتاز صلاحیت اور عربی زبان کے طرز جدید سے خاص مناسبت کی بنا پر انھیں کے سپرد کیا جاتا تھا، چنانچہ راقم کی کتاب "من نهر كابل الى نهر اليرموك" جس کا ترجمہ "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" کے نام سے اردو میں شائع ہوا ہے، اور وہ رابطۂ عالم اسلامی کے نمائندہ وفد کے قائد کی حیثیت سے ۶ مسلم ممالک کا سفر نامہ ہے، جس میں مصنف کے مشاہدات کے ساتھ اس کے تاثرات اور جذبات اور مشورے اور تنقیدات بھی آ گئی ہیں، جن کا تحریر کرنا، اور ترجمانی کرنا دونوں نازک کام ہے، اور اظہار خیال وترجمانی کی مہارت کے طالب ہیں، اس سفر نامے کے اس حصے کا ترجمہ جو سفر افغانستان سے تعلق رکھتا ہے، مولوی نور عظیم صاحب ہی کا کیا ہوا ہے۔

ان کی اس ماہرانہ ومخلصانہ ترجمانی کا سلسلہ اخیر تک جاری رہا، اور انھوں نے کئی مقالات اور رسائل کا ترجمہ کیا، اس سلسلے کی آخری چیز راقم کی اس اہم اور تاریخی تقریر کا ترجمہ ہے، جو "ترشيد الصحوة الاسلاميه" (۲) کے نام سے ربیع الاول ۱۴۰۹ھ (۲۹ر نومبر ۱۹۸۸ء) کو ابوظبی (امارت خلیج) کی "المجمع الثقافی الکبیر" میں کی گئی تھی، اس کا

---

(۱) انھوں نے صرف دو ابتدائی محاضروں کا ترجمہ کیا، باقی محاضرات کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا کیا ہوا ہے، یہ مجموعہ "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے شائع ہوا۔

(۲) اردو میں اس کا ترجمہ "اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر" کے نام سے مجلس سے شائع ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

موضوع بڑا نازک تھا، جس میں دین کے داعیوں اور اسلامی تحریکوں کے علمبرداروں کو مشورے دیے گئے تھے، احتیاط واحترام کے ساتھ ان کی بعض فروگذاشتوں، افراط وتفریط اور بعض حقائق سے تغافل پر احتساب کیا گیا، اس کا ترجمہ بھی ایک ماہر اور متقارب الفکر مترجم کا طالب تھا۔

۱۹۶۹ء میں دارالعلوم میں تدریس کے ساتھ رسالہ ''ندائے ملت'' کی ترتیب کا کام بھی وہ اپنے رفیق ومحبّ مولوی نذرالحفیظ ندوی کے ساتھ کرتے رہے، جو خاص حالات کی بنا پر بڑے اعتدال واحتیاط کو چاہتا تھا، یہ سلسلہ ۱۹۷۳ء تک جاری رہا۔

۱۹۷۴ء میں وہ اپنے اساتذہ اور اہلِ تعلق کی تائید واتفاق رائے کے ساتھ قاہرہ چلے گئے، جہاں ازہر کے کلیة اللغة العربية میں شعبہ نقد وادب سے ایم اے کیا، اور اپنا تحقیقی مقالہ Thesis الذوق الأدبي کے عنوان سے پیش کیا، اور ممتاز نمبروں سے کامیاب ہوئے، راقم نے مسرت ومبارک بادی کا خط بھی تحریر کیا۔

۱۹۸۱ء میں ان کا جامعۃ الامام محمد ابن سعود الاسلامیہ ریاض میں غیر عربوں کو عربی کی تعلیم دینے کے لیے مدرس کے طور پر انتخاب ہوا، ایک سال تدریس کے بعد وہ رابطۂ عالم اسلامی کے مبعوث بن کر دارالعلوم آگئے، یہاں تدریسی خدمات کے ساتھ رابطۂ ادب اسلامی کے (جو قریبی زمانے میں مکہ معظمہ میں قائم ہوا تھا، اس کا صدر دفتر ریاض میں اور ایک لکھنؤ میں قائم ہوا، راقم سطور کو اس کی صدارت اور عزیز گرامی مولوی محمد رابع ندوی کو اس کی سکریٹری شپ کی ذمہ داری سپرد ہوئی) (۱) اس رابطہ کی ترجمانی، خط وکتابت اور خاص طور پر جلسوں کے کنڈکٹ کرنے کی خدمت (جس کی ان میں خاص صلاحیت تھی، اور ان کا یہ امتیاز سب کو تسلیم تھا) اکثر ان کے سپرد کی جاتی تھی، اور وہ اس کو بڑے اطمینان واعتماد کے ساتھ انجام دیتے تھے، اس کا ان کو ایک خاص ملکہ حاصل ہو گیا تھا، جو سلامتِ فکر اور قدرتِ بیانی کے ساتھ مراتب رجال سے واقفیت کا بھی طالب ہے۔

مرحوم کے اس ذہنی توارد اور ترجمانی کی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ اخبارات کو بعض

---

(۲) اس عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے بلاد عربیہ کے دفتر واقع ریاض کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

اوقات، بعض اہم مسائل و مواقع پر راقم کی طرف سے بیان دینے کی خدمت انھیں کے سپرد کردی جاتی تھی، اور بعض مرتبہ کسی ایسی تقریب یا جہاں کسی مجبوری سے شرکت ممکن نہیں تھی، اپنا مقالہ پڑھنے کی خدمت انھیں کے سپرد کردیا کرتے تھے، چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے متعلق اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ہونے والے سیمنار کے لیے انھیں نے راقم کی طرف سے افتتاحی کلمات لکھے، ''حیات عبدالحی'' کی تصنیف کے زمانے میں تین ماہ کے قریب راقم کے ساتھ رائے بریلی میں رہ کر نقل و اقتباس میں مدد کی۔

یہاں پر ان کی اس خصوصیت کا بھی ذکر کردینا ہے کہ اگرچہ وہ سلفی المسلک تھے، ان کے والد محترم مولانا عبدالعظیم صاحب اپنے علاقہ (۱) کے عالم باعمل اور داعی تھے، اور مولوی نور عظیم صاحب نے اپنے ہی علاقہ کے مدارس اور مدرسہ رحمانیہ بنارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اور وہ آخر تک اسی مسلک پر (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی فضا اور تاریخ و روایات میں کوئی اجنبی اور قابل وحشت چیز نہ پہلے کبھی رہی نہ اب ہے) قائم رہے، لیکن کسی موقع پر اور کسی تقریب سے بھی، کبھی اس کا کوئی منفی اثر ظاہر نہیں ہوا، اور وہ اس پورے ماحول میں اس طرح ملے جلے رہے کہ اس سے کبھی بیگانگی یا ناپسندیدگی اور ردّ و انکار کا یا مسلکی بحث و اختلاف کی نوبت نہیں آئی، اور یہ بات تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد میں شروع سے داخل ہے، اور یہاں کی فضا میں ہمیشہ یہ اعتدال قائم رہا۔

تقدیر الٰہی کہ ابھی ان کی عمر ۵۱ سال ہی تھی، اور بظاہر کوئی بڑی بیماری ان کے دوستوں اور اہلِ تعلق کے علم میں نہیں تھی کہ اچانک سننے میں آیا کہ ان کو بلڈ پریشر، شوگر اور گردہ کی تکلیف ہے، وہ مقامی علاج کرنے کے بعد سنجے ہاسپٹل میں داخل کیے گئے، لیکن وہاں بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر میں ان کو ان کی قیام گاہ جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ہے، لایا گیا، اور ۳۱ رجنوری ۱۹۹۳ء کو ۲ بجے دن کو وہ راہی ملک بقا ہوئے، اور اپنے دوستوں، قدردانوں اور شناساؤں کو مغموم چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا، جہاں کی شان ہے ''لا خوف علیهم ولا هم یحزنون''۔

---

(۱) وہ ضلع بستی کے موضع اکرہرا کے رہنے والے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں نہیں متعدد علمی، ادبی، فکری اور تحریری مجالس اور مرکزوں میں یہ ایک خلا پیدا ہوگیا، جس کا پُر ہونا مدارس عربیہ کے موجودہ حالات ورجحانات اور زمانے کے اثرات کے پیش نظر مشکل نظر آتا ہے۔

واللہ علی کل شیٔ قدیر۔

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

سینے کے داغ

- والدہ صاحبہ مرحومہ
- ہمشیرہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہ مرحومہ
- رفیقۂ حیات (سیدہ طیب النساء مرحومہ)

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

والدہ صاحبہ مرحومہ

میرے نانا حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ساتویں پشت میں ہیں، جو اپنے زمانے کے اولیاے کاملین میں تھے اور نہایت متبع شریعت اور حامیِ شریعت بزرگ تھے (۱)۔ حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب بھی بڑے پایے کے بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دینی و دنیوی دولتیں عطا فرمائی تھیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے میں آپ کو اجازت و خلافت حاصل تھی، مریدوں میں بڑے بڑے عالم، بزرگ شامل تھے، ان کو جو دیکھتا اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اللہ نے ان کو صرف اپنی یاد اور آخرت کی تیاری ہی کے لیے پیدا کیا ہے، ان کی نماز خاندان اور قرب وجوار میں ضرب المثل تھی، نماز کی نیت باندھ کر ان کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہوتی تھی، آخر عمر میں جسم میں رعشہ ہو گیا تھا، چلتے تھے تو ہر قدم پر یہ خیال ہوتا تھا کہ اب گرے، تب گرے، لیکن جہاں صف میں کھڑے ہوئے اور امام نے تکبیر کہی تو پھر معلوم ہوتا تھا کہ ایک ستون کھڑا ہوا ہے جس کو جنبش نہیں، کبھی کبھی شبینہ میں شرکت کی اور پورا قرآن شریف کھڑے ہو کر سنا، اچھے اچھے نوجوانوں کو دیکھا گیا کہ کوئی تھک کر بیٹھ گیا، کوئی سلام پھیر کر الگ ہو گیا، اور کوئی چکرا کر گر گیا، مگر وہ ہیں کہ جیسے کسی نے کوئی لکڑی گاڑ دی ہے کہ اپنی جگہ کھڑی ہے، ایک نماز

---

(۱) حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ کے ممتاز خلفاء میں تھے، آپ نے ۱۰۹۶ھ میں رحلت فرمائی، انھیں کے نام سے رائے بریلی شہر کے باہر، لب دریا ایک نئی بستی "دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوئی، آپ کی پانچویں پشت میں ہندوستان کے مشہور مجاہد اور مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ ہوئے ہیں، شاہ صاحبؒ کا تذکرہ، مولانا غلام رسول مہرؔ کی کتاب "سید احمد شہیدؒ" اور راقم کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

پڑھ کر بس دوسری نماز کے انتظار اور شوق ہی میں رہتے، صحبت میں ایسی تاثیر تھی کہ جو شخص چند دن ان کے حلقے میں بیٹھا اس کو بھی نماز اور اتباعِ سنت سے شغف ہو گیا، اور وہ بھی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار و شوق و اشتیاق میں رہنے لگا، بڑے بڑے واقعات ہو جاتے، ان کے سکون، اللہ کے ساتھ تعلق اور مشغولیت میں کچھ فرق نہ آتا، جوان اور صاحب اولاد بیٹی کے انتقال کی خبر آئی، تلاوت کر رہے تھے ایک بار إنا للہ پڑھی پھر مشغول ہو گئے۔

ان کو اپنے والد کی بہت بڑی جائداد ترکے میں ملی تھی کئی مسلم گاؤں تھے، جن میں صرف وہ اور ان کے بڑے بھائی سید رشید الدین صاحب مرحوم شریک تھے، ابتدائی انگریزی عملداری کا زمانہ، ارزانی اور اشیاء کی فراوانی کا دور، ہر طرح کی فراغت اور فراخی حاصل تھی، لیکن ان کو عبادت الٰہی کے علاوہ صرف ایک ہی چیز کا شوق تھا، وہ دینی کتابوں کا، جہاں کہیں کسی دینی کتاب کا اشتہار دیکھا فوراً فرمائش روانہ کی، اور پھر اس کے انتظار میں دن گننے لگے، یہ شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ کسی کتاب کا انتظار تھا اور کسی صاحبزادی یا عزیز قریب کی تدفین میں شریک تھے، اپنے چھوٹے صاحبزادے حافظ عبید اللہ صاحب سے کہا کہ ”عبید! ابھی تک وہ کتاب نہیں آئی؟“ لوگوں کو تعجب ہوا کہ اس موقع پر بھی ان کا دل کتاب میں لگا ہوا ہے، اور یہاں بھی ان کو اسی کی فکر ہے، جائداد کے انتظام سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا، جب تک بڑے بھائی زندہ رہے وہ جز وکل کے ذمہ دار و مختار تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے اور نانا صاحب کے بڑے بھتیجے مولوی سید خلیل الدین صاحب مرحوم منتظم اور ذمہ دار قرار پائے، نانا صاحب کو صرف کتابوں کی خریداری کے لیے رقم کی ضرورت رہتی تھی، یا اپنے چھوٹوں کو کچھ دینے لینے کے لیے، باقی ان کا کوئی خرچ نہ تھا، باوجود اس کے کہ جائداد کی ہزاروں روپے کی آمدنی تھی، لیکن وہ صرف دس روپے ماہوار لیتے تھے، مریدوں کے معاملے میں بھی یہاں حساب الٹا تھا، بجائے اس کے کہ عام پیروں کی طرح وہ شہروں کا

www.abulhasanalinadwi.org

دورہ کریں اور مریدوں کے یہاں جائیں اور ان کے نذرانے وصول کریں، مریدین (جن میں امراء وغرباء اور علماء وعوام ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے) ان کے یہاں ہفتوں، مہینوں مہمان رہتے، کبھی شاذ ونادر اگر کہیں جانا ہوتا تو جون پور، جہاں ان کے ایک محبوب مرید مولوی مکی صاحب (اصلی نام ابوالخیر تھا، مکہ مکرمہ میں ولادت ہونے کی وجہ سے مولوی مکی مشہور رہتے تھے، ان کے والد حضرت مولانا سخاوت علی جون پوری اپنے زمانے کے جید عالم اور مشہور مدرس اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفۂ خاص تھے۔ مولوی مکی صاحب کے نامور صاحب زادے مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی عرصے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات رہے) رہتے تھے، تشریف لے جاتے۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ میاں، مولوی مکی صاحب کے آنے سے سب سے زیادہ خوش ہوتے تھے، ان کے آنے سے بڑی رونق اور چہل پہل پیدا ہوجاتی تھی، ان کو اور ان کے سارے خاندان کو نانا صاحب سے بڑا تعلق تھا، اور یہ تعلق آخر آخر تک قائم رہا۔

نانا صاحب کے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں میرے بڑے ماموں صاحب کا نام سید احمد سعید تھا، چھوٹے مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب تھے، میری والدہ اپنی بہنوں میں چوتھے نمبر پر تھیں، ان سے تین بہنیں بڑی اور ایک چھوٹی تھیں جن کا انتقال نانا صاحب کی زندگی ہی میں زچگی ہی میں ہوگیا تھا، والدہ صاحبہ ۱۲۹۵ھ، ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئیں، نام خیر النساء رکھا گیا، والدہ صاحبہ نے کئی بار فرمایا اور سب اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ نانا صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ انہیں سے محبت ومناسبت تھی فرماتیں کہ جب کوئی اچھی کتاب آتی مجھے دیکھنے کو دیتے، اور مجھ سے تذکرہ کرتے کہ یہی ان کی سب سے بڑی خاطر اور محبت کی نشانی تھی۔ فرماتی تھیں کہ ”یہاں تہجد کے وقت جب کوٹھے سے اتر کر مسجد جانے لگتے تو میری آنکھ کھل جاتی اور میں اور منجھلی بہن صالحہ بی بی دونوں بی بی (والدہ) کے پاس کوٹھے پر چلے جاتے، اور وہیں ان کے ساتھ نفلیں پڑھتے رہتے اور مشغول رہتے، ہماری دوسری بہنوں اور ہم جولیوں کو اس پر بڑا

رشک آتا، اور وہ بھی اس کی کوشش کرتیں، مگر اکثر آنکھ نہ کھلتی، والدہ صاحبہ کو کاڑھنے، بیل بوٹے بنانے (کشیدہ کاری) اور سلائی کے کام سے فطری مناسبت تھی، اور وہ اس میں استادانہ مہارت رکھتی تھیں، ان کا دماغ شروع سے جدتیں پیدا کرنے اور نئی تراش خراش نکالنے اور نئے نئے تجربے کرنے کا عادی تھا، وہ ان تمام کاموں میں خاندان میں موجد اور ایک طرح کی مجتہد سمجھی جاتی تھیں، نانا صاحب کے مزاج میں بھی (بزرگی اور سادگی کے ساتھ) لطافت اور خوش مذاقی تھی، خوش وضع اور موزوں چیز ان کو پسند آتی تھی، اس لیے اکثر والدہ صاحبہ سے اس قسم کا کام لیتے، نانا صاحب کی ایک عبا جو وہ عید کے موقع پر زیب تن فرماتے تھے، ابھی تک ہمارے پاس موجود ہے جس پر والدہ صاحبہ کے ہاتھ کا ریشمی کام ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا استاد ابھی کام ختم کر کے اٹھا ہے۔

والدہ صاحبہ کو لکھنے کا اور لکھنے کی مشق کرنے کا غیر معمولی شوق تھا، انھوں نے اپنے بڑے چچازاد بھائی مولوی سید خلیل الدین صاحب جو پورے خاندان کے ایک اتالیق کی حیثیت رکھتے تھے، سے اس کی اجازت چاہی، انھوں نے ان کے تقاضے اور ان کے دینی حالات کو دیکھ کر اس کی بقدر ضرورت اجازت دے دی، اور والدہ صاحبہ نے اپنے ماحول کے رواج اور اپنے خاندان کے معیار کے برخلاف اچھا خاصا لکھنا سیکھ لیا، اور اس چیز نے ان کو اپنی تصنیف وتالیف کے کام میں بڑی مدد دی، جو کتابیں اس زمانے میں ان کے مطالعے میں رہیں اور جن کا ان کی پوری زندگی میں اور ذہن پر گہرا اثر پڑا ان میں قصص الانبیاء، مقاصد الصالحین، مآثر الصالحین، طی الفراسخ الی منزل البرازخ، اور طریق النجاۃ کا نام میں نے بار بار سنا ہے، کچھ عرصے کے بعد تین کتابیں ان کے مطالعے میں آئیں جن کا انھوں نے بہت اثر قبول کیا، ان میں نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کی ''الداء والدواء'' جس سے ان کو مختلف آیات قرآنی کے خواص اور اعمال قرآنی کا علم ہوا، اور انھوں نے ان میں سے بہت سی چیزوں کو اپنا معمول بنا لیا، دوسری کتاب مجربات دیربی اور تیسری تعبیر الرؤیا ہے۔

مردوں میں تو حفظ قرآن کا رواج ہمارے خاندان میں شروع سے رہا ہے، لیکن

www.abulhasanalinadwi.org

عورتوں میں مجھے معلوم نہیں کہ اس دور سے پہلے کوئی حافظ تھا، معلوم نہیں کیا خاص محرک پیش آیا کہ اس طبقے میں قرآن مجید حفظ کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، میری والدہ، ان کی منجھلی بہن، بھانجی وغیرہ نے حفظ شروع کیا، والدہ صاحبہ نے چھوٹے ماموں سید عبید اللہ صاحب سے حفظ قرآن شروع کر دیا، اور تین سال میں انھوں نے حفظ مکمل کر لیا اور آخر عمر تک جب تک ان کا حافظہ کام دیتا رہا، قرآن مجید پڑھتی رہیں، آخر دن تک جب تک انھوں نے اپنے معمولات ادا کیے مختلف سورتیں مختلف رکوع اور آیات صحیح طریقے پر ایک حد تک تجوید اور صحت مخارج کے ساتھ برابر پڑھتی رہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کا کسی پر فضل خاص ہونے والا ہوتا ہے اور کسی کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو کسی نہ کسی سبب سے اس کے اندر بے کلی اور بے چینی اور اضطراب و پریشانی پیدا کر دیتا ہے، ہزاروں سکون قربان اس بے چینی پر جو سب سے ہٹا کر خدا کے آستانے پر کھڑا کر دے اور سب سے توڑ کر اس سے جوڑ دے، والدہ صاحبہ کے اندر دعا کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ سارا وجود اس سے سرشار ہو گیا، ادھر اختلاج شروع ہوا، ایک بے کلی اور بے چینی سی ہر وقت رہنے لگی، اپنی زندگی کا انجام، آیندہ کی فکر، خوش نصیبی اور کامیابی کا شوق ہر وقت دل و دماغ پر چھایا رہتا، اس ہمہ وقت کی بے چینی اور اضطراب میں اگر کسی چیز سے انھیں تسکین ہوتی تو صرف دعا اور مناجات سے، یہی درد کی دوا، روح کی غذا اور زخم دل کا مرہم تھا، اک اندرونی طاقت تھی جو ہر وقت ان کو دعا اور مناجات میں مشغول رکھتی، ان کو ہر دعا پر اعتماد اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ناز تھا۔

دعا کی محویت اور اس کا انہاک روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور اس میں ان کو عجیب لذت و سرور، جوش و خروش اور سرشاری کی کیفیت محسوس ہوتی تھی، اسی زمانے میں ان کی موزوں طبیعت اور جذب دل نے اس کو نظم کا قالب بھی عطا کیا اور وہ اپنے دلی جذبات کو اشعار میں ادا کر کے اپنے دل کو تسکین دینے لگیں۔

جب تک میں رائے بریلی میں رہتا والدہ صاحبہ میری نگرانی، اخلاقی اور دینی

www.abulhasanalinadwi.org

تربیت میں مشغول رہتیں، مجھے قرآن مجید کی متعدد بڑی بڑی سورتیں انھوں نے یاد کرادی تھیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت ضرب المثل تھی اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دلداری، ایک حد تک ناز برداری قدرۃً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں، لیکن دو باتوں میں وہ بہت سخت تھیں ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر اگر سو گیا خواہ وہ کیسی ہی گہری نیند ہو، اٹھا کر نماز پڑھواتیں، اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز میں وقت پر جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں، پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بٹھا دیتیں۔ دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور ان کی غیر معمولی شفقت اس میں حارج نہ ہوتی وہ یہ کہ اگر میں کسی خادمہ کے بچوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا حقارت وغرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ مجھ سے نہ صرف معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں، اور اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم وتکبر اور غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا، اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو گناہ کبیرہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔

والدہ صاحبہ سحر خیزی کا بڑا اہتمام کرتیں، کبرسنی اور ضعف کے باوجود اپنے معمولات کو پورا کرنے کا ہمیشہ اہتمام کرتیں، جب سے مجھے ہوش ہے، میں نے ان کو تہجد کا پابند پایا، ان کی اصل خوشی اور ذوق کا وقت وہی ہوتا تھا۔

آندھی بلکہ تیز ہوا، سخت بارش اور چمک گرج سے ان کو بڑی وحشت اور گھبراہٹ ہوتی تھی، اور فوراً وہ ایسے موقع پر کونے میں چلی جاتیں اور دعا میں مشغول ہو جاتیں، اس میں بھی غیر اختیاری طور پر ایک سنت کی پیروی تھی، عمر جتنی بڑھتی جاتی تھی اور دنیا کے حالات وواقعات سننے میں آتے تھے، ان کو اپنے اس وقت تک زندہ رہنے اور ان حالات کے دیکھنے پر سخت رنج اور فکر رہتی تھی، لیکن مرضی الٰہی پر صابر وشاکر رہتی تھیں، قرب قیامت

کے فتنوں سے ساری عمر ڈرتی رہیں، ابتدائے عمر میں علاماتِ قیامت اور آثار محشر کے متعلق جو کچھ سنا اور پڑھا تھا وہ دل پر نقش تھا اور ایک ایک حرف پر یقین، ان فتنوں سے اپنی اور اپنی اولاد کی حفاظت کی ہر وقت فکر رہتی تھی اور اس کے لیے دعائیں کرتی تھیں، جمعہ کے دن بہت پابندی سے سورۂ کہف کے پڑھنے کا معمول تھا جس کے پڑھنے کی حدیثوں میں بہت فضیلت آئی ہے۔

کبرسنی میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ اور ان کا محبوب معمول قرآن مجید کے ان رکوعوں، آیات، اسمائے حسنٰی، درود شریف کے ان خاص صیغوں کو پڑھ کر جن کے خاص فضائل اور برکات کتابوں میں یا ان کے تجربے میں آئے تھے، اپنے سب چھوٹوں اور گھر والوں پر دم کرنا تھا، پڑھنے میں ان کو تقریباً پون گھنٹہ لگ جاتا تھا، پھر دم کرنے کا ایک طویل سلسلہ رہتا تھا، اخیر میں وہ بہت ضعیف ونحیف ہوگئی تھیں، لیکن معمولات کو پورا کرنے اور اوراد کے پڑھنے میں خدا جانے کہاں سے طاقت آجاتی تھی کہ وہ قوی اور تندرست معلوم ہوتی تھیں۔

بھوپال کے سفر سے ۲۹ /اگست کی صبح کو رائے بریلی پہنچا تو فرمایا کہ آدھی قوت آگئی، سلام کیا، قریب بلایا اور فرمایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میرے جسم کے روئیں روئیں سے اللہ کی حمد وثنا نکل رہی ہے اور عجیب سرور وذوق ہے، میں نے کہا کہ یہ خواب تعبیر کا محتاج نہیں، بہت مبارک خواب ہے، جمعہ بھی کسی قدر غنیمت گزرا، لیکن ہڈی کی تکلیف زیادہ تھی۔

سنیچر کی رات بے چینی سے گزری، ظہر کی نماز ہوش وحواس کے ساتھ پڑھی اور انگلی پر ذکر شروع کردیا، اس کے بعد ہی سفر آخرت کی منزل شروع ہوگئی، اپنی تین مرحومہ بہنوں کا نام لے کر کہا کہ وہ لکھنؤ آگئیں، اس کے بعد ہی نزع کی کیفیت شروع ہوگئی، سانس سے اسم ذات ''اللہ، اللہ'' کی آواز آنے لگی، جب یہ آواز موقوف ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہم سب لوگوں کو چھوڑ کر اپنے اس خالق ومالک کے پاس پہنچ گئیں جس کا

www.abulhasanalinadwi.org

ساری عمر نام لیتی رہیں، اور اس کے در رحمت پر ہمیشہ دستک دیتی رہیں۔

یَـاأَیَّتُهَـاالـنَّـفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً، فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ"

"اے وہ جی، جس نے چین پکڑ لیا چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں"۔ (سورۃ الفجر)

اگلے روز اتوار ۷ر جمادی الآخرہ ۱۳۸۸ھ، یکم ستمبر ۱۹۶۸ء کو صلحاء وعلماء، طلباء اور تبلیغی جماعت کے افراد کے ایک بڑے مجمع نے نماز جنازہ پڑھی اور والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو، اور شیخ المشائخ حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زوجہ محترمہ کے پائنتی ہمیشہ کے لیے آسودۂ خاک ہو گئیں۔ پورے ۴۷ سال کی مفارقت کے بعد اپنے باکمال شوہر اور رفیق زندگی سے جا ملیں، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک اسی مہینے جمادی الآخرہ (۱۳۴۱ھ) میں والد ماجد نے انتقال کیا تھا، ملک اور بیرون ملک سے تعزیت کے جو خطوط آرہے ہیں ان سے دعائے مغفرت اور بہت وسیع پیمانے پر ایصال ثواب کی اطلاعیں مل رہی ہیں، جو بیبیاں اور مرد اس مضمون کو پڑھیں ان سے بھی درخواست ہے کہ ان کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب سے دریغ نہ فرمائیں کہ دنیا سے جانے والے کو سب سے زیادہ اسی کی ضرورت اور اسی سے خوشی ہوتی ہے اور ہر چھوٹا بڑا اس کا محتاج ہے۔

□□□

ہمشیرہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہ مرحومہ

حجاز مقدس سے واپسی پر چند دن بعد ہی رمضان کا ماہِ مبارک شروع ہو گیا جو سالہا سال سے رائے بریلی ہی میں اپنے مستقر پر گزارا جاتا ہے اور احباب واہلِ تعلق قریب وبعید مقامات سے رمضان ساتھ گزارنے اور اس تاریخی مقام (دائرہ شاہ علم اللہؒ) میں جو ایک عرصے تک ذکر وعبادت الٰہی، تصحیحِ عقیدہ، اتباعِ سنت اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانے میں جہاد کی تیاری کا مرکز رہا ہے، ذکر وعبادت، تلاوتِ قرآن اور دینی معلومات حاصل کرنے اور مفید کتابوں اور اسباق کے سننے میں وقت گزارنے کے لیے مختلف مقامات اور بیرونِ ہند سے بھی آجاتے ہیں، اس مرتبہ بھی ان کی تعداد دو سو کے قریب تھی جن میں جنوبی افریقہ، اور سعودی عرب وغیرہ کے بعض عزیز مہمان بھی تھے، ان میں سے اکثر مدرسۂ تحفیظ القرآن سید احمد بن عرفان الشہیدؒ کی نئی عمارت میں جو ''مولانا محمد ثانی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے اہتمام میں حضرت شاہ ابو سعید صاحب (جدِ مادری حضرت سید احمد شہیدؒ) کے مکان میں بنائی گئی ہے اور مسجد کے بالکل بالمقابل چند قدموں کے فاصلہ پر واقع ہے) مقیم تھے، کچھ خصوصی مہمان راقم کی قیام گاہ جو مطالعہ وتصنیف اور آرام کا مرکز بھی ہے مقیم تھے۔

الحمد للہ ماہ مبارک اپنے قدیم معمولات، مجالس ودروس کے ساتھ جن میں درسِ قرآن، حدیث وسیرت کی بعض مفید کتابیں (زاد سفر ترجمۂ ریاض الصالحین امام نوویؒ، تہذیب الاخلاق مصنفہٗ والد محترم مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ارکان اربعہ تصنیفِ راقم اور فضائل رمضان از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ

www.abulhasanalinadwi.org

وغیرہ شامل تھیں) اور عزیزان مولوی سید عبداللہ حسنی استاذ دار العلوم اور نور چشم بلال عبدالحی استاذ مدرسہ ضیاء العلوم، ان اسباق کے حلقوں کے ذمہ دار تھے، یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہا، معمول کے مطابق عزیز القدر عمار عبدالعلی ابن فخر خاندان سید محمد الحسنیؒ، مدیر ''البعث الاسلامی'' اور عزیز القدر سید جعفر مسعود فرزند مولوی سید واضح رشید ندوی استاد دار العلوم و مدیر ''الرائد'' عربی نے باری باری سے مسجد واقع دائرہ شاہ علم اللہؒ اور مسجد واقع لوہانی پور (قریب دائرہ شاہ علم اللہ) میں قرآن شریف سنایا، عشرۂ اخیر میں معتکفین کی بھی اچھی تعداد تھی، پورا مہینہ یکسوئی، تلاوت قرآن اور مفید کتابوں اور خطابات کے سننے میں گزرا اور عید کے بعد مہمانوں کی واپسی ہوئی۔

لیکن تقدیر الٰہی اور خدا کی مرضی (جو کبھی رحمت و حکمت سے خالی نہیں ہوتی) کہ اس مبارک مہینہ میں چار دن کے فصل سے دو اہم حادثۂ وفات پیش آئے، ایک حادثہ راقم کی حقیقی برادر زادی اور مولوی سید محمد رابع ندوی سلّمہٗ کی اہلیہ (سیدہ رقیّہ دختر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مرحوم) کی وفات کا تھا جو ۱۸؍رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ جمعرات کے دن ۹ بجے صبح لکھنؤ کے ایک اسپتال میں پیش آیا، اور نماز جنازہ و تدفین دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد کی پشت پر خاندانی قبرستان میں ہوئی غفر اللہ لہا و اثابہا، انھوں نے تین صاحبزادیاں چھوڑیں جو علی الترتیب مولوی سید حمزہ حسنی (فرزند مولوی سید محمد ثانی حسنی مرحوم) مولوی سید عبداللہ حسنی (فرزند مولوی محمد میاں) اور مولوی حافظ سید جعفر مسعود حسنی (فرزند مولوی سید واضح رشید ندوی) کے ازدواج میں ہیں۔

اس حادثے سے ٹھیک چار ہی دن بعد راقم کی ہمشیرہ محترمہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہ (جو بالکل مادر محترمہ مشفقہ کے قائم مقام تھیں) والدۂ عزیزانِ عزیز القدر مولوی سید محمد رابع ندوی و مولوی سید واضح رشید ندوی کی اچانک وفات کا حادثہ ۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو (۱۲، ۱۳؍فروری ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب میں) پیش آیا، پہلے سے اس حادثے کے پیش آنے بلکہ قرب کے بھی آثار نہیں تھے، البتہ کئی گھنٹے پہلے سے ذکر و تسبیح اور استغفار

www.abulhasanalinadwi.org

کی طرف ان کی طبیعت نمایاں طریقہ پر مائل نظر آئی، راقم کو ڈیڑھ بجے رات کو سوتے سے جگایا گیا، گھر جا کر دیکھا تو حادثہ پیش آچکا تھا یا پہنچنے کے بعد ہی چند منٹ میں پیش آیا، مرحومہ اپنے والدنامدار مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی صاحبزادی تھیں، مولانا کے صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم سے عمر میں چھوٹی اور راقم سے بڑی تھیں، اور چار فرزندوں سید محمود حسن مرحوم، مولوی سید محمد ثانی مرحوم، مولوی سید محمد رابع ندوی اور مولوی سید محمد واضح رشید ندوی (سلمہما اللہ تعالیٰ واطال بقاءھما) کی والدہ محترمہ، ان میں سے دو صاحبزادوں کا انتقال ان کے سامنے ہو گیا تھا، (بڑے بیٹے سید محمود حسن مرحوم کا ۲۱ سال کی عمر اور عین جوانی میں اور ثانی الذکر فاضل ومصنف اور داعی الی اللہ مولوی سید محمد ثانی حسنی کا ۵۷ سال کی عمر میں) اور انھوں نے صبر واحتساب کے ساتھ اس کو برداشت کیا تھا، مرحومہ کا بیعت واصلاح کا تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سہارنپور سے تھا، ان کے مشفقانہ خطوط جن میں کہیں کہیں ''ہمشیرہ صاحبہ'' سے خطاب ہے اکثر محفوظ ہیں، تدفین حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے روضہ میں اپنے والدین ماجدین، برادرِ محترم اور فرزند ارجمند عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کے جوار میں ہوئی۔ غفر اللّٰہ تعالیٰ لھا ورفع درجاتھا۔ ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ اپنے اسلاف اور خاندانی خصوصیات سے متصف اور ان کی وارث اور نمونہ تھیں، شفقتِ عام، صلہ رحمی، حسنِ سلوک، ذکر وعبادت دعا وتضرّع ان کی خاص صفات تھیں، غفر اللّٰہ لھا ورفع درجاتھا (۱)۔

جہاں تک اس راقم کا تعلق ہے مرحومہ کو اس کے ساتھ شفیق ماں کا سا تعلق تھا، وہ بھی ان کو اسی نظر سے دیکھتا اور یہی محسوس کرتا تھا، جب اپنے مسکن رائے بریلی پہنچنا ہوتا

---

(۱) ان کے فرزند عزیزی مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مضمون پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ مورخہ ۱۰ ر مارچ ۱۹۹۶ء میں اور ان کے دوسرے فرزند عزیزی مولوی سید محمد واضح رشید حسنی ندوی عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا دارالعلوم ندوۃ العلماء ومدیر صحیفہ الرائد عربی کا مضمون ان کے اور ان کی صفات وخصوصیات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سب سے پہلے ان کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوتا، اور وہ انتہائی مسرت کا اظہار فرماتیں، جب باہر جاتا تو ان کی دعائیں لیتا ہوا اور وداعی سلام کرتا ہوا جاتا، اگر یہ مہینہ رمضان کا نہ ہوتا تو راقم اس کو "شہر الحزن" لکھتا کہ یہ دو عظیم حادثے تابڑتوڑ پیش آئے، لیکن ان دونوں جانے والیوں کے حق میں یہ رحمت وانتظام خداوندی تھا، کہ رمضان کے مبارک مہینے میں ان واقعات کے پیش آنے سے ان کے لیے جو دعائیں کی گئیں اور قرآن پڑھ کر ایصالِ ثواب ہوا وہ زمانہ اور فضا کے فرق سے بہت کم مسافرینِ آخرت کو حاصل ہوتا ہے، تعزیت اور ایصالِ ثواب کی اطلاع کے بھی مختلف شہروں اور سمتوں بلکہ ملکوں سے راقم کے نام اور ان کے فرزندوں کے نام اتنے خطوط آئے جو بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں، پھر اس کے کچھ ہی عرصے بعد حج کا زمانہ آ گیا، مخلص احباب نے حرم شریف اور منیٰ و عرفات میں دعائیں کیں، بعض نے ایصالِ ثواب اور دعاؤں کے لیے طواف کیے، ایک عزیز دوست نے حج بدل بھی کیا۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشآء والله ذو الفضل العظيم.

□□□

www.abulhasanalinadwi.org

رفیقۂ حیات (سیدہ طیب النساء مرحومہ)

۱۵ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو عشاء کے وقت عین نماز عشاء ادا کرنے کے بعد راقم کی رفیقۂ حیات (سیدہ طیب النساء) نے اچانک داغ مفارقت دیا، اور نصف صدی کی مسلسل و مکمل رفاقت کے بعد وہ جدا ہوئیں، مرحومہ میری حقیقی ماموں زاد بہن بھی تھیں، ان کے دادا (میرے نانا) حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے مشائخ کبار اور اہل اللہ میں سے تھے(۱)، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ نے جو تراجم و تذکرہ کے سلسلے اور مدحیہ الفاظ کے استعمال میں بڑے محتاط ہیں، اور ناپ تول کر بڑی احتیاط سے تعریفی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس بارے میں شہرت و عقیدت، یا محبت و قرابت کا بھی پاس نہیں کرتے، ان کے تذکرے میں حسب ذیل الفاظ استعمال کیے ہیں "بـــرکة الـدنیا و سرالوجود ولب لباب العرفان" (دنیا کے لیے باعثِ برکت، مقصد خلقت و آفرینش کا مظہر اتم "وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون" کی تفسیر و تصویر" اور عرفان و معرفت کا لُب لُباب تھے"۔

مرحومہ کے نانا منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی بھانجے سید حمید الدین صاحب کے پوتے تھے "صمصام الاسلام" (منظوم فتوح الشام) کے مصنف ہیں، جو پچیس ہزار بلیغ و جوش آفریں رجزیہ اشعار پر مشتمل ہے مرحومہ کے والد میرے بڑے حقیقی ماموں سید احمد سعید صاحب مرحوم تھے جو ضلع کے ایک بڑے

(۱) تفصیلی حالات و کمالات کے لیے ملاحظہ ہو "کاروان ایمان و عزیمت" ص ۱۶۱-۱۶۵، از راقم و نزہۃ الخواطر، جلد ۸، از والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ۔

www.abulhasanalinadwi.org

زمیندار اور دیندار بزرگ خاندان ہونے کے ساتھ انگریزی سے (انگریزوں سے براہ راست حاصل کرنے کی وجہ سے) خوب واقف تھے، اس سب کے ساتھ معمولات وتلاوت واذکار کے پابند تھے۔

مرحومہ کی زندگی میں خاندانی خصوصیات، نماز، روزہ کی پابندی، عبادت وتلاوت کے شوق، دعاومناجات کے علاوہ سب سے نمایاں وصف غرباء اور ضرورت منداہل خاندان کی مدد، دادودہش، ہمدردی اور صدقہ وخیرات کی عادت تھی جو قرب وجوار میں بہت معروف تھی، اوران کے سفرِ آخرت کے بعد سب سے زیادہ اسی صفت کا تذکرہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا، زندگی زاہدانہ تھی، مال ودولت، فراغت وراحت اور جو چیزیں طبقۂ نسواں میں اہمیت رکھتی ہیں، کسی سے کچھ سروکار نہ تھا، ۱۹۷۴ء میں اللہ تعالیٰ نے ان کو حج وزیارت کی سعادت بھی عطا فرمائی، تین مہینے (رمضان، شوال، ذیقعدہ) مسجد نبویؐ سے چند قدم کے فاصلے پر جوارِ رسول میں مدینہ طیبہ میں قیام کرنے، اور تقریباً تین ہی مہینے مکہ معظّمہ میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی، مکہ معظّمہ میں قیام کی ایک مدت باب ابراہیم پر بالکل حرم شریف کی بالائی منزل پر گزری۔

ان کی علالت کا سلسلہ بہت طویل تھا، اور متعدد قسم کی شکایتیں، جن میں قلبی دورے خاص طور پر تکلیف دہ اور آزمایشی تھے، ان امراض وتکالیف کو انھوں نے بڑے صبر وشکر کے ساتھ برداشت کیا، آخر میں انتقال کے دن سے دو تین ہفتے پہلے، گر جانے کی وجہ سے ایک بڑا فریکچر ہوگیا، جس کی سخت تکلیف تھی، ضعف وامراض کی وجہ سے آپریشن اور ہڈی جوڑنے کا تجربہ کار معالجین اور سرجنوں نے مشورہ نہیں دیا، اسی تکلیف میں (جس کا سلسلہ بعض اوقات مہینوں اور سالوں چلتا ہے) ۱۵؍دسمبر کو نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد بڑے سکون اور اچھی علامتوں کے ساتھ انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کی اور سفرآخرت اختیار کیا، اگلے دن ۱۶؍دسمبر کو بعد نماز ظہر نماز جنازہ ہوئی، عرصۂ دراز سے دائرۂ شاہ علم اللہؒ کے احاطے اور میدان میں کسی جنازے میں اتنا بڑا مجمع دیکھنے میں نہیں آیا،

www.abulhasanalinadwi.org

پھر تعزیتی خطوط اور تار بھی اندرون و بیرون ملک سے اتنی بڑی تعداد میں آئے جو اس سے پہلے یاد نہیں ہیں، اس موقع پر آنے والے خطوط اور خبروں سے معلوم ہوا کہ ان کے لیے دعائے مغفرت و ایصال ثواب کا بھی اتنا اہتمام کیا گیا اور اس میں اس خلوص و عقیدت کا حصہ رہا جو بڑے خوش نصیبوں اور مقبول بندوں کے حصے میں آیا کرتا ہے "وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم".

❑❑❑

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org